Compteler

Vol. 93 (1984)

جولائی ۱۹۸۴ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

قیمت سالانہ: چالیس روپے

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

۱۹۴۰ء غلامان اسلام ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ فہم قرآن ۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" ۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ" ۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول ۔ اسلام کا نظام حکومت ۔ سرایہ ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ" تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم" بصائر ۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ" تدوین قرآن ۔ اسلام کا نظام مساجد ۔
اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ" جارج برنارڈ شا ۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے ؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابت حدیث ۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت ۔ قرآن اور تعمیر سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

برہان

سالانہ چندہ چالیس روپے | قیمت فی پرچہ تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۳ | شوال المکرم ۱۴۰۴ھ مطابق جولائی ۱۹۸۴ء | شمارہ ۱

عبدالرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

افسوس ہے ۲۳ مئی کو ڈاکٹر پی۔ کے عبدالغفور کا اپنے وطن کالیکٹ میں انتقال ہوگیا مرحوم اس دن بالکل تندرست اور چاق و چوبند تھے۔ دوسرے دن مدراس، بمبئی اور دہلی کے طویل سفر پر روانہ ہونے والے تھے، ساڑھے تین بجے سہ پہر کا وقت تھا اپنے چیمبر میں ایک مریض کا معائنہ کر رہے تھے کہ ان کا قلم جیب سے نکل کر زمین پر گرا، ڈاکٹر صاحب قلم کو اٹھانے کے لئے ذرا نیچے کی طرف جھکے ہی تھے کہ اچانک سینہ میں درد اٹھا اور بڑھتا چلا گیا، فوراً میڈیکل کالج میں داخل کر دیئے گئے، اعلیٰ سے اعلیٰ علاج، دیکھ بھال اور راحت و آرام، مرحوم کے لئے ان میں سے کس چیز کی کمی ہو سکتی تھی، لیکن حملہ اس قدر سخت تھا (MASSIVE HEART ATTACK) کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ عمر ساٹھ، پچپن کے لگ بھگ ہوگی، ڈاکٹر صاحب کے نام اور ان کے کام سے شمالی ہند کے عام مسلمان تو کم ہی واقف ہوں گے لیکن جنوبی ہند کے بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام تھا۔ وہ مسلمانوں کے نہایت مخلص اور سرگرم و پرجوش لیڈر تھے، انہوں نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی، کالیکٹ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی جو تعلیمی اور اقتصادی نہایت شاندار خدمات انجام دی ہیں انھیں کا یہ اثر ہے کہ تعلیم میں آج کیرالا مسلمان

سب ریاستوں کے مسلمانوں سے آگے رہے، پہلے یہ سوسائٹی جنوبی ہند کے لئے خاص تھی، لیکن بعد میں جب ڈاکٹر صاحب کو شمالی ہند کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی طرف متوجہ کیا گیا (اور توجہ دلانے والوں میں خاکسار راقم الحروف بھی ہے جو سوسائٹی کی مجلس عاملہ کا دیرینہ ممبر ہے اور جس سے ڈاکٹر صاحب کے شخصی اور ذاتی تعلقات نہایت شگفتہ اور دوستانہ تھے) تو ڈاکٹر صاحب نے اس میدان میں بھی کام کرنے کا عزم کیا، چنانچہ اس کا پہلا قدم یہ تھا کہ گذشتہ ماہ دسمبر میں سوسائٹی کا ایک نہایت عظیم الشان آل انڈیا اجتماع نئی دہلی میں منعقد ہوا اس اجتماع میں جو اہم فیصلے کئے گئے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ہند کی ہر ریاست میں مسلمانوں کے لئے ایک میڈیکل کالج کھولا جائے، چنانچہ ۲۴ مئی کو ڈاکٹر صاحب دلی کا جو سفر کرنے والے تھے وہ اسی تجویز کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں وزیر اعظم سے ملنے کی غرض سے تھا، ڈاکٹر صاحب کو عرب ممالک میں اور خصوصاً سعودی عربیہ میں بڑا اعتماد حاصل تھا۔ انہوں ہزاروں نوجوانوں کو اچھی اچھی ملازمتوں یا کاروبار کے لئے سعودی مملکت بھیج دیا، اخلاق وعادات کے اعتبار سے نہایت شریف اور خلیق وملنسار تھے، یکسالہ قیام کالی کٹ کے زمانہ میں کم وبیش ہر ہفتہ ہی ڈاکٹر صاحب سے ان کی کوٹھی پر ملاقات ہوتی تھی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پرتکلف الوان نعمت سے ڈاکٹر صاحب نے خاطر مدارات نہ کی ہو، فن کے لحاظ سے بھی وہ آل انڈیا شہرت کے مالک تھے، لوگ دور دور سے ان کے پاس علاج کی غرض سے آتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو بخشش ومغفرت کی نعمتوں سے نوازے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین

افسوس ہے چند ماہ ہوئے جسٹس بشیر احمد سعید صاحب کا بھی کم و بیش ۸۴ برس کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے ان کے وطن مدراس میں انتقال ہو گیا، مرحوم بڑے فعال و متحرک اور سرگرم و پرجوش مسلمان تھے، انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے مدراس میں وہی کیا جو ڈاکٹر عبد الغفور نے کیرالا میں کیا تھا، "جنوبی ہند کے مسلمانوں کی تعلیمی انجمن" کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے مدراس میں دو عظیم الشان کالج تعمیر کرائے، ایک لڑکوں کے لئے اور دوسرا لڑکیوں کے لئے، آج یہ دونوں کالج مدراس یونیورسٹی کے نمایاں اور ترقی یافتہ کالج سمجھے جاتے ہیں، مرحوم آل انڈیا شخصیت کے بزرگ تھے، سالہا سال وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکز کونسل اور کورٹ کے نہایت باثر اور فعال ممبر رہے، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، دونوں کے سرگرم رکن تھے، سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کے شب و روز قومی کاموں میں ہی بسر ہوتے تھے، نماز روزہ کے بڑے پابند، قرآن مجید کی تلاوت ان کے مشاغل یومیہ میں شامل ندوۃ المصنفین کے شروع سے معاون تھے، برہان بڑے شوق سے پڑھتے اور اس کی بڑی قدر کرتے تھے، غرض کہ بڑی خوبیوں اور اعلیٰ اخلاق و صفات کے بزرگ تھے، حق گوئی اور حق پژوہی ان کا جوہر فطری تھا انگریزی کے بڑے اچھے مقرر تھے، اردو میں بھی اظہار مدعا پہ قادر تھے، تقریر بڑے جوشیلے انداز میں کرتے تھے، اس میں شک نہیں کہ ان کا نفس وجود مسلمانوں کے لئے بڑی تقویت کا سبب تھا۔ کیونکہ وہ قانون داں بھی تھے اور مسلمانوں کے سچے ترجمان و وکیل بھی۔

افسوس ہے چند ماہ ہوئے مولانا محمد عثمان صاحب کا بھی اپنے وطن مالیگاؤں میں

انتقال ہوگیا۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، استعداد پختہ تھی، یوں تو ان کو مناسبت اور دلچسپی کم وبیش ہر فن سے تھی تاہم تفسیر اور حدیث ان کا خاص فن تھے، ایک عرصہ تک مالیگاؤں کے مختلف مدارس میں استاد رہے، لیکن ان کی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ جو ان کے لئے بقائے دوام کا ضامن ہے، مسلمان لڑکیوں کے لئے درس نظامی کا وہ عظیم الشان مدرسہ ہے جو مالیگاؤں میں جامعۃ الصالحات کے نام سے معروف ومشہور ہے، اب تو لڑکیوں کے لئے بڑے بڑے عربی مدارس ادھر ادھر اور بھی کئی ایک ہو گئے اور ہوتے جارہے ہیں، لیکن صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے جامعۃ الصالحات کو یک گونہ شرف فضیلت و تقدم حاصل ہے اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے مولانا مرحوم کے اخلاص ومحبت، محنت ومشقت اور ذوق تعمیر وحسن انتظام کا۔ راقم نے کئی مرتبہ جامعہ کی دورۂ حدیث کی طالبات کا امتحان لیا ہے اور ہر مرتبہ طالبات کے صحیح اور برمحل جوابات سے دلی مسرت محسوس کی ہے، ان کو جامعۃ الصالحات سے عشق تھا شب وروز اس کے کاموں میں مصروف رہتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو   وصلحا کا مقام جلیل عطا فرمائے اور جامعۃ الصالحات کو کسی قسم کے شر اور   سے محفوظ رکھے۔

فرعون — تاریخ و تحقیق کی روشنی میں

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی استاذ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ

(۲)

فرعون کا کردار فرعون عہد شکن، بدکردار اور فاسق تھا (۱) متکبر تھا (۲) وہ سرکش، مسرف اور حد سے بڑھنے والا تھا (۳) وہ مفسد تھا، اس نے ظلم سے بنی اسرائیل کو اچھے کاموں اور اچھے عہدوں سے محروم کر دیا (۴) اس نے اپنے آپ کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا (۵)۔

قرآن بتاتا ہے کہ فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور ظلم وستم توڑنے کے لئے اپنی رعایا کو فرقوں میں بانٹ کر ایک ایسا ظالمانہ طبقاتی معاشرہ قائم کر دیا تھا جو چھوٹے، بڑے، مضبوط اور کمزور طبقوں پر مشتمل تھا، اس نے

۱۔ ۲۸۔ القصص : ۳۲۔

۲۔ ۲۸۔ القصص : ۳۹۔ ۴۰ المؤمن : ۲۷۔

۳۔ ۱۰۔ یونس : ۸۳۔

۴۔ ۲۸۔ القصص : ۴۔

۵۔ ۲۸۔ القصص : ۳۸۔

طبقاتی نزاع اور کشمکش پیدا کر رکھی تھی، وہ ایک طبقے کو کمزور کرتا جاتا تھا۔(۱)

اس پر توریت اور ساری تاریخوں کا اتفاق ہے کہ جو فرعون حضرت موسیٰ کا معاشرہ تھا وہ متکبر، جابر و فاسق تھا۔(۲)

بائبل نے بھی اسے ایک متکبر کی شکل میں پیش کیا ہے (دیکھئے خروج ۹: ۷،

۳۲) فرعون کے کردار کا یہ نقشہ فرعون کے لفظ کی معنوی تشریح کے عین مطابق ہے۔(۳)

بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم فرعون بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتا تھا، ان کی اولاد نرینہ کو مار ڈالتا اور عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ اس نے ظلم سے بنی اسرائیل کو اچھے کاموں اور اچھے عہدوں سے محروم کر دیا تھا۔(۴) طرح طرح کی تکلیفوں سے انھیں ذلیل وخوار کرتا تھا۔(۵) اس نے عملاً انھیں غلاموں کے زمرے میں ڈال رکھا تھا۔ عبرت بنی اسرائیل۔(۶)

مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی، ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت

---

۱ ادارۂ علوم اسلامیہ جلد ۱۵ صفحہ ۲۷۴۔

۲ تفسیر ماجدی صفحہ ۶۳۹

۳ ادارۂ علوم اسلامیہ جلد ۱۵ صفحہ ۲۷۴

۴ ۲۸۔ القصص: ۴

۵ ۲۔ البقرہ: ۴۹

۶ ۲۶۔ الشعراء: ۲۲۔

فرعون — تاریخ و تحقیق کی روشنی میں

مولانا ابو الکلام قاسمی شمسی استاذ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ

(۲)

فرعون کا کردار فرعون عہد شکن، بدکردار اور فاسق تھا (۱) متکبر تھا (۲) وہ سرکش، مسرف اور حد سے بڑھنے والا تھا (۳) وہ مفسد تھا، اس نے ظلم سے بنی اسرائیل کو اچھے کاموں اور اچھے عہدوں سے محروم کر دیا (۴) اس نے اپنے آپ کو خدائی کا مقام دے رکھا تھا (۵)۔

قرآن بتاتا ہے کہ فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور ظلم و ستم توڑنے کے لئے اپنی رعایا کو فرقوں میں بانٹ کر ایک ایسا ظالمانہ طبقاتی معاشرہ قائم کر دیا تھا جو چھوٹے، بڑے، مضبوط اور کمزور طبقوں پر مشتمل تھا، اس نے

۱۔ ۲۸۔ القصص : ۳۲۔

۲۔ ۲۸۔ القصص : ۳۹۔ ۴۰۔ المؤمن : ۲۷۔

۳۔ ۱۰۔ یونس : ۸۳۔

۴۔ ۲۸۔ القصص : ۴۔

۵۔ ۲۸۔ القصص : ۳۸۔

طبقاتی نزاع اور کشمکش پیدا کر رکھی تھی، وہ ایک طبقے کو کمزور کرتا جاتا تھا۔[1]

اس پر توریت اور ساری تاریخوں کا اتفاق ہے کہ جو فرعون حضرت موسیٰ کا معاشرہ تھا وہ متکبر، جابر و فاسق تھا۔[2]

بائبل نے بھی اسے ایک متکبر کی شکل میں پیش کیا ہے (دیکھئے خروج ۹: ۲۷، ۳۲) فرعون کے کردار کا یہ نقشہ فرعون کے لفظ کی معنوی تشریح کے عین مطابق ہے۔[3]

بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم فرعون بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتا تھا، ان کی اولاد نرینہ کو مار ڈالتا اور عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ اس نے ظلم سے بنی اسرائیل کو اچھے کاموں اور اچھے عہدوں سے محروم کر دیا تھا۔[4] طرح طرح کی تکلیفوں سے انھیں ذلیل و خوار کرتا تھا۔[5] اس نے عملاً انھیں غلاموں کے زمرے میں ڈال رکھا تھا۔[6] عبرت: بنی اسرائیل۔

مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی، ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے، مشقت

لہ ادارۂ علوم اسلامیہ جلد ۱۵ صفہ ۲۷۴۔

۲ تفسیر ماجدی صفہ ۶۳۹

۳ ادارۂ علوم اسلامیہ جلد ۱۵ صفہ ۲۷۴

۴ ۲۸۔ القصص: ۴

۵ ۲۔ البقرہ: ۴۹

۶ ۲۶۔ الشعراء: ۲۲۔

کی تھیں(۱)۔ قدیم ترین اسرائیلی مورخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں تفصیلات اور زیادہ موجود ہیں، توریت میں ہے کہ اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو...
.... اور فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا ہو تو اسے دریا میں ڈال دو (خروج ۱: ۵، ۲۲)(۲)

یہ لڑکیوں کا قتل نہ کرنا اور انھیں عورت بننے کے لئے زندہ رکھنا غالباً اس لئے تھا کہ انھیں آئندہ فرعونی امراء، اپنے حرم میں داخل کریں (ملین کی ہسٹری آف دی جیوز جلد اول صفحہ ۷۷) توریت میں ذکر صرف ان کے زندہ رکھنے کا ہے، وجہ مصلحت درج نہیں ہے۔ اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو، اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو..... ان میں سے جو بیٹا ہو تو اسے دریا میں ڈال دو اور جو بیٹی پیدا ہو، جیتی رہنے دو (خروج ۱: ۱۵، ۲۲) مشہور قدیم یہودی مورخ جوزیفس کے الفاظ بھی تقریباً یہی ہیں۔ "یہ ایک بہت سخت ابتلا تھا" (تاریخ آثار یہود باب ۲ فصل ۹)(۳)

واضح رہے کہ ایک دور ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے رعمسیس ثانی کے زمانہ میں جاری ہوا تھا اور دوسرا دور ستم یہ ہے جو حضرت موسیٰ کی بعثت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا اور ان کی بیٹیوں کو جیتا چھوڑ دیا گیا

۱؎ توریت خروج: ۱۳، ۱۴۔

۲؎ تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۔

۳؎ " " " "

تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہوجائے[1]۔

وہ کتبہ جو ۱۸۹۶ء میں قدیم مصری آثار کی کھدائی کے دوران ملا تھا جس میں فرعون منفتاح اپنے کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے "اور اسرائیل کو مٹادیا گیا اور اس کا بیج تک باقی نہیں[2]۔

حضرت موسیٰ و فرعون

اللہ تعالیٰ نے وادی طویٰ میں حضرت موسیٰ کو پیغمبری عطا کی ۔ اور انھیں معجزات سے نوازا[3]۔ اور یہ تمھارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ، انھوں نے کہا کہ یہ میری لاٹھی ہے میں (کبھی) اس پر سہارا لگاتا ہوں، اور (کبھی) اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کام (نکلتے) ہیں، ارشاد ہوا کہ اس کو (زمین پر) ڈالدو اے موسیٰ، سو انھوں نے اس کو ڈال دیا، یکایک وہ (خدا کی قدرت سے) ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔ ارشاد ہوا اس کو پکڑلو اور ڈرو نہیں، ہم ابھی اس کو ابھی اپنی پہلی حالت میں کردیں گے اور تم اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی (بائیں) بغل میں دے لو (پھر نکالو) وہ بلا کسی عیب (یعنی بلا کسی مرض برص وغیرہ) کے نہایت روشن ہوکر نکلے گا۔ یہ دوسری نشانی ہوگی تاکہ ہم تم کو اپنی (قدرت کی) بڑی نشانیوں میں سے بعض نشانیاں دکھائیں (اب یہ نشانیاں لے کر) تم فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت حد سے نکل گیا ہے۔ عرض کیا اے میرے رب میرے حوصلے فراخ کر دیجئے اور میرا (یہ) کام (تبلیغ) آسان فرمادیجئے اور میری زبان پر سے بستگی (لکنت کی) ہٹادیجئے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۲ صفہ ۱۷۔

[2] " " صفہ ۷۰ (معمولی تبدیلی کے ساتھ)

اور میرے واسطے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر کر دیجئے یعنی ہارون کو کہ میرے بھائی ہیں، ان کے ذریعہ سے میری قوت کو مستحکم کر دیجئے اور ان کو میرے (اس تبلیغ کے) کام میں شریک کر دیجئے تاکہ ہم دونوں آپ کی خوب کثرت سے (شرک و نقائص سے) پاکی بیان کریں اور آپ کا خوب کثرت سے ذکر کریں۔ بیشک آپ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ تمھاری (یہ) درخواست منظور کی گئی اے موسیٰ[1]۔

دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ بہت نکل چلا ہے۔ پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا۔ شاید وہ (رغبت) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔ ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو (کیونکہ) میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، سب سنتا دیکھتا ہوں، سو تم اس کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم دونوں تیرے پروردگار کے فرستادے ہیں (کہ ہم کو نبی بنا کر بھیجا ہے) سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے اور ان کو تکلیفیں مت پہنچا، ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے (اپنی نبوت کا) نشان (یعنی معجزہ بھی) لائے ہیں اور ایسے شخص کے لئے سلامتی ہے جو سیدھی راہ پر چلے، ہمارے پاس یہ حکم پہنچا ہے کہ (اللہ کا) عذاب اس شخص پر ہوگا جو (حق کو) جھٹلا دے اور (اس سے) روگردانی کرے[2]۔

اور ہم نے اس (فرعون) کو اپنی (وہ) سب ہی نشانیاں دکھلائیں سو (جب بھی) وہ جھٹلایا ہی کیا اور انکار کرتا رہا (اور) کہنے لگا کہ اے موسیٰ

---

[1] سورۃ طٰہٰ رکوع ۲ ترجمہ حضرت تھانویؒ۔

[2] " " " " " "

تم ہمارے پاس اس واسطے آئے ہو (گے) کہ ہم کو ہمارے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے نکال باہر کرو، سو جب ہم بھی تمہارے مقابلہ میں ایسا ہی جادو لاتے ہیں تو ہمارے اور اپنے درمیان میں ایک وعدہ مقرر کرو جس کے نہ ہم خلاف کریں اور نہ تم خلاف کرو۔ کسی ہموار میدان۔ موسیٰ نے فرمایا تمہارے (مقابلہ کے) وعدہ کا وقت وہ دن ہے جس میں (تمہارا) میلہ ہوتا ہے، اور (جس میں) دن چڑھے لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔ غرض (یہ سن کر) فرعون (دربار سے اپنی جگہ) لوٹ گیا پھر اپنا مکر کا (یعنی جادو کا) سامان جمع کرنا شروع کیا پھر آیا (اس وقت) موسیٰ نے ان (جادوگر) لوگوں سے فرمایا کہ اے کمبختی نارواللہ پر جھوٹ افترا مت کرو، کبھی خدا تعالیٰ تم کو کسی قسم کی سزا سے بالکل نیست و نابود بھی کردے اور جو جھوٹ باندھتا ہے وہ (آخر کو) ناکام رہتا ہے۔ پس جادوگر (یہ بات سن کر) باہم اپنی رائے میں اختلاف کرنے لگے اور خفیہ گفتگو کرتے رہے (آخری نتیجہ سب متفق ہو کر) کہنے لگے کہ بلاشک یہ جادوگر ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ اپنے جادو (کے زور) سے تم کو تمہاری سرزمین سے نکال باہر کردیں اور تمہارے عمدہ (مذہبی) طریقہ کا دفتر ہی اٹھا دیں، سو اب تم مل کر اپنی تدبیر کا انتظام کرو اور صفیں آراستہ کرکے (مقابلہ میں) آؤ، اور آج وہی کامیاب ہے جو غالب ہوا، پھر انھوں نے کہا اے موسیٰ آپ (اپنا عصا) پہلے ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں، آپ نے فرمایا نہیں تم ہی پہلے ڈالو پس یکایک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کی نظر بندی سے موسیٰ کے خیال میں ایسی معلوم ہونے لگیں جیسے (سانپ کی طرح) چلتی دوڑتی ہوں۔ سو موسیٰ کے دل میں تھوڑا سا خوف ہوا، ہم نے کہا تم ڈرو نہیں۔ تم ہی غالب رہوگے اور (اس کی صورت یہ ہے کہ) یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں جو (عصا)

ہے اس کو ڈال دو، ان لوگوں نے جو کچھ (سانگ) بنایا ہے یہ (عصا) سب کو نگل جاوے گا، یہ جو کچھ بنایا ہے جادوگروں کا سانگ ہے اور جادوگر کہیں جاوے (معجزہ کے مقابلہ میں کہیں) کامیاب نہیں ہوتا، سو جادوگر سجدے میں گر گئے (اور باآواز بلند) کہا کہ ہم تو ایمان لے آئے ہارون اور موسیٰ کے پروردگار پر۔ فرعون نے کہا بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں (یعنی میری خلاف مرضی) تم موسیٰ پر ایمان لے آئے واقعی (معلوم ہوتا ہے کہ) وہ (سحر میں) تمھارے بھی بڑے ہیں کہ انھوں نے تم کو سحر سکھایا ہے۔ سو میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں۔ ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں اور تم سب کو کھجور کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں اور یہ بھی تم کو معلوم ہوا جاتا ہے کہ ہم دونوں میں (یعنی مجھ میں اور رب موسیٰ میں) کس کا عذاب سخت اور دیرپا ہے، ان لوگوں نے صاف جواب دیدیا کہ ہم تجھ کو کبھی ترجیح نہ دیں گے بمقابلہ ان دلائل کے جو ہم کو ملے ہیں اور بمقابلہ اس ذات کے کہ جس نے ہم کو پیدا کیا ہے۔ تجھ کو جو کچھ کرنا ہے (دل کھول کر) کر ڈال۔ تو بجز اس کے کہ دنیاوی زندگانی میں کچھ کر لے اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ بس اب تو ہم اپنے پروردگار پر ایمان لاچکے تاکہ ہمارے (پچھلے) گناہ (کفر وغیرہ) معاف کردیں اور تو نے جو جادو (کے مقدمہ) میں ہم پر زور ڈالا اس کو بھی معاف کردیں اور اللہ تعالیٰ (تجھ سے) بدرجہا اچھے ہیں اور زیادہ بقا والے ہیں۔[۵]

آپ کے رب نے موسیٰ کو پکارا (اور حکم دیا) کہ تم ان ظالم لوگوں کے یعنی قوم فرعون کے پاس جاؤ (اور اے موسیٰ دیکھو) کیا یہ لوگ، (ہمارے غضب سے)

---

۵ سورہ طٰہٰ رکوع : ۳ ترجمہ حضرت تھانویؒ

نہیں ڈرتے، انھوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ
کہ وہ جھٹلانے لگیں اور (طبعی طور پر ایسے وقت میں) میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے
اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی، اس لئے ہارون کے پاس بھی وحی بھیج دیجئے
اور میرے ذمہ ان لوگوں کا ایک جرم بھی ہے، سو مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ وہ لوگ
مجھ کو (قبل تبلیغ رسالت) قتل کر ڈالیں، ارشاد ہوا کہ کیا مجال ہے، سو (اب) تم
دونوں ہمارے احکام لیکر جاؤ (نصرت و امداد سے) تمھارے ساتھ ہیں، سنتے ہیں
سو تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور (اس سے) کہو کہ ہم رب العالمین کے
فرستادہ ہیں تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے دے (دونوں حضرات گئے
اور فرعون سے سب مضامین کہہ دیئے) فرعون کہنے لگا کہ (آہا تم ہو) کیا ہم نے
تم کو بچپن میں پرورش نہیں کیا اور تم اپنی (اس) عمر میں برسوں ہم میں رہا سہا
کئے اور تم نے اپنی وہ حرکت بھی کی تھی جو کی تھی (یعنی قبطی کو قتل کیا تھا) اور تم بڑے
ناسپاس ہو۔ موسیٰ نے جواب دیا کہ (واقعی) اس وقت وہ حرکت کر بیٹھا تھا اور
مجھ سے غلطی ہو گئی تھی، پھر جب مجھ کو ڈر لگا تو میں تمھارے یہاں سے مفرور
ہو گیا۔ پھر مجھ کو میرے رب نے دانشمندی عطا فرمائی اور مجھ کو پیغمبروں
میں شامل کر دیا اور (رہا احسان جتلانا پرورش کا سو) وہ یہ نعمت ہے جس کا
تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت میں ڈال رکھا تھا۔
فرعون (اس بات میں لاجواب ہوا اور سخن کا پہلو بدل کر اس) نے کہا کہ رب العالمین
کی ماہیت (اور حقیقت) کیا ہے تو موسیٰ نے جواب دیا کہ وہ پروردگار ہے آسمانوں
اور زمینوں کا اور جو کچھ (مخلوقات) ان کے درمیان ہیں اس کا اگر تم کو یقین کرنا ہو
(تو یہ پتہ بہت ہے) فرعون نے اپنے اردگرد (بیٹھنے) والوں سے کہا کہ تم لوگ
(کچھ) سنتے ہو (کہ سوال کچھ اور جواب کچھ) موسیٰ نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے تمہارا

اور تمھارے پہلے بزرگوں کا، فرعون (نہ سمجھا) اور کہنے لگا کہ یہ تمھارا رسول جو (بزعم خود) تمھاری طرف رسول ہوکر آیا ہے مجنوں (معلوم ہوتا) ہے۔ موسیٰ نے فرمایا کہ وہ پروردگار ہے مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے۔ اس کا بھی اگر تم کو عقل ہو (تو اس کو مان لو) فرعون (آخر جھلا کر) کہنے لگا کہ اگر تم میرے سوا کوئی اور معبود تجویز کرو گے تو تم کو جیل خانہ بھیجدوں گا۔ موسیٰ نے فرمایا اگر میں کوئی صریح دلیل پیش کروں تب بھی (نہ مانے گا) فرعون نے کہا کہ اچھا تو وہ دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو، موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو وہ دفعۃً ایک نمایاں اژدہا بن گیا اور (دوسرا معجزہ) دکھلانے کے لئے اپنا ہاتھ (گریبان میں دے کر) باہر نکالا تو وہ دفعۃً سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہو گیا۔[1]

خروج بنی اسرائیل فرعون اور مصری گورنمنٹ کے مظالم سالہاسال برداشت کرنے کے بعد بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ساری قوم اسرائیل نے مصر کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کو چلا جانا طے کر لیا۔ سفر مصری حکومت سے چھپ چھپا کر رات کے وقت شروع کیا۔ زمانہ وہ تھا کہ نہ آج کل کی سی باقاعدہ سڑکیں تھیں، نہ راستوں میں لیمپ لالٹین۔ شب کی تاریکی میں اسرائیلی راستہ بھول گئے اور بجائے اس کے کہ شمال کی طرف کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے دائیں پر مشرق کی طرف مڑتے پہلے ہی ادھر گھوم پڑے۔ ادھر فرعون کو خبر ہو گئی اور وہ اپنے لشکر کی کمان کرتا ہوا تیزی سے تعاقب میں آپہنچا، اب

---

[1] پارہ ۱۹ سورہ الشعراء رکوع ۵ ترجمہ حضرت تھانویؒ۔

اسرائیلیوں کے سامنے یعنی مشرق کی جانب سمندر تھا اور دائیں بائیں شمال و جنوب میں پہاڑیاں تھیں اور پشت یعنی مغرب کی جانب مصری لشکر۔ قرآن مجید میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ توریت میں اس کو خروج بنی اسرائیل سے موسوم کیا ہے۔ زمانہ کے تعین جزم کے ساتھ مشکل ہے۔ جدید ترین تحقیقات کے مطابق پندرھویں صدی قبل مسیح کا وسط قرار پایا ہے بلکہ بعض نے جرأت کر کے سنہ بھی متعین کر دیا ہے ۱۴۴۷ق م[1]

البحر سے مراد البحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں جیسا کہ بعض ثقات کو دھوکہ ہو گیا ہے بلکہ بحر قلزم (یا بحر احمر) مراد ہے۔ دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن اور محلہ سے مغرب کی طرف واقع تھا اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لئے مشرق کی طرف تھا۔ نیل سے اس راستہ کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مصر سے شام کی راہ کے قریب بحر قلزم تھا، اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے۔ مصر کے مشرق میں جہاں اب بحر سویز کھد گئی ہے اس سے متصل ہے۔ نقشہ میں سمندر دو مثلثوں کی شکل میں نظر آئے گا۔ یہاں ان میں سے مغربی مثلث مراد ہے۔ اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے جزیرہ سینا میں قدم رکھا تھا۔[2]

البحر سے مراد بحر احمر ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دریائے نیل مراد ہے[3]

فرعون کو بحر قلزم میں غرق کر دیا گیا۔[4]

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۲۱۔

[2] 〃 〃 〃 ۔

[3] روح المعانی

[4] تفسیر عزیزی صفحہ ۲۳۲ (خلاصہ)

حضرت موسیٰ نے بحر احمر کی طرف سے جانے والا راستہ اختیار کیا[1] فرعون اپنی فوجوں کے ساتھ تعاقب میں چلا آرہا تھا، بحرۂ قلزم میں غرق ہوگیا۔[2]

بنی اسرائیل کا حال

اسرائیلی اپنے کو ہر طرف سے محصور پاکر قدرۃً سخت پریشان ہوئے۔ لیکن رہنمائی اللہ کے ایک پیغمبر کر رہے تھے، آپ نے وحی الٰہی کے اشارے سے فرمایا کہ بلا توقف سمندر میں چل پڑو۔ سمندر کا پانی سمٹ کر دونوں پہاڑ جیسی دیواروں کی طرح کھڑا ہوگیا، درمیان میں خشک راستہ ہوگیا۔ اسرائیلیوں کا قافلہ عبور کر گیا۔ اتنے میں فرعونی بھی لب ساحل پہنچ گئے اور وہ بھی یہ منظر دیکھ کر پیدل اور سوار خشک سمندر میں در آئے۔ لیکن ابھی درمیان ہی میں تھے کہ پانی کی وہ کھڑی ہوئی دیواریں ناگاہ آپس میں مل گئیں اور سمندر کا پانی حسب سابق رواں ہوگیا، اور دیکھتے دیکھتے فرعون اپنے لاؤ لشکر کے غرق ہو کر رہ گیا۔ توریت میں تصریحات ذیل ملتی ہیں۔

"پھر موسیٰ نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا اور خداوند نے بہ سبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھایا اور پانی کو دو حصہ کیا اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سوکھی زمین پر ہو کر گذر گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی (خروج ۱۴-۲۱-۲۲) بنی اسرائیل خشک دریا کے بیچ میں چلے گئے اور پانی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی، سو خداوند نے اس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھوں سے یوں بچایا (خروج ۱۴: ۲۹ — ۳۰) اور مصریوں نے

---

[1] تفسیر تفہیم القرآن صفحہ ۱۰۸ جلد ۳

[2] دائرۃ المعارف اردو ترجمہ صفحہ ۲۲

پیچھا کیا اور ان کا پیچھا کئے ہوئے اور فرعون کے سب گھوڑے اور اس کی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے .... اور موسیٰ نے اپنے ہاتھ دریا پر بڑھایا اور دریا صبح ہوتے ہی اپنی اصل قوت پر لوٹا اور مصری اس کے آگے بھاگے اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا (خروج ۱۴: ۲۴-۲۸) واقعہ زمانہ جدید ترین اثری تحقیق کے مطابق ۱۴۴۷ ق۔م یا اس کے لگ بھگ آگے قرار پاتا ہے [۱]

فرعون کی غرقابی

اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے گئے حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا۔ میں نے جان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں (جواب دیا گیا) اب ایمان لاتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لئے عبرت بنے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں [۲]

پس فرعون اپنے لشکروں کو لے کر ان کے پیچھے چلا تو دریا ان پر جیسا ملنے کو تھا آملا [۳]

---

[۱] تفسیر ماجدی صفحہ ۲۲۔

[۲] قرآن پارہ ۱۱ سورہ یونس رکوع ۱۳ ترجمہ تفہیم القرآن جلد ۲ صفحہ ۳۰۹ تا ۳۱۰۔

[۳] قرآن پارہ ۱۶ سورہ طٰہٰ رکوع ۱۳ ترجمہ حضرت تھانوی رح۔

سورۂ شعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کے گذرتے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیان راستے میں اتر آیا۔

یہاں بیان کیا گیا ہے کہ سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دبوچ لیا، سورۂ بقر میں ارشاد ہوا ہے کہ بنی اسرائیل سمندر کے دوسرے کنارے پر سے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور سورۂ یونس میں بتایا گیا ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون پکار اٹھا: آمنت انه لا اله الا الذی آمنت به بنو اسرائیل وانا من المسلمین میں مان گیا کہ کوئی خدا نہیں ہے اس خدا کے سوا جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں مگر اس آخری لمحہ کے ایمان کو قبول نہ کیا گیا اور جواب ملا الئٰن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین، فالیوم ننجیك ببدنك لتکون لمن خلفك آیة اب ایمان لاتا ہے اور پہلے یہ حال تھا کہ نافرمانی کرتا رہا اور فساد کیے چلا گیا، اچھا آج ہم تیری لاش کو بچائے لیتے ہیں تاکہ بعد کی نسلوں کے لئے نشانِ عبرت بنا رہے۔ [1]

فرعون اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے نجات دی اور فرعون کو لشکروں سمیت غرق کر دیا۔ [2]

قرآن مجید نے واضح طور پر بتایا ہے کہ فرعون نے جب حضرت موسیٰ کا تعاقب کیا تو موسیٰ تو بنی اسرائیل کو لے کر سرزمین مصر سے بحفاظت

---

[1] تفہیم القرآن جلد سوم صفحہ ۱۰۸۔

[2] تفسیر ابن کثیر۔

نکل گئے، لیکن فرعون جو اپنی فوجوں کے ساتھ تعاقب میں چلا آرہا تھا بحر قلزم میں غرق ہو گیا اور آخری وقت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔ حتی اذا ادرکہ الغرق قال آمنت لا الہ الا الذی بہ بنو اسرائیل وانا من المسلمین، یہاں تک کہ جب ڈوبنے لگا تو بولا میں نے یقین کر لیا کہ کوئی معبود نہیں مگر جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں، (۱۰ یونس ۹۰)

لیکن غرغرۃ الموت کے وقت کے یہ الفاظ اسے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکتے تھے اور صرف ایک فنتر کی حیثیت رکھتے تھے، البتہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا کہ وہ تو غرقابی سے مرگیا لیکن اس کے جثے اور بدن کو بچا لیا گیا۔ فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک آیۃ، سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیتے ہیں تاکہ تو اپنے پچھلوں کے لئے نشانی بنے (۱۰ یونس ۹۲)[1]

اور پانی پھرا اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر جو ان کے پیچھے دریا میں آئے تھے چھپا لیا اور ایک بھائی بھی ان میں سے باقی نہ چھوٹا (خروج ۱۴: ۲۴، ۲۸)[2] اور دیکھتے دیکھتے فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرق ہو کر رہ گیا[3]

روایت ہے کہ انھوں (بنو اسرائیل) نے کہا کہ فرعون نہیں مرا اور وہ کبھی نہیں مرے گا اور کہا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو فرعون کی ہلاکت کی خبر دی، لیکن اس سے انھوں نے انکار کیا (تصدیق نہیں کی) تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ساحل پر پھینک دیا، یہاں تک کہ انھوں نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔[4]

---

[1] دائرۃ المعارف اردو ترجمہ ص ۲۲۷
[2] تفسیر ماجدی صفحہ ۲۲۔
[3] تفسیر ماجدی صف ۲۲۔
[4] تفسیر کشاف جلد ۲ صف ۲۵۳۔

حضرت مجاہد سے روایت ہے کہ بعض آدمی نے فرعون کی موت کی تکذیب کی تو اس کو ساحل دریا پر پھینک دیا گیا یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے اس کو دیکھ لیا۔[۱]

حضرت کعب نے فرمایا پانی نے اس کو ساحل پہ پھینک دیا۔[۲]

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہلاک ہونے کی خبر دی تو وہ لوگ فرعون سے کچھ اس طرح مرعوب و مغلوب تھے کہ اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ فرعون ہلاک نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کی رہنمائی اور دوسروں کی عبرت کے لئے دریا کی ایک موج کے ذریعہ فرعون کی مردہ لاش کو ساحل پر ڈال دیا جس کو سب نے دیکھا اور اس کے ہلاک ہونے کا یقین آیا اور اس کی یہ لاش سب کے لئے نمونۂ عبرت بن گئی۔ پھر معلوم نہیں کہ اس کی لاش کا کیا انجام ہوا۔ جس جگہ فرعون کی لاش پائی گئی وہ جگہ جبل فرعون کے نام سے معروف ہے۔[۳]

سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیتے ہیں تاکہ تو اپنے پچھلوں کے لئے نشانی بنے (۱۰ یونس : ۹۲) چنانچہ واقعتاً اس فرعون کی لاش کنارے پر آ گئی۔[۴]

آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی، اس کو موجودہ زمانہ میں

۱؎ تفسیر در منثور للسیوطی جلد ۳ : سورہ یونس آیت ۹۱۔

۲؎ در منثور جلد ۳ سورہ یونس آیت ۹۱، تفسیر زمخشری جلد ۲ صفحہ ۲۵۲
تفسیر کبیر جلد ۱۷ صفحہ ۱۵۷، روح المعانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۶۲

۳؎ معارف القرآن جلد ۴ صفحہ ۵۶۷

۴؎ دائرۃ المعارف اردو ترجمہ جلد ۱۵ صفحہ ۲۷۶۔

جبل فرعون کہتے ہیں اور اسی کے قریب ایک چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی میں حمام فرعون کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابوزنیمہ سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی[1]

فرعون کی لاش اگرچہ ڈوبنے والا وہی فرعون منفتہ ہے جس کو زمانہ حال کی تحقیق نے فرعون موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک قاہرہ کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سرگرافٹن الیٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہہ جمی ہوئی پائی گئی تھی، جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی[2]

چنانچہ واقعتاً اس فرعون کی لاش کنارے پر آگئی اور اسے حنوط کر کے مصر کے اہرام میں سے ایک اہرام میں محفوظ کر دیا گیا۔ اب تیرہ سو سال بعد دنیا نے اس کا عین مشاہدہ کر لیا ہے اور قاہرہ کے عجائب گھر میں رعمسیس دوم اور منفتاح دوم دونوں کی ممیاں موجود ہیں[3]

(ختم)

---

[1] تفہیم القرآن جلد ۲ صفحہ ۳۱۰۔

[2] " " " " ۔

[3] دائرۃ المعارف اردو ترجمہ جلد ۱۵ صفحہ ۲۷۷۔

شریف التواریخ

(۲)

پروفیسر محمد اسلم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ میاں عبدالجلیل نامی ایک نوشاہی کے جسم میں اتنی حرارت تھی کہ دو آدمی پانی کی مشکیں بھر بھر کر اس کے جسم پر ڈالتے اور وہ پانی زمین پر نہ گرتا بلکہ جسم ہی میں جذب ہو جاتا صـ۱۶۵۲ ۔ جھوٹ اور مبالغہ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ شرافت صاحب کے ایک مداح سید خورشید حسین بخاری کو افسوس رہا کہ ان کے ممدوح کو کسی یونیورسٹی میں ملازمت کیوں نہ دی گئی۔ اگر وہ یورپ میں ہوتے تو ریسرچ فیلوشپ ملتی۔ یونیورسٹی میں ملازمت ملتی۔ سرکاری اہتمام سے ان کی کتابیں چھپتیں۔ ان کے نام پر ہال تعمیر کیے جاتے اور بہت سے اعزازات ملتے صـ۱۹۵۴ ۔

شریف التواریخ کی دوسری جلد ۱۹۸۲ء میں چھپی ہے۔ اس میں حجرہ شاہ مقیم کو ضلع منٹگمری کا ایک قصبہ ظاہر کیا گیا ہے۔ حالانکہ منٹگمری کا نام سرکاری طور پر اب سے تقریباً بیس بائیس سال پہلے ساہی وال ہو چکا ہے۔

شرافت صاحب نے حاجی نوشہ کے جانشین حافظ برخوردار کے خلفاء کی فہرست میں ۲۶ اصحاب کے نام درج کیے ہیں۔ ان میں سے اٹھارہ جاٹ، ایک میراثی،

ایک بڑھئی اور باقی چھ ان کے فرزند ہیں ص۲۰۴۔ یہ سب کے سب مواضعات ساہن پال اور اگرویہ کے رہنے والے تھے۔ اس پر دعویٰ یہ ہے کہ نوشاہیہ سلسلہ بین الاقوامی سلسلہ ہے۔

حاجی نوشہ کا ایک پوتا جمال اللہ تھا، جسے شرافت صاحب نے فقیہہ اعظم کا لقب دیا ہے۔ یہ فقیہہ اعظم لوگوں کو صرف بد دعائیں دیا کرتا تھا۔ شرافت صاحب نے ایسے کئی واقعات نقل کئے ہیں جن میں ان کی بد دعاؤں سے لوگوں کا بڑا جانی اور مالی نقصان ہوا ص۲۱۳-۱۴۔ یہ لوگ کس منہ سے خود کو رحمتہ للعٰلمین کا جانشین بتاتے ہیں؟

حافظ الٰہی بخش نامی ایک متصوف کو شرافت صاحب نے "سر حلقہ اہل بیت نبویہ" اور "شبیہ رسول الثقلین" کے القاب سے یاد کیا ہے۔ وہ بھی لوگوں کو بد دعائیں دیا کرتا تھا۔ ایک بار اس کی بد دعا سے ایک شخص کے تین بیٹے مر گئے تھے ص۲۶۸۔ اس کے پانچ خلفاء میں دو رنگریز، دو دھوبی اور ایک حجام تھا۔ ص۲۷۳۔ اسی طرح رحمت اللہ عارف کی بد دعاؤں سے بھی بہت سے لوگوں کا بیڑہ غرق ہوا تھا ص۲۹۱۔ الٰہی بخش نے اپنی وفات سے پہلے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ وہ اسے مردہ نہ سمجھے۔ اسے جس چیز کی ضرورت ہو، اسے یاد کرے، وہ اس کی مدد کے لئے پہنچا کرے گا ص۲۷۴۔ ایسی بات تو نبی کریمؐ نے بھی اپنی ازواج مطہرات سے نہیں کہی تھی اور سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان کی کفالت کیا کرتے تھے، یہ الٰہی بخش بھلا کس گنتی میں ہے۔

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ کئی اولیاء اللہ کعبہ میں جا کر نماز پڑھتے ہیں یا کعبہ ان کے پاس آجاتا ہے ص۱۶۷۔ انہیں چاہئے تھا کہ وہ اپنے اس قول کی تائید میں کتاب و حدیث یا آثار صحابہ میں سے سند پیش کرتے۔

آنحضرتؐ تو چودہ سو قدسی صفت صحابہ کے ساتھ بحالت احرام حدیبیہ میں خیمہ زن رہے۔ نہ یہ بزرگ کعبہ پہنچے اور نہ ہی کعبہ چل کر ان کے پاس آیا بلکہ اس سال عمرہ ادا کئے بغیر واپس لوٹنا پڑا۔ نوشاہیوں کے بھنگی چرسی اولیاء العیاذًا باللہ صحابہ سے افضل ہوئے کہ کعبہ ان کے پاس آجاتا ہے۔

شرافت صاحب کے ایک مدّاح آفتاب احمد نقوی شریف التواریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اگر شریعت مانع نہ ہوتی تو میں اس کتاب کو الہامی کتاب تصور کرتے ہوئے شرافت صاحب کی پیغمبری کو تسلیم کر لیتا" ص۱۹۵۸ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پتہ نہیں لوگوں نے الہام اور پیغمبری کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ شریف التواریخ جیسی لچر کتاب کو الہامی کتاب سمجھنا الہامی کتابوں کی توہین ہے۔ اس کے لئے تو وہی اصطلاح مناسب رہے گی جو غالب نے غیاث اللغات کے لئے استعمال کی تھی۔

شرافت صاحب غلام حیدر نامی ایک نوشاہی پیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ حج کے دن اپنے حجرہ سے غائب ہو کر عرفات میں پہنچ جاتا تھا ص۱۷۱۴۔ چند سال قبل پاکستان میں ایک پیر صاحب کی ولایت کا شہرہ دُور دور تک پہنچ گیا، حتیٰ کہ حکام وقت بھی اس کے پاس جانے لگے۔ یہ حضرت نماز کے وقت اپنے جسم کو چادر میں چھپا لیتے اور تھوڑی دیر بعد چادر اتار کر کہتے کہ وہ بیت اللہ میں نماز ادا کر کے آئے ہیں۔ ایک دن ایک "ظاہر بین دیوبندی وہابی" نے ان سے کہا، "آپ فرماتے ہیں کہ آپ ابھی ابھی نماز مغرب حرم شریف میں ادا کر کے آئے ہیں، وہاں تو ابھی عصر کا وقت ہوگا۔ آپ مغرب کی نماز کیسے وہاں ادا کر آئے؟"

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ فضل الٰہی نوشاہی کئی روز پہلے لوگوں کو مطلع کر دیا کرتا تھا کہ فلاں دن فلاں وقت بارش ہوگی ص۸۲۷۔ سورہ لقمان کی آخری آیت میں ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ...الخ

یعنی پانچ باتوں کا علم صرف اور صرف اللہ کو ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بارش کب ہوگی۔ اس ارشاد ربانی کے معیار پر شرافت صاحب اور فضل الٰہی کے دعوے کی حقیقت پرندہ کے برابر بھی نہیں رہتی۔

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ رات کے وقت مسجد نبوی میں نماز معکوس ادا کیا کرتے تھے اور آپؐ نے اس نماز کا بڑا ثواب بتایا ہے ص۱۴۴۷۔ لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔ یہ متصوفہ حضورؐ کے بارے میں وضعی روایتیں بیان کرنے میں بڑے دلیر واقع ہوئے ہیں۔ حالانکہ آپؐ کا یہ فرمان ہے کہ جو کوئی میری طرف غلط بات منسوب کرے، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری شریف التواریخ کی تقریظ میں لکھتے ہیں، "اگر جناب شرافت صاحب خانِ خاناں کے دور میں ہوتے یا وہ اس زمانے میں ہوتا تو یقیناً ان کے مسودات و مبیضات کو زر وجواہر میں تولتا" ص۱۸۳۲۔ میری یہ رائے ہے کہ اگر شرافت صاحب اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ہوتے یا وہ ان کے زمانے میں ہوتا تو ان کا حشر سرمد سے مختلف نہ ہوتا۔

شرافت صاحب رقمطراز ہیں کہ شیخ بڈھا بھلوالی نے ایک بار اپنی کرامت سے ایک مردہ لڑکا زندہ کر دیا تھا اور ایک دوسرے موقعہ پر مذبوحہ بھینسوں کو زندہ کر دیا تھا ص۱۳۵۴۔ پتہ نہیں لوگوں نے خرقِ عادت کو ولایت کا لازمہ کیوں قرار دے دیا ہے؟ حالانکہ اکابر صوفیہ نے اسے حیض الرجال سے تعبیر

کیا ہے۔ ڈاکٹر احمد حسین احمد قلعداری نے یہ کیسے لکھ دیا ہے کہ شرافت صاحب نے تاریخ لکھتے وقت جدید تنقید کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر موجودہ سائنسی دور کے تقاضے بھی پورے کر دیئے ہیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب اس کتاب سے ایسی ایک مثال دے سکتے ہیں جہاں انھوں نے سائنسی دور کا تقاضا پورا کیا ہے؟ پھر ایسا دعویٰ کرنے سے کیا فائدہ؟

شاہ رحمٰن نوشاہی سلسلہ کے ایک بڑے پیر ہوئے ہیں۔ شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ جب دہلی کی جامع مسجد بن کر تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ قبلہ کا رُخ صحیح نہیں ہے۔ شاہجہاں کو اس بات کا بڑا رنج ہوا۔ تاہم اس نے ایک قاصد شاہ رحمٰن کی خدمت میں بھیجا اور اُن سے مسجد کا رُخ درست کرنے کی درخواست کی۔ جب قاصد ان کی خدمت میں پہنچا تو اس وقت شاہ صاحب دھوبی گھاٹ پہ کپڑے دھو رہے تھے۔ انھوں نے قاصد کی بات سن کر ایک کپڑا نچوڑا تو مسجد کا رخ درست کر دیا ص۱۴۶۵۔ دہلی والوں نے یہ کرامت ابوالقاسم عرف ہرے بھرے کی طرف منسوب کر رکھی ہے۔ تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد دہلی بنانے والے شہرہ آفاق معماروں پر یہ کتنا بڑا بہتان ہے کہ وہ سالہا سال تک اس بات سے بے خبر رہے کہ مسجد کی قبلہ رُخ دیوار غلط تعمیر ہو رہی ہے۔

اسی بزرگ کے بارے میں شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ وہ طوائفوں کا رقص دیکھ کر مریدوں کو توجہ دیا کرتے تھے ص۱۴۳۷۔ جس روز شاہ صاحب وجد میں آکر خود بھی کسی طوائف کے ساتھ ناچنے لگتے تو اس ولی اللہ کے قدم چودھویں آسمان پر پہنچ جاتے اور ان کے ہاتھ عرشِ معلیٰ کو جا لگتے تھے ص۱۴۵۶۔ سبحان اللہ! شرافت صاحب نے عرشِ معلیٰ تک عروج کا کتنا آسان نسخہ

بتایا ہے ۔ کتب احادیث میں غزوۂ احد کی ذیل میں یہ روایت ملتی ہے کہ اس روز حضرت طلحہؓ کا ہاتھ آنحضرتؐ کا دفاع کرتے ہوئے ہمیشہ کے لئے شل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بابرکت ہاتھ تو کبھی عرش معلیٰ تک نہیں پہنچا لیکن جب کوئی نوشاہی پیر کسی طوائف کے ساتھ رقص کرتا ہے تو اس کے ہاتھ عرش معلیٰ کو جا چھوتے ہیں ۔ اعوذ باللہ من ھذہ الھفوات ۔

شرافت صاحب نے حاجی نوشہ کے مزار کے گرد ۱۳۵۵ھ میں "مطاف" کی تعمیر کا ذکر کیا ہے ص۱۷۸ ۔ ایک دوسرے موقع پر موصوف لکھتے ہیں کہ شیخ سچیار کے عرس کے موقع پر ان کی قبر کا طواف ہوتا ہے ص۱۶۵۱ ۔ علمائے حق کا یہ فتویٰ ہے کہ بیت اللہ یا صفا و مروہ (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا) کے علاوہ کسی اور مقام کا طواف جائز نہیں ، بلکہ گناہ ہے۔ شرافت صاحب کی تحریروں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نوشاہی قبروں کی پرستش میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں ۔

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ حافظ قمرالدین نامی ایک نوشاہی درویش کے اعضاء عبادت کے وقت الگ الگ ہو جایا کرتے تھے ص۱۲۳۴ ۔ اسی طرح قل احمد نوشاہی کے اعضاء بھی الگ الگ ہو جایا کرتے تھے ص۲۸۵ ۔ میاں محمد الدین نامی ایک نوشاہی درویش کے اعضاء بھی کبھی کبھی الگ الگ ہو جایا کرتے تھے ص۱۷۲ ۔ شرافت صاحب غالباً اپنے بارے میں بھی ایسا لکھتے ہوئے شرما گئے ہیں۔ اگر ولی ہونے کی یہی نشانی ہے تو پھر ان کے اور ان کے والد کے ، جن کو ۱۱۴ بار الہام ہوا تھا ، اعضاء ضرور الگ الگ ہونے چاہئیں تھے ۔

جناب احمد حسین احمد قلعداری شریف التواریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ پنجاب کے لوگوں کو رہتی دنیا تک اس کتاب پر بجا طور پر فخر و افتخار ہوگا صٓ ۱۹۷۔ قلعداری صاحب ۔ میرا ایک شاگرد پروفیسر پرویز اقبال بھٹی کہتا ہے کہ وہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ یہ کتاب اگر انگریزی زبان کے قالب میں ڈھال دی جائے تو مسلمان اور اسلام دونوں بدنام ہو جائیں ۔ کیا مسلمانوں کو اپنے ایسے ہی فنِ تاریخ نویسی پر فخر ہے ؟

نوشاہیوں نے بہت سی خرافات کو تصوف کی آڑ میں دین کا جزو بنالیا ہے ۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کی نئی نسل ان چیزوں سے برگشتہ ہو کر دین ہی سے بیزار ہو گئی ۔ اب وہ مرزائی ہو رہے ہیں ۔

شرافت صاحب اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ سید گامے شاہ نامی ایک نوشاہی ولی کی اولاد مرزائی ہو گئی ہے صٓ ۱۲۶۵ ۔ اسی طرح میاں جان محمد نوشاہی کے اہلِ خانہ مرزائی ہونے لگے ہیں صٓ ۱۵۷۴ ۔ سید فضل شاہ کے مرزائی ہونے کا بھی انھوں نے اقرار کیا ہے صٓ ۱۲۶۰ ۔ سید سلطان عالم نوشاہی ولی کی اولاد میں سے روشن علی اور فضل الرحمٰن بھی مرزا غلام احمد کی جھولی میں جا گرے ہیں صٓ ۱۲۶۰ ۔

میری یہ رائے ہے کہ جب بھی جاہل عوام دین کو بازیچۂ اطفال بنائیں گے تو پڑھے لکھے لوگ ایسے دین سے برگشتہ ہو جائیں گے اور پھر جہاں جس کے سینگ سمائیں گے ، وہاں چلے جائیں گے ۔

شرافت صاحب نے صوفیوں کے مقابلے میں علماء کرام کی توہین کی ہے ۔ انھوں نے کئی ایسے واقعات نقل کئے ہیں جن سے علماء کی توہین کا پہلو نکلتا ہے ۔ ایک عالم نے کسی مقصوف کو کھانے کو کچھ نہ دیا تو اس نے اس

عالم کو مخاطب کر کے کہا:

بِرو دُور شو اے سگِ نامراد
کہ مُلّا بروند سخاوت نزاد صـ ۹۲۷

پیر سچیار کے ترجمہ میں شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ ایک بار اس نے پندرہ ہزار انسانوں پر توجہ کی تو وہ سب ابدال بن کر آسمان کی طرف چلے گئے۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ اتنے ہی بڑے مجمع پر توجہ ڈالی تو وہ سب جل کر راکھ ہو گئے صـ ۱۵۹۸ - یہ روایت بھی نوشاہیوں کے کسی بھنگیڑ خانے کی گپ معلوم ہوتی ہے۔ اللہ جانے محمد اقبال مجددی نے یہ کیسے لکھ دیا کہ شرافت صاحب نے شبلی و آزاد کی لسانی قلابازیاں نہیں کھائیں اور نہ ہی خیالی گھوڑے دوڑائے ہیں۔ مجددی صاحب شریف التواریخ کی روایات کو ابن خلدون، ابن مسکویہ، ابن کثیر، برنی اور ابن اثیر کے معیار پر پرکھ کر دکھا دیں تو ہم ان کے ممنون ہوں گے۔

امام شاہ زمانی نام کے ایک نوشاہی ولی کے چوسر کی نردیں اس کے اخلاف نے بطور تبرک سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں اور لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں، شرافت صاحب بھی ان کی زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں صـ ۱۵۴۵۔ شاید ان کی نظر سے مؤطا امام مالکؒ کی یہ حدیث نہیں گذری:

عن ابی موسی الاشعری انّ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال من لعب بالنرد
فقد عصی اللہ و رسولہ

شرافت صاحب اور ان کے ہم مسلکوں نے بغاوت میں استعمال ہونے والے اسلحہ کی زیارت شروع کر دی ہے۔

امام شاہ زمانی جیسا ہی ایک پیر عبدالوہاب نوشاہی شطرنج کھیل رہا تھا۔

اس نے بڑے غصے کے ساتھ ایک نرد زمین پر دے ماری۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اس وقت اس کا ایک مرید جنگل سے لکڑیاں کاٹنے گیا تھا کہ اس پر شیر نے حملہ کر دیا۔ پیر صاحب نے وہیں سے ایک نرد شیر کے سر پر دے ماری جس کے صدمے سے وہ شیر مرگیا ص۱۳۲۱۔ شرافت صاحب دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پیر کسی حال میں بھی اپنے مرید سے غافل نہیں رہتا۔ انھوں نے پنجاب کے وسطی اضلاع میں کئی جگہ شیر کی موجودگی ظاہر کی ہے جو محتاج ثبوت ہے۔

شرافت صاحب ایک نوشاہی فقیر عمر بخش کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سلام چار ہیں:

۱۔ سلامِ شریعت: السلام علیکم، اور اس کا جواب ہے: وعلیکم السلام۔

۲۔ سلامِ طریقت: یا علی مدد، اور اس کا جواب ہے: پیر مولا علی مدد۔

۳۔ سلامِ حقیقت: صفائے مرود (کذا) اور اس کا جواب ہے: دیدارِ کا نفع۔

۴۔ سلامِ معرفت: عشق ذات حق اللہ جمال فقرار، اور اس کا جواب ہے: صحیح پنجتن مولا مشکل کشا شیر خدا۔ ص۸۴۲۔

کیا اب بھی نوشاہیوں کے شیعہ ہونے میں کوئی شک باقی ہے؟ نوشاہی صاحب جسے سلام طریقت سمجھے بیٹھے ہیں وہ استمداد لغیر اللہ کی ذیل میں داخل ہو کر شرک کے زمرے میں آتا ہے اور جسے وہ سلام معرفت سمجھتے ہیں وہ خالصتاً رفض ہے۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ صرف سلام شریعت پر اکتفا کرتے رہے اور انھیں سلام طریقت، سلام حقیقت اور سلام معرفت کی خبر تک نہ تھی۔ یہ شرح صدر صرف نوشاہیوں کو ہوا ہے۔

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ جب ان کا بھائی بشیر احمد فوت ہوا تو اس

کی قبر میں قبلہ رخ دیوار پر کربلا کی مٹی کی ٹکیہ لگائی گئی اور مولوی بنی بخش نے سرہانے بیٹھ کر تلقین پڑھی صت ۱۱۳۰۔ ہمارے ہاں یہ شیعوں کا شعار ہے۔

محمد علی نوشاہی کے بارے میں ان کی یہ روایت ہے کہ وہ دعائے سریانی اور نادِ علی کا ورد کیا کرتا تھا صت ۸۳۳۔ شرافت صاحب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ایک نوشاہی درویش سائیں حیاتیاں والا اثنا عشری مذہب اختیار کر چکا ہے صت ۱۳۸۴۔ اسی طرح سجادل شیر رسول نگری نامی ایک نوشاہی کی اولاد بھی شیعہ ہوگئی ہے صت ۱۳۸۱۔ میرا یہ خیال ہے کہ شرافت صاحب نے صوفیوں کی آڑ لے کر علمار کرام کی توہین بھی اسی شیعیت کے زیر اثر کی ہے۔

شرافت صاحب ایک نوشاہی پیر جمیعت شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کے سر میں جوئیں پڑ گئیں (ان کے ہاں یہ بھی شعار ولایت ہے) ایک روز اس کی ماں نے دو جوئیں نکال کر مار ڈالیں تو پیر صاحب نے ماں کو بددعا دی اور وہ اندھی ہوگئی صت ۱۵۵۲۔ شاید ان کے ہاں آیت مبارکہ دبالوالدین احسانا کی یہی تفسیر ہے۔ پیر صاحب نے دو جوؤں کی خاطر اپنی ماں کی بینائی چھین لی۔

یہ بزرگ اپنے وطن کی سکونت ترک کر کے لاہور چلا آیا تھا اور یہاں وہ نوتہ کنجر کے ہاں مقیم ہوگیا تھا۔ نوتہ ہی اسے دونوں وقت کھانا کھلاتا تھا صت ۱۵۵۲۔ ظاہر ہے کہ نوتہ کنجر کے ہاں سے اسے جو لقمۂ حلال ملتا تھا، وہ بھلا اور کہاں سے مل سکتا تھا؟

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ ایک عورت کا خاوند فوت ہوگیا۔ شاہ رحمن نوشاہی نے اس سے کہا کہ وہ فکرمند نہ ہو۔ اس کا خاوند ہر رات آکر اس سے ملا کرے گا صت ۱۴۶۶۔ اس کی نظیر تو پیغمبروں کے ہاں بھی نہیں ملتی، یہ

نوشاہی پیر کس طرح اپنی بیوہ عورتوں کے پاس آکر وظیفۂ زوجیت ادا کر جاتے ہیں؟

شاہ محمد امین نامی ایک نوشاہی پیر کے مریدوں میں بڑھئی، ماچھی اور لوہار شامل تھے۔ اسے شکر کے ساتھ پیچدار روغن پراٹھے، گوشت اور حلوہ بڑا مرغوب تھا صنٓ۔ وہ اپنے مریدوں کے ہاں یہی خواہش لے کر جایا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے حاجی نوشہ کی قبر پر چلّہ کاٹا تو حاجی صاحب متجسم ہو کر اس کے سامنے آگئے اور اس سے کہنے لگے کہ وہ فکرمند نہ ہو، موصوف اس کے ساتھ ہیں۔ میری یہ رائے ہے کہ یہ اس کی قوتِ واہمہ ہے جو پیچدار پراٹھے کھانے کے بعد غنودگی کے عالم میں متجسم ہو گئی تھی۔

شرافت صاحب نے بعض مواقع پر بالکل اَن پڑھ دیہاتیوں والا اندازِ تحریر اپنایا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ بھڑی نامی ایک موضع میں وہابیہ دیوبندیہ گروہ پیدا ہو گیا۔ یہ گروہ بزرگوں کی تنقیص کیا کرتا تھا۔ آخر کار تنگ آکر صاحبزادہ غلام مصطفیٰ نے، جو میٹرک پاس تھا اور علوم دینیہ سے بھی "واقف" تھا، لاؤڈ اسپیکر خرید کر شاہ رحمٰن کی خانقاہ میں نصب کیا اور اس پر دن رات اپنے عقائد کا پرچار شروع کر دیا۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جاء الحق وزھق الباطل کا ظہور ہوا اور وہابیہ کمزور پڑ گئے صنٓ۔ شرافت صاحب کو اتنا بھی علم نہیں کہ وہابی اور دیوبندی دو الگ گروہ ہیں۔ دیوبندی حنفی العقیدہ ہیں۔ وہ بیعت ہوتے بھی ہیں اور بیعت لیتے بھی ہیں۔ وہ بزرگوں کا احترام دل و جان سے کرتے ہیں لہٰذا ان کی تنقیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نام نہاد نوشاہی فقرار کے دجل و فریب کا پردہ چاک کر کے سادہ لوح عوام کو ان بھنگیوں اور چرسیوں کے دامِ تزویر میں پھینکنے سے

روکتے ہیں۔

شرافت صاحب کو غالباً یہ معلوم نہیں ہے کہ اکابرین دیوبند میں سے مولانا محمد قاسم نانوتوی رح، مولانا اشرف علی تھانوی رح، مولانا رشید احمد گنگوہی رح، حضرت رفیع الدین رح خلیفۂ اعظم شاہ عبدالغنی مجددی رح، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رح، میاں اصغر حسین دیوبندی رح، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح اور مولانا حسین احمد مدنی رح کا طبقۂ صوفیہ میں بہت اونچا مقام تھا۔ ان کی کسی تحریر میں تعلّی نہیں ملتی، ان میں سے کسی بزرگ نے ملہم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ شریعت کی جیسی اور جتنی پابندی یہ بزرگ دکھا گئے ہیں، اس کی نظیر متقدمین میں تو مل جائے گی، متاخرین میں نظر نہیں آتی۔

آپ کا صاحبزادہ غلام مصطفیٰ جو میٹرک پاس اور علوم دینیہ سے "واقف" تھا، علمائے دیوبند کو شکست دینے میں کیسے کامیاب ہوگیا؟ نی زمانہ تنہا، میٹرک پاس تو اردو میں درخواست بھی نہیں لکھ سکتا، وہ دیہاتی پیرزادہ علوم دینیہ سے کیسے واقف ہوگیا؟ نوشاہیوں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے آپ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ آپ کا بھرم تو شریف التواریخ میں کھل گیا ہے، باقیوں کا کیا حال ہوگا؟

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ نوشاہیوں نے ایک پیر کے تبرکات دفن کرکے قبر بنالی ہے ۱۵۴۵ء۔ اس طرح کی پتہ نہیں کہ کتنی جعلی قبریں وجود میں آگئی ہیں۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز رح کے ملفوظات جوامع الکلم میں کتوں کی دو قبروں کا ذکر آیا ہے، جن کی پرستش شروع ہوگئی تھی۔ سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں بھی بہت سی جعلی قبریں بن گئی تھیں، جن کی تفصیل پروفیسر خلیق احمد نظامی نے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات میں

دیکھتے۔

شرافت صاحب نے شاہ رانا نوشاہی نام ایک ولی کی یہ کرامت بیان کی ہے کہ وہ بزرگ کرامت دو سال شکم مادر میں رہا تھا ص ۲۱۷۔ اگر یہی شانِ ولایت ہے تو بڑے بڑے اولیاء اللہ اور انبیاء کرام کو تو اس سے بھی زیادہ وقت شکمِ مادر میں صرف کرنا چاہیئے تھا۔

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ سید محمد شاہ نامی ایک نوشاہی کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ جس کی نماز جنازہ وہ پڑھا دے، وہ ضرور بخشا جاتا ہے ص ۳۳۸۔ شرافت صاحب یہ ضمانت تو اللہ تعالیٰ نے حضرت شارع علیہ السلام کو بھی نہیں دی بلکہ ان کو مخاطب کر کے تو یہ بھی فرمایا تھا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ: ۸۰)

یہ بے چارہ محمد شاہ نوشاہی کس گنتی میں ہے؟

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ میاں اکبر علی نامی ایک نوشاہی ولی کو سکھوں کے عہدِ حکومت میں سرکار کی طرف سے اس شرط پر زمین ملی ہوئی تھی کہ "دولت خالصہ جی کے لئے دعا میں مشغول رہا کریں" ص ۱۶۹۴ یہ وہ زمانہ تھا جب سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ اپنے رفقاء کے ساتھ سرحد میں سکھوں کے خلاف مصروفِ جہاد تھے۔ سکھ حکومت پنجاب کے پیروں اور مولویوں کو وظائف اور جاگیریں دے کر جہاد میں شامل ہونے سے روکنا چاہتی تھی۔ یہ زمین بھی اسی بنا پر ملی تھی۔

شرافت صاحب لکھتے ہیں کہ گل احمد کو بھی سکھ حکمرانوں نے اس شرط پر زرعی اراضی دی تھی کہ وہ ان کی حکومت کے استحکام کے لئے دعا کرتا رہے ص ۲۸۴۔

ایسے لوگ مسلمانوں کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں ؟ چہ جائیکہ انھیں ولی اللہ تسلیم کیا جائے۔

قل احمد کے مریدوں میں حجام اور جولاہے شامل تھے اور وہ سانپ کے کاٹے کا منتر جانتا تھا صـ۲۹۰ یہ عجیب بات ہے کہ وہ خود سانپ کے کاٹنے سے ہلاک ہوا اور خود اس پر کوئی منتر کارگر ثابت نہ ہوا صـ۲۹۰۔

شرافت صاحب نے صـ۱۸۰۹ پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کا شجرہ نسب حضرت علیؓ کے غیر فاطمی فرزند عباسؒ سے جاملتا ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے شریف التواریخ میں جابجا اپنے نام سے پہلے سید لکھا ہے۔ وسطی پنجاب کے باشندے حاجی نوشہ کو گلگو بتاتے ہیں، لیکن ان کے احفاد نے اپنا نسب عباس بن علیؓ سے جاملایا ہے۔

لاہور میں لٹن روڈ پر "جمعیت قریش" کا بورڈ آویزاں ہے۔ یہ دراصل بڑے قصائیوں کی ایک انجمن ہے۔ چند سال ہوئے قصائیوں نے اعلان کیا تھا کہ انھیں قصائی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قصیٰ بن کلاب کی اولاد ہیں۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے؟ دہلی کے استاد چاند خاں کی ایک کتاب "موسیقی حضرت امیر خسرو" کے عنوان سے دہلی میں چھپی ہے۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ میراثی عربی النسل ہیں۔ انھوں نے اس کی یہ دلیل دی ہے کہ میراثیوں کو لوگوں کے شجرے یاد ہوتے ہیں اور یہ عربوں کا مخصوص فن ہے اس لئے میراثی عرب کے باشندے ہیں۔ اسی لئے اب سمجھدار میراثی خود کو قریشی کہلانے لگے ہیں۔

آنحضورؐ نے نسب بدلنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔

شرافت صاحب اپنے جدامجد حاجی نوشہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے ہاتھ پر دو لاکھ افراد نے اسلام قبول کیا تھا صـ۱۶۳ ان کا یہ دعویٰ بھی

ان کے دوسرے دعاوی کی طرح محتاج ثبوت ہے۔ اسی بزرگ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے اصرار کرکے سونے کے کڑے بطور نذر لیا کرتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی قبر کو اللہ تعالیٰ اپنے انوار سے منور فرمائے۔ موصوف کیا اچھی بات تحریر فرما گئے ہیں کہ وہ ایسے پیروں کو اچھا نہیں سمجھتے جو اپنے مریدوں سے ٹکے وصول کرتے ہیں۔ لیکن یہاں تو طلائی کڑوں کی وصولی کا مسئلہ ہے۔

شرافت صاحب نے مؤسس سلسلہ نوشاہیہ حاجی نوشہ کے بہتر خلفاء کے نام شریف التواریخ میں درج کیے ہیں، ان میں سے کئی خلیفے مجہول الاسم ہیں مثلاً: زینی، فتنا، عاج، جادو رائے، رام رائے، چھنن، گگا، جیتا، جاتری، قندو، فضلا، سوہندا، جماں، آلہیا، بگا ماچھی، قطبا، بلو رائے، خیرا، بہلو، شاہو موچی، صاحبو، متا، چوہڑ، بگینا اور ولیگا ص ۱۱۵۔ اسی طرح اس فہرست میں کھیون بافندہ، بجوئی، مولراج، نہالا، جھنڈا مزارعہ، بھیرو فقیر، میاں سنگا، نور محمد نجار، ہندل قوال، شیخا رانجھا اور جیون حجام کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں۔ اس پر ان کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کا سلسلہ انٹرنیشنل سلسلہ ہے۔

یہ تبصرہ لکھا جا چکا تھا کہ شریف التواریخ کی مزید دو جلدیں چھپ کر بازار میں آگئی ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ان پر بھی تبصرہ کردں گا۔

شاہ نور اللہ بڈھانوی رحمۃ اللہ علیہ

(حضرت حکیم الامت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ کے ایک نامور و عظیم المرتبت خلیفہ و شاگرد)

مسعود انور علوی کاکوروی (ایم اے علیگ)

قارئین برہان کے ملاحظہ سے ماہ اپریل دسمبر، اکتوبر ۱۹۸۳ء میں حضرت ولی نعمت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دو جلیل القدر اور آئینہ کمال خلفاء حضرت شیخ محمد عاشق پھلتیؒ اور حضرت حافظ عبد النبیؒ کے احوال و افادات گذرے ہوں گے۔ زیر نظر مقالہ میں اُن کی دلچسپی کے واسطے حضرت محدث دہلویؒ کی شخصیت کے آئینہ دار، دست راست اور مخصوص خلیفہ و شاگرد مولانا شاہ نور اللہ بڈھانویؒ کے حالات و افادات مختصراً پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ راقم السطور کی نظر سے مولانا موصوفؒ کا تفصیلی حال بجز ان کے برادر طریقت شیخ محمد عاشق پھلتیؒ کی تالیف القول الجلی کے کسی تذکرہ میں نہیں گزرا۔

حضرت حکیم الامتؒ کے عہد کے حالات کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس "قائم الزماں" شخصیت سے متعلق اور وابستہ رہنے والا ہر ہر شخص اپنی اپنی جگہ ایک "شمس بازغہ" ہو کر چمکا اور اپنی لیاقتوں کو اجاگر کرتے ہوئے "ذرہ آفتاب تابانیم" کے نعرے بلند کیے، اعلائے کلمۃ الحق میں سینہ سپر ہو کر کسی لومۃ لائم کی پروا نہ کی اور اپنے مجددؒ کی روحانی و ذہنی انقلاب کی عکاسی کرتے ہوئے اس کے کارناموں کو برسرِ عام طشت از بام کیا۔ یوں تو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے تعلق اور ربط خاص رکھنے والوں کی اس نازک دور میں بھی کمی نہ تھی لیکن یہ رجحان جس شدت سے ان چند ہستیوں میں تھا اور شہرت سے

وہ خلوص و اتحاد جوان کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا اور خلوت و جلوت میں جس جمال جہاں آرا کے وہ دلدادہ تھے باوجود غور کرنے کے دوسروں میں کم نظر آتا ہے ان کے باہمی اتحاد و میل محبت کے متعلق صاحب القول الجلی رقمطراز ہیں۔

"از انجملہ محبت مفرط درمیان یکدیگر..... و طلب چیز برائے یکدیگر چہ در دنیا و چہ در آخرت و چہ در غیبت و چہ در حضور گویا یک تن اند و یک جاں۔"[1]

"وہ آپس میں انتہائی محبت و خلوص رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں اور اشیاء کی طلب میں خواہ دینی ہو یا دنیوی ہر شے میں شرکت پسند ہیں۔ غرضکہ یگانگت اور اتحاد قلبی میں ایک ہی جسم و جان ہیں۔"

آپ کا نام نور اللہ بن معین الدین ہے۔ مؤلف "القول الجلی" نے آپ کو ان القاب سے یاد کیا اور ان اوصاف سے سراہا ہے:

قدوۂ طالبان راہ و عمدۂ سالکان حق آگاہ عالم الفروع والاصول جامع المعقول والمنقول صاحب الذوق والوجدان کامل المعرفۃ والایقان عرفاں پناہ شاہ نور اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ کہ از قدمائے اصحاب و کملائے احباب و بہین خلیفہ حضرت ایشاں اند۔[2]	طالبان راہ کے خلاصہ سالکان حق آگاہ کے ستون فروع و اصول کے عالم، معقول و منقول کے جامع صاحب ذوق و وجدان، یقین و معرفت میں کامل عرفاں پناہ شاہ نور اللہ سلمہ، جو حضرت اقدس کے قدیم ساتھی اور جگری دوست نیز آپ کے خلیفۂ کبیر ہیں۔

آپ کی تاریخ و سن ولادت کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ مؤلف "قول الجلی" بھی اس باب میں خاموش ہیں۔ آپ بھی شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اکابر خلفاء میں تھے نیز فقہ میں آپؒ کے صاحبزادہ حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ کے استاد اور ان کے خسر تھے۔

ابتدائی کتابیں حضرت شاہ صاحبؒ کی والدہ کے ماموں شیخ بدر الحقؒ سے پڑھیں متوسطات

---

[1] القول الجلی و اسرار الخفی ص: ۳۸م [2] ص: ۳۸م

کی چند کتابیں آپ کے خالِ مکرم شیخ عبیداللہ صدیقی سے اور جملہ علوم کی تکمیل خود حضرت شاہ صاحب قدس سرہ سے کی۔ طبیعت میں کمال استقامت تھی اور تکلموا الناس علی قدر عقولھم کے مصداق تھے۔ نہایت متوکل، زاہد، حلیم و بردبار تھے۔ طبیعت میں بڑا اعتدال تھا۔ حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقتصادی اعتبار سے کچھ زائد خوش حال نہ تھے۔ اپنی طالب علمی کے دوران روشن الدولہ ظفر خاں کے مدرسہ میں وظیفہ یاب رہے۔ انھیں ایام میں ایک روز حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے مزار پر شاہ صاحبؒ کے متصل بیٹھے ہوئے تھے کہ انھوں نے بموجب اشارہ صاحب مزار کے ان کو بیعت کا حکم دیا۔ آپ نے اس کو نفحہ من نفحات اللہ سمجھ کر قبول کیا اور اسی وقت شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ رفتہ رفتہ مرشد برحق کی رہنمائی میں اشغال طریقت حاصل کیے اور ان کی رہبری میں سلوک کی راہیں طے کیں۔ مرشد برحق نے جب آپ کی عالی ظرفی و بلند ہمتی ملاحظہ فرمائی اور قلب و نظر کے تقاضوں کو محسوس کیا تو ظفر خانی وظیفہ ترک کرنے اور مکمل فقر اختیار کرنے کا حکم دیا۔ باوجود اس کے کہ یہ وظیفہ محض والدہ ماجدہ کی خدمت کے لیے اختیار کیا تھا لیکن مرشد برحق کے حکم پر بلا چون و چرا سر تسلیم خم کر دیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور لباس فقر یعنی کفنی پہن لی اور حضرت اقدس قدس سرہ کے حلقۂ ارادت مندان میں داخل ہو کر کمالات باطنی سے روز بروز اور وقتاً فوقتاً بہرہ اندوز ہونے لگے۔ ابتدا میں علمی مناظروں کے بہت شائق تھے اور مجالس مناظرہ میں اپنی حدید الذہنی اور لیاقتوں کی بدولت شریک رہتے تھے لیکن پھر مرشد برحق کے حکم کے مطابق ان کو ترک کر دیا۔[1]

مرشد کامل کے پہلے سفر حج کے موقع پر منجملہ دیگر ہمراہیوں کے آپ بھی شریک سفر رہے اور اس سفر میں آپ نے جس محنت و تندہی اور جفاکشی سے تمام رفقاء کی خدمات انجام دیں اور سفر کی مشقتوں، مریضوں کی تیمارداری نیز بار برداری پر جس طرح اپنی بے نفسی کا مظاہرہ کیا وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔ اپنے حسنِ عمل حسن خدمات اور فضل و کمال کی بدولت ہمہ وقت مرشد برحق کی خصوصی توجہات و عنایات اور شفقت و التفات سے محظوظ و مستفیض ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سیرت و کردار کا

---

[1] ص: ۴۳۹۔

آئینۂ کامل بن گئے۔ اس مبارک سفر سے واپسی کے بعد جب شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قصبہ بڈھانہ تشریف لائے تو آپ کو از خود بموجب الہام الٰہی خرقۂ خلافت عطا فرمایا درس ظاہری کا حکم دیا اور اسرار باطنی کے ارشاد پر مقرر فرمایا یہ واقعہ ۱۲۳۶ھ کا ہے۔ ان کے ایک شاگرد نے بڈھانہ پہنچنے کی تاریخ مصرعہ "اے آمدنت باعث آبادی ما" سے نکالی۔[1]

غرضکہ جمال ہمنشیں کی ہر وقت صحبت نے جلوۂ حقیقت سے بالواسطہ اور بلاواسطہ شادکام کیا اور اس تعلق اور ربط خاص کی بدولت محبت قلبی اور فنائیت نے دن بدن اضافہ کیا اور ایک ایسا لگاؤ پیدا کر دیا جس نے ان کی نگاہوں میں اسرار و رموز کو بے نقاب کر دیا۔

مرشد برحق ایک مکتوب میں اپنے باکمال مرید کی منعت واہمیت کو اس انداز میں بیان فرماتے ہیں کہ :

"اگر بجانب شما نظر کردہ می شود سرورے دیگر بر روئے کار می آید۔ لطیفۂ خفیہ آگاہ و ست و قلب نیز مست، در اصل فطرت افتادہ است، در اصل جبلت استقامتے و متانتے دارید و ترک التفات بہ دنیا خود جبلت شما است"[2]

جب بھی تمہاری طرف نگاہ اٹھتی ہے ایک نیا ہی سرور حاصل ہوتا ہے۔ تمہارا لطیفہ قلبی خفیہ آگاہ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قلب بھی مست ہے۔ تمہاری فطرت میں استقامت اور متانت بھری ہوئی ہے اور دنیا سے بے رغبتی اور بے التفاتی تو تمہاری فطرت ہے ہی۔

مرشد برحق کی ان عنایات کی بدولت تمام خلفاء میں آپ قابل رشک تھے۔ صاحب قول الجلی ایک دوسرے مقام پر آپ کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں :

"در تحمل و بردباری مرتبہ رفیع حاصل نمودہ وجود ایشان گویا حلم مجسم است کہ خشونت مزاج دخلے ندارد، صفت عدالت در نہایت کمال

تحمل و بردباری میں بلند مقام حاصل کیا ہے ان کا وجود حلم کا پیکر مجسم ہے جس میں درشتی مزاج نام کو نہیں ہے۔ صفت عدالت میں نہایت باکمال آپ

---

[1] ص: ۴۴۰۔ [2] ص: ۴۴۱-۲

دارند و در مخاطبات و مکاتبات و تقریر و تحریر و مذاکرات علمیہ اعتدالے مرعی می دارند کہ احسن ازاں صورت نہ بندد، و در معرفت مقدار ہر یک و معاملہ بحسب آں قولاً و فعلاً بمرتبہ رسیدہ اند کہ در دیگرے یافتن محال است۔ باعتقاد بندۂ کاتب حروف در حسنِ اخلاق و آداب و لیاقتِ امامت بایشاں مسلّم است [۱]

نوشت و خواند خطوط و کتابت تقریر و تحریر اور مباحثۂ علمیہ میں ایک خاص اعتدال ملحوظ رکھتے ہیں جس سے بہتر ممکن نہیں۔ نیز معرفت میں قولاً و فعلاً ایسے مرتبہ پر فائز ہیں جو دوسرے کے لیے محال ہے بندہ کاتب کے حسن اخلاق، حسنِ آداب اور لیاقتِ امامت کے سلسلہ میں مسلّم ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

وجودِ مسعودِ ایشاں از عطایائے الٰہیہ است کہ غنیمتش باید شمرد۔[۲]

ان کا مبارک و مسعود وجود اللہ کی بڑی نعمت ہے جس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

مرشد برحق سے فیوضاتِ باطنی حاصل کرنے میں آپ بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ ذیل میں آپ کے چند واقعات تحریر کیے جاتے ہیں جن سے آپ کی محبت ذاتی اور حالات باطنی پر روشنی پڑ رہی ہے۔

خواجہ محمد امین کشمیری ولی اللّٰہی بیان کرتے تھے کہ:

در واقعہ دیدم کہ گویا حضرت ولی نعمت دامت برکاتہم بدست مبارک خود بر پارچہ کاغذ ثبت فرمودند کہ دریں زمانہ شخصے از یں لائق کہ در صحبت او بنشیند مبارک نور اللہ است [۳]

میں نے واقعہ میں دیکھا کہ حضرت ولی نعمت دامت برکاتہم نے ایک کاغذ پر تحریر فرمایا کہ موجودہ عہد میں ایسا شخص جس کی صحبت میں لوگ بیٹھیں اور فیض حاصل کریں وہ میاں نور اللہ ہیں۔

خود شاہ نور اللہ بڈھانوی بیان کرتے تھے کہ:

یکشد در نماز مغرب بودم کہ بعض اخلاق و شمائل

ایک بار نماز مغرب میں حضرت اقدس مدظلہ العالی کے

---

[۱] ص: ۱۴۴ [۲] ص: ۳۴۴ [۳] ص: ۳۴۲

حمیدہ حضرت اقدس مدظلہم العالی متصور شدند وازیں جہت اطمینان وسرور درقلب وتخیلہ قرار یافت من بعد در تخیل آمد کہ حضرت اقدس مرتبہ جامعیۃ دارند شاید کہ استمداد ازجناب ایشاں درہر امر جزئے چنداں مفید نباشد باز در دل رسید کہ استمداد ازجناب معظم درہر امر فائدہ می دارد و درا لحاج ہر مقصدے اثرے می بخشد گو کہ توجہ عالی بداں سو مصروف باشد یا نباشد باز عقب ایں عالم ملائیک کہ بتدبیر عالم موکل اند متصور شدند و فیما بین خود کلامے دارند و از ایشاں صدائے می آید ہم چو صدائے ہنگامہ کہ از بعید مسموع می شود بے آں کہ کلمات مفہوم شوند پس گوش داشتم کہ بشنوم اما از انتظام عالم ہم چیزے ذکر می کنند پس او از لفظ اصلح درخیال رسید و بس ۔[1]

صفات حمیدہ متصور ہوئے جس کی وجہ سے نہایت اطمینان وسرور حاصل ہوا۔ دل میں آیا کہ چوں کہ حضرت اقدس مرتبہ جامعیت رکھتے ہیں اس لیے ہوسکتا ہے کہ آپ سے ہر جزئی معاملہ میں استمداد اتنی مفید نہ ہو لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں آپ سے ہر معاملہ میں استمداد مفید ہے اگرچہ آپ اس طرف اپنی توجہ عالی مصروف کریں یا نہ کریں اس کے بعد وہ فرشتے جو تدبیر عالم پر موکل ہیں آپس میں بات چیت کرتے متصور ہوئے۔ ان سے ایک ایسی آواز سنائی دے رہی تھی جیسے دور سے شور وغل کی ہوتی ہے لیکن باتیں سمجھ میں نہیں آتیں میں نے اس کے سننے کے لیے کان لگائے کہ سنوں کیا عالم کے متعلق کوئی گفتگو کر رہے ہیں تو صرف لفظ "اصلح" سمجھ میں آیا۔

ایک بار اپنی بعض مجبوریوں کے باعث مرشد برحق کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے تو بذریعہ عریضہ اپنا حالِ دل اور اس سعادت سے محرومی اور اس پر اپنا تاسف تحریر کیا۔ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ "تمہاری مجبوری معلوم ہوئی اللہ تعالیٰ ان مجبوریوں کو دور بھی فرمادے گا" اس کے علاوہ اور بھی بہت سی محبت آمیز باتیں مرید صادق کے حق میں فرمائیں۔

شاہ نور اللہ رح بیان فرماتے ہیں کہ "اس محبت نے میرے وجود عنصری میں اس طرح سرایت کیا

---

[1] ص: ۶ - ۴۴۵ -

جس طرح خشک ریت میں پانی یہاں تک کہ سارا جسم اس کیفیت محبّی سے پُر ہو گیا اور ایک نشہ طاری ہو گیا جس کا اثر ظاہری طور پر بھی پورے جسم میں محسوس ہوا۔ اس وقت ایک صورت عنصری حضرت اقدس سے جدا ہو کر میرے جسم میں حلول کر آئی ایسا کہ سر سر میں اور ہاتھ ہاتھ میں اسی طرح بقیہ اور تمام اعضا بھی ہوئے۔ اس کیفیت کے افاضہ نے ایک نئی تازگی بخشی اور اس حسرت و افسوس اور ظاہری جدائی نے جو حضرت کی دوری کے احساس سے دل کو محسوس رہی تھی تسکین پائی۔ اس صورت کا حلول اب بھی باقی ہے اور نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔[۱]

شیخ محمد عاشق پھلتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"ایشاں ارقام فرمودند کہ روزے از انفاس العارفین احوال شیخ الہداد قدس سرہٗ جائے کہ غلبہ کیفیت بیخودی ایشاں مرقوم است بتقریب خواندن فرزندم عطاء اللہ بمطالعہ در آمد بخاطر رسید کہ ایں کیفیت بیخودی فی الحال یافتہ نمی شود وقت شب حضرت اقدس مدظلہم العالی را بخواب دیدم کہ تشریف آوردہ اند و می فرمایند کہ برائے دیدن تو آمدہ ام و کیفیت بیخودی جوش زدہ چنانچہ ایں فقیر نیز متاثر شدہ و کیفیت بیخودی مستولی گردید چوں از خواب بیدار شدم خود را متاثر یافتم و بفضل اللہ وسواسے کہ عارض شدہ بود مرتفع گشت والحمد للہ علی ذٰلک۔[۲]

انھوں نے تحریر فرمایا کہ ایک روز میں انفاس العارفین میں شیخ الہداد قدس سرہٗ کے حالات پڑھ رہا تھا جس میں ان کی بیخودی کی کیفیت مرقوم ہے اتنے میں میرے لڑکے عطاء اللہ آگئے اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اب یہ بیخودی کی کیفیت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ شب میں حضرت اقدس کو دیکھا کہ تشریف لائے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ میں تمھارے ہی دیکھنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ میں ایک بیخودی اور مدہوشی کی کیفیت جوش زن ہے ایسا کہ فقیر بھی اس سے متاثر ہوا اور اس پر بھی بیخودی غالب ہو گئی۔ جب نیند سے بیدار ہوا تب بھی اس بیخودی کا اثر باقی تھا اور اللہ کے کرم سے جو وسوسہ پیدا ہوا تھا وہ بھی

[۱] ص: ۴۴۶۔ [۲] ص: ۴۔ ۴۴۳۔

رفع ہوگیا۔ والحمد للہ علی ذالک

شاہ نور اللہ قدس سرہٗ کا ایک دوسرا قول صاحب القول الجلی نقل فرماتے ہیں کہ:

روزے حضرت ایشاں مسئلہ از مسائل خیر کثیر بیان می فرمودند در سینۂ ما ازاں اختلاجے راہ یافت و قلب ما بداں ایمان نیاورد چوں مجلس منقضی شد برخاستم کہ خواب کنم بطرف بالیں مائل شدم سرما براں ہنوز قرار نہ گرفتہ بود کہ غفلتے آمد و مرا خواب در ربود دراں حال دیدم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کہ ایستادہ اند ... و بداں اشارت کردہ میفرمایند کہ انا اقولہٗ و قولی الحق ہماں ساعت آگاہ شدم و تامل کردم خلش از دل دور شدہ بود۔[۱]

ایک روز حضرت اقدس خیر کثیر کا کوئی مسئلہ بیان فرمارہے تھے میرے دل میں ایک الجھن پیدا ہوئی اور قلب اس پر مطمئن نہ ہوا (اسے تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوا) جب محفل برخاست ہوئی تو میں سونے کے ارادہ سے لیٹا۔ پورے طور پر تکیہ پر سر گیا بھی نہ تھا کہ غفلت طاری ہوگئی اسی حال میں میں نے دیکھا کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور خیر کثیر کی طرف اشارہ کرکے فرمارہے کہ میں بھی یہی کہتا ہوں میرا قول حق ہے اسی وقت میں جاگ پڑا۔ غور کیا تو وہ خلش دل سے زائل ہو چکی تھی۔

یہ تھا شاہ صاحب کے احوال و افادات کا ایک مختصر سا خاکہ۔ آپ کی وفات ۱۱۸۷ھ میں ہوئی جیسا کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ایک مکتوب سے جو انھوں نے شاہ ابو سعید رائے بریلویؒ کے نام تحریر فرمایا مترشح ہوتا ہے۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی اسی بنیاد پر تحریر کیا ہے مات نحو سنۃ سبع وثمانین ومائۃ والف[۲] ۱۱۸۷ھ میں وفات پائی۔

---

(۱) ص: ۲۳

(۲) نزہۃ الخواطر۔ ج ۶: ۳۹۴۔

جدید عربی ادب میں مقالہ نگاری کا ارتقاء

از جناب عبدالحق صاحب اسسٹنٹ پروفیسر عربی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔

جدید عربی ادب میں مقالہ نگاری کے ارتقاء پر کلام کرنے سے قبل قدیم عربی ادب میں مقالہ کی حیثیت پر گفتگو کر لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

قدیم عربی ادب مقالہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ اسماء واشکال الوان اور صیغوں و شرطوں کے ادل بدل سے مفاہیم اور معانی بدلتے نہیں ہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے عظیم مقالہ نگار "جونسن" نے مقالہ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے: بے شک مقالہ عقلی کاوش کا نتیجہ ہے، اس کو کسی بھی ضابطہ وقاعدہ سے مقید کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ مقالہ کسی بھی نسق و نظام کے ساتھ رواں دواں نہیں ہو سکتا ہے۔ "بیکن" کی رائے ہے کہ مقالہ مختصر ملاحظات کا مجموعہ ہے جو بلا اعتناء لکھا جاتا ہے۔ اور عظیم مصری ادیب رائٹر "زکی نجیب محمود" مقالہ کی وسعت پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مقالہ کو کسی رائٹر کے خاص تجربہ کی تعبیر و تحریر پر ہی منحصر کیا نہیں جا سکتا ہے کیونکہ مقالہ ایک مجال ہے جہاں وجود کے ہر شئی پر گفتگو کرنے کی گنجائش ہے۔

قدیم عربی ادب میں مقالہ کے اشکال

ڈاکٹر محمد عوض محمد اپنی کتاب "محاضرات فی المقالۃ الادبیہ" میں کہتا ہے کہ مقالہ

عربی زبان میں قدیم ہے۔ ان کی رائے ہے کہ عربی میں خطبات ومقامات اور رسائل وفصول مقالہ کی مختلف شکلیں ہیں، لیکن انیس المقدسی اپنی کتاب "الفنون الادبیہ واعلامہا" میں کہتا ہے کہ اگر قدماء عرب رائٹرز اور خطباء کی تحریروں وتقریروں اور جدید مقالوں کا جائزہ لیا جائے تو دونوں کے اسالیب تحریر اور مضامین میں واضح فرق محسوس ہوگا، ان کی رائے میں خطبات اور مقامات کسی حال میں مقالہ کے محال میں شامل نہیں ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہ رسائل کو مقالہ کے حدود میں شامل کرنا کسی حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم عربی ادب میں نثری اسلوب کی دو قسمیں ہیں: "دیوانی اسلوب" اور "ادبی اسلوب"۔ دیوانی اسلوب میں جو رسائل حکام کی طرف سے، اوامر ونواہی کی شکلوں میں صادر ہوتے تھے مقالہ کے زمرہ میں ہرگز شامل نہیں ہو سکتے ہیں، خواہ اُن میں فصاحت اور بلاغت اعلیٰ درجہ ہی کی کیوں نہ ہو۔ ان رسائل کی حیثیت مکاتبات رسمیہ کے سوا کچھ بھی نہیں اور مقالہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہو سکتا ہے، باقی رہا قدیم ادبی اسلوب میں رسائل تو ان میں اور مقالہ میں وجہ شبہ صرف یہ ہے کہ رائٹر اس اسلوب میں کچھ بھی لکھنے میں آزاد ہے۔ المقدسی مزید کہتا ہے کہ عربی نثر میں قدماء عرب خطباء اور رائٹرز کی تحریروں اور تقریروں سے جانکاری رکھنے والا کوئی بھی شخص قدیم عربی خطبات اور جدید مقالہ کے درمیان بین فرق کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ انیس المقدسی رسالہ "الدرۃ الیتیمۃ" کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ابن المقفع کا یہ رسالہ اعلیٰ اخلاق، عمدہ سلوک اور بلیغ اقوال پر مشتمل ہے اور یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی ضرورت ہر انسان کو ہر زمان ومکان میں ہے اور ہوتی رہے گی۔ لیکن اس کے باوجود یہ رسالہ اور ابن المقفع کے دوسرے رسائل کسی طرح بھی جدید مقالہ کے اصول وضوابط پر قائم نہیں ہیں، انیس المقدسی، الجاحظ اور التوحیدی کے رسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان دونوں قدیم رائٹرز کے بعض رسائل پر کسی حد تک عصری مقالہ کے قواعد وضوابط منطبق کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان میں شرح جرح وقدح اور تکرار کی وجہ سے وہ عصری مقالہ کے حدود سے خارج ہو جاتے ہیں۔ انیس المقدسی

یہ بھی کہتا ہے کہ فلسفی شاعر ابوالعلاء المعری کے رسائل (جن کو مستشرق مارگولیوت نے جمع کرکے مطبعہ اکسفورڈ سے شائع کیا ہے اور جو لگ بھگ ۴۲ رسالے ہیں) ممتاز زبان، عمدہ ادب اور اعلیٰ فکر پر مشتمل ہونے کے باوجود عصری مقالہ کے حدود سے باہر ہیں اور مراسلات اخوانیہ میں شامل ہیں۔ رسائل اخوان الصفا کا بھی یہی حال ہے اس موضوع میں ہماری متواضع رائے ہے کہ قدیم عربی ادب میں مقالے کے وجود اور عدم وجود کے سلسلہ میں ہمیں یہ بھولنا نہیں چاہیے کہ قدیم قدیم ہے اور جدید جدید ہے اس لیے قدیم تحریروں کے مقاییس جدید ادبی شاہکاروں کے موازین سے مختلف ہونا لازمی ہے، چنانچہ قدیم عربی مقالہ کو جدید تنقیدی معیار سے پرکھنا ہمارے لیے جائز نہیں ہوسکتا ہے، بلکہ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ مغربی ناقدوں کے بتائے ہوئے مقالہ کے خصائص کا مشرقی مقالہ نگاروں کی تحریروں میں پایا جانا قطعی لازم نہیں آتا ہے کیونکہ ہر عصر اور ہر محل کے احوال وکوائف مختلف ہوتے ہیں اور پھر ہر قوم اور ہر ملک کا خاص مزاج ہوتا ہے اور خاص طریقہ تحریر، اگر ہم مذکورہ بالا حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں تو ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے کہ قدیم عربی ادب کے مختلف خطبات ومقامات اور رسائل کے ساتھ ساتھ عصر اموی کے عظیم رائٹر عبدالحمید الکاتب کی شطرنج اور شکار وغیرہ پر تحریریں، عصر عباسی اول کے ہونہار رائٹر عبداللہ بن المقفع کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ اور عصر عباسی ثانی کے کثیر التصانیف عظیم ادیب الجاحظ کے ادبی فصول (جن سے کتاب الحیوان، کتاب البخلاء، کتاب البیان والتبیین، کتاب الاضداد اور کتاب المحاسن پر ہیں) یقیناً مطول اور مختصر مقالات کے نام سے موسوم کیے جاسکتے ہیں بلکہ وہ مقالہ کے نام کے مستحق ہیں۔

جدید عربی ادب میں مقالہ کا مأخذ

مقالہ لفظ قول سے مشتق ہے، اس کا ماخذ کتابت نہیں ہے مکتوب یعنی لکھی ہوئی بات کو

مقالہ یعنی کہی ہوئی بات سے موسوم کیے جانے کی وجہ وہ وجہ شبہ ہے جو خبر اور منشور کے درمیان ہے ہم جانتے ہیں کہ خبر اور منشور دونوں کسی حاکم یا افسر کی طرف سے صادر ہوتے تھے اور اخبارات اور رسالوں میں چھاپے جاتے تھے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عربی اخبارات اپنے اول عہد میں سرکاری ہوتے تھے اور سرکاری بیانات، اوامر و نواہی اور قوانین کے ساتھ ساتھ حاکم یا افسر اور کبھی کبھی مدیر اخبارات اور رسالوں کی رائیں بھی چھاپی جاتی تھیں اس طرح مقالہ ایک بات تھی جو پہلے کہی جاتی تھی پھر لکھی اور چھاپی جاتی تھی۔

عربی صحافت میں سب سے پہلے مقالہ کا اطلاق نثری مکتوب پر عظیم صحافی احمد فارس الشدیاق نے کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اخبار "الجوائب" میں دریائے نیل پر کچھ لکھا تھا اور مقالہ کے لفظ کو استعمال کرتے ہوئے "مقالہ فی اصل النیل" کے عنوان سے چھاپا تھا، الشدیاق نے مقالہ کے لیے لفظ "فصل" کو بھی استعمال کیا ہے چنانچہ "کنز الرغائب" کے جزء اول میں (طبع ۱۲۸۸ھ) وہ لکھتا ہے "اما بعد ــــ بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ "الجوائب" میں چھپے ہوئے فصول جمع کر کے کتاب کی شکل میں چھاپ دیے جائیں"

عربی مقالہ کے اقسام:

عربی مقالہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) صحافی مقالہ (۲) اور ادبی مقالہ، پھر صحافی مقالہ کی چار قسمیں ہیں:۔

۱- افتتاحی مقالہ: جو عربی اخبارات میں عام طور پر صفحۂ اول میں چھاپا جاتا ہے لیکن مصری اخبارات مغربی صحافت سے متاثر ہو کر افتتاحی مقالوں کو صفحۂ اول کی بجائے کسی دوسرے صفحہ میں چھاپتے ہیں اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں عالمی اخبارات کے پہلے صفحے عالمی اور محلی اہم حادثات اور خبروں کے لیے مخصوص ہو گئے ہیں۔

۲- تفصیلی صحافی مقالہ: اس قسم کے مقالے عام طور پر ماہانہ یا ہفتہ وار رسالوں

میں چھاپے جاتے ہیں۔
۳۔ تعلیقی صحافی مقالہ: اس قسم کے مقالوں میں صحافی یا رائٹر کسی بھی اہم واقعہ یا حادثہ، نیا انکشاف یا نئی ایجاد اور سیاسی یا سماجی رپورٹ کا تجزیہ یا اس پر تبصرہ کرتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ ایسا صحافی یا رائٹر عام طور پر وسیع المعلومات عمیق التفکیر اور قدیر صحافی یا رائٹر ہوتا ہے۔
۴۔ انتقادی صحافی مقالہ: اس قسم کے مقالوں میں صحافی یا رائٹر کسی ادبی کام یا سرکاری رجحان کو اجاگر کرتا ہے مذکورہ بالا صحافی مقالہ کے اقسام کے علاوہ بھی مقالے عربی اخبارات اور رسالوں میں عام طور پر چھپتے ہیں جو عربی صحافت میں "تقاریر" اور "یومیات" کے نام سے موسوم ہیں اور جو مختلف چھوٹے موٹے مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں اور عمدہ طرزنگارش کے حامل بھی ہوتے ہیں۔
ادبی مقالہ: ادبی مقالہ کو لکھنے میں رائٹر تفکیر میں متانت اور تحریر میں دقت سے کام لیتا ہے، ادبی مقالوں کے مضامین تاملی، وصفی، انتقادی، علمی اور فلسفی ہوتے ہیں، ادبی مقالہ کے اصناف حسب ذیل ہیں:
۱۔ شخصی مقالہ: اس صنف کے مقالے میں رائٹر اپنے آراء و افکار اور تجربات کو قلمبند کرتا ہے اور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔
۲۔ تاملی مقالہ: اس صنف کے مقالے لکھنے میں رائٹر مختلف اقوام و ملل و نحل کے حکم و امثال اور اقوال مأثورہ سے استفادہ کرتا ہے۔
۳۔ وصفی مقالہ: اس صنف کے مقالوں میں رائٹر کسی شخص یا جماعت کو اپنے آراء و نظریات کے ڈھانچے میں ڈھالتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ کسی اخلاقی مقصد کو ثابت کرے۔
۴۔ انتقادی مقالہ: اس صنف کے مقالوں میں کسی ادبی یا فنی شاہکار کی تعریف یا تنقیص ہوتی ہے۔

۵۔ **علمی مقالہ:** اس صنف کے مقالوں میں کسی علمی مضمون کو آسان طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

۶۔ **فلسفی مقالہ:** اس صنف کے مقالوں میں اخلاق ودین یا ثقافت وتاریخ کے مختلف موضوعات پر گفتگو کی جاتی ہے۔

۷۔ **قصصی مقالہ:** اس صنف کے مقالے میں کسی حقیقت یا موضوع کو افسانہ کے طرزِ نگارش کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔

عربی مقالہ کے مراحل۔

عربی مقالہ کو اپنی موجودہ ارتقائی شکل اختیار کرنے سے قبل اپنی نشوونما کے لیے کئی مرحلے سے گذرنا پڑتا ہے جیسا کہ انیس المقدسی کے آراء سے ہمیں معلوم ہوا۔ قدماء عرب فنی نثر کے مختلف اصناف (رسالہ، خطبہ اور مقامہ) سے مانوس تو تھے مگر وہ مقالہ نگاری کے خصائص پر مبنی مقالہ کے اشکال سے محروم تھے اور ان کی اس محرومی کا سبب ان میں صحافت کا فقدان تھا، چنانچہ عربوں میں عصری مقالہ کا ظہور عربی زبان میں صحافت کے ظہور سے ہوا ہے۔ سب سے پہلے عرب دنیا میں والیٔ مصر محمد علی کے عہد میں عربی اخبار "الوقائع المصریہ" ۱۸۲۸ء میں نکلا تھا۔ "الوقائع المصریہ" سرکاری اخبار تھا اور ۱۸۴۰ء تک کوئی عوامی اخبار ظاہر نہ ہوا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں عظیم عرب ادیب اور رائد عرب صحافی احمد فارس الشدیاق نے شہر آستانہ میں "الجوائب" کے نام سے ایک اخبار نکالا تھا۔ اس اخبار میں الشدیاق کے قلم سے ادبی مقالے فصیح وبلیغ زبان میں شائع ہوتے تھے عربی ادب کے عظیم ادیب مؤرخ جورجی زیدان الشدیاق کے بارہ میں لکھتا ہے کہ وہ پہلا عرب ادیب ہے جو صحافت کی زبان میں تحسینات لایا تھا۔ اس کے لئے ایسا اس لئے ممکن ہوا تھا کہ وہ ادیب اور لغت کا ماہر تھا اور ان کے پاس معلومات کا ذخیرہ تھا۔

الشدیاق کے بعد عبداللہ ابوالسعود نامی مصری ادیب نے "وادی النیل" کے نام سے ۱۸۴۴ء میں ایک دوسرا عوامی اخبار نکالا تھا اور پھر عظیم ازہری ادیب رائٹر رفاعۃ الطہطاوی نے "روضۃ المدارس" کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا۔ وادی النیل الجوائب اور روضۃ المدارس جیسے اخبارات اور رسالے رفتہ رفتہ نکلتے رہے اور عربی مقالہ کی نشوونما اور اس کے ارتقا میں اہم رول ادا کرتے رہے۔ ان اخبارات اور رسالوں میں حسب ذیل اخبارات اور رسالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۔ جمال الدین الافغانی اور الشیخ محمد عبدہ کا "العروۃ الوثقی" جو فرانس سے نکلتا تھا۔

۲۔ رزق حسون کا "مرآۃ الاحوال"

۳۔ خلیل الخوری کا "حدیقۃ الاخبار" جو ۱۸۵۹ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔

۴۔ جورجی زیدان کی زیرادارت "الاہرام" ۱۸۷۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔

۵۔ جورجی زیدان کا ہی جریدہ "الرفاق" ۱۸۸۳ء سے نکلنے لگا تھا۔

۶۔ جورجی زیدان نے ہی "الہلال" کو ۱۸۹۳ء میں نکالا تھا۔

۷۔ ادیب اسحاق اور سلیم النقاش کا "المحروسۃ" ۱۸۸۰ء سے نکلتا تھا۔

۸۔ عثمان جلال اور ابراہیم الدیلمی کا "نزہتہ الافکار" ۱۸۹۹ء سے نکلتا تھا۔

۹۔ ابراہیم الدیلمی کا مجلہ "مصباح الشرق" بھی نکلتا تھا۔

۱۰۔ علی یوسف کا "المؤید" رسالہ کافی دنوں تک آب وتاب سے نکلتا تھا۔

۱۱۔ مصطفیٰ کامل کا "للو" سیاسی دنیا میں ہلچل مچادینے والا رسالہ تھا۔

۱۲۔ احمد لطفی السید کا رسالہ "الجریدۃ" سیاسی اور ادبی مقالوں کا علمبردار تھا۔

۱۳۔ امین الرافعی کا "الاخبار" اب تک زندہ ہے اور سیاسیات پر اہم رول ادا کرتا ہے۔

۱۴۔ محمد حسین ہیکل کا "السیاسۃ" بے حد مشہور رکھتا۔

۱۵- بطرس البستانی کا "الجنان" ادبی مقالے اور کہانیوں کا رسالہ تھا۔

۱۶- الشیخ ابراہیم الیازجی کا "الطبیب"
۱۷- انہی کا "البیان"
۱۸- انہی کا "الضیاء"
مقالے اور کہانیوں کے رسالے کی حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹- یعقوب صروف کا "المختطف" دنیا بھر میں مشہور تھا۔

۲۰- محمد زکی عبدالقادر کا "الفصول" خالص ادبی مقالہ تھا۔

۲۱- احمد امین کا "الثقافۃ"

۲۲- ان کا ہی "الکاتب"

۲۳- احمد زکی عبدالقادر کا "ابولو"

نیز مندرجہ ذیل رسالے:

۲۴- الکاتب المصری

۲۵- الادب

۲۶- الادیب

۲۷- الرسالۃ الجدیدہ

۲۸- الحوار

۲۹- الکوکب

اور شمالی امریکا میں بسنے والے مہاجرین عرب کے رسالے

۳۰- الہدیٰ۔

۳۱ مرآۃ العرب

۳۲- البیان

۳۳- السائح

عربی مقالہ کو پروان چڑھانے میں جو رول ادا کیا ہے عرب ادباء اس کو کبھی فراموش نہ کر پائیں گے۔

عربی مقالہ کا پہلا مرحلہ ۱۸۴۰ء میں شروع ہوتا ہے اور ۱۸۸۰ء تک ختم ہوتا ہے اس مرحلہ میں عربی مقالہ کی نشو و نما ہوتی ہے۔ عربی مقالہ کا دوسرا مرحلہ ۱۸۸۱ء میں شروع ہوتا ہے اور ۱۹۲۰ء تک ختم ہوتا ہے اس مرحلہ میں عربی مقالہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے اور عربی مقالہ کا تیسرا مرحلہ ۱۹۲۱ء سے شروع ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ۱۸۴۰ء سے ۱۸۸۰ء تک کی مدت میں عربی مقالہ کی نشو و نما احمد فارس الشدیاق۔ عبداللہ ابوالسعود اور رفاعۃ الطہطاوی جیسے قادر ادباء اور رائٹرز کے ہاتھوں ہوئی ہے اور ۱۸۸۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کی مدت میں عربی مقالہ عظیم مقالہ نگار مصطفیٰ المنفلوطی جیسے ادباء اور رائٹرز کے مساعی حمیدہ کی وجہ سے اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا تھا۔

المنفلوطی کا مقالہ نگاری میں طرز نگارش چند اہم اور واضح خصائص کا حامل ہے ان کا طرز نگارش تکلّف اور تقلید سے خالی نظر آتا ہے۔ اُن کے مقالوں کی موضوعیت میں صداقت پائی جاتی ہے، ان کے مقالوں کی عبارتوں میں حسن و خوبی کا خاص اہتمام پایا جاتا ہے، ان کے مقالوں میں عاطفی رجحان خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ ان کے مقالے تعبیری تعقیدات اور لفظی محسنات سے خالی ہیں اور ان کے مقالوں میں طرز نگارش سہولت اور سلاست کا حامل ہے۔

عربی مقالہ کے اس طرز نگارش کی بنیاد عصر عباسی کی ممتاز عربی نثر ہے جو عربوں کو ابن المقفع اور الجاحظ جیسے نامور رائٹرز کی تحریروں سے ملی ہے۔ عصر عباسی کے نثری خصائص ہم کو المنفلوطی کے مقالات میں واضح طور پر ملتے ہیں، ان مقالات کو "المؤید" شائع کرتا تھا اور اب وہ "العبرات" اور "النظرات" کے دو عنوانوں کے تحت کئی جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور وہ ادبیات، سماجیات اور اخلاقیات پر مشتمل ہیں۔ کم لوگ ہوں گے جو ان مقالوں میں المنفلوطی کے طرز نگارش سے محظوظ نہ ہوں گے۔ مقالہ نگاری میں المنفلوطی کا طرز نگارش

آج تک مؤثر اور جاذب ہے اس مرحلہ کے دو مزید اہم مقالہ نگار "جمال الدین الافغانی" اور الشیخ محمد عبدہ کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے، کیونکہ اول الذکر مقالہ نگار عالم، فلسفی اور سیاسی نے اپنے مقالات کے ذریعہ (جو "العروۃ الوثقیٰ" میں چھپتے تھے) عربوں خاص کر مصریوں کو سیاسی، سماجی اور مذہبی سوجھ بوجھ سے بیدار کر دیا تھا اور ان کے شاگرد رشید الشیخ محمد عبدہ اپنے استاذ مرشد کی رہنمائی میں زیادہ سے زیادہ معرکۃ الآراء مقالات آسان اور سلیس زبان میں اور مختلف مضامین پر لکھتے تھے۔

مقالہ نگاری کے تیسرے مرحلہ میں عربی نثر انحطاطی عہد کے مسجع اور مقفیٰ نثری اسلوب سے مکمل طور پر آزاد ہو گیا تھا اور ترقی و عروج کے اوج تک پہنچکر عربی شعر پر فوقیت حاصل کر چکا تھا، اس کے کئی اسباب تھے۔ قاہرہ یونیورسٹی کے مختلف معاہد اور کالجوں کا قیام، ازہر یونیورسٹی کی اصلاح۔ اخبارات اور رسالوں کی کثرت یورپ میں تعلیم حاصل کر کے عرب منتقفین کی واپسی اور ان کا مختلف ادبی اور ثقافتی کاموں میں اشتراک اور جلیل القدر ادباء وعلماء اور رائٹرز کی سیاسی، سماجی اور ادبی اصلاحات میں کوششیں خاص کر قابل ذکر ہیں۔

اس مرحلہ کے جلیل القدر مقالہ نگاروں میں لطفی السید، طٰہٰ حسین، عباس محمود العقاد، سلامہ موسیٰ، عبد القادر حمزہ، محمد حسین ہیکل، احمد امین، محمود عزمی، خطیب مصری، مصطفیٰ الرافعی، احمد حسن الزیات، محمد سعید العریان، مخائیل نعیمہ اور جبران خلیل جبران ہیں۔ انھوں نے عربی نثر کو عروج تک پہنچانے اور عربی مقالہ کو عالمی مقالہ کی سطح تک پہنچانے میں عظیم اور اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے معیاری رسالوں ("السیاست" البلاغ، کوکب الشرق، الجہاد، الہلال، المقتطف، الفصول، الرسالۃ اور المجلہ) میں قدیم اور جدید عربی زبان و ادب، مغربی آداب، فلسفۂ اسلام، تاریخ، سماج، سیاست، اقتصاد، تعلیم و ثقافت، اخلاق و مذاہب پر مضامین کثرت سے لکھتے رہے ہیں، فی الحال

عربی میں اکثر و بیشتر کتابیں جو ہمارے سامنے ہیں وہ پہلے پہل مقالوں کی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر طٰہٰ حسین کی "حدیث الاربعاء" جو تین جلدوں میں ہے۔ محمد حسین ہیکل کی "فی اوقات الفراغ" جو تین اقسام پر مشتمل ہے۔ عباس محمود العقاد کی "مطالعات فی الکتب والحیاۃ" و "مراجعات فی الآداب والفنون" اور "ساعات بین الکتب" المازنی کی "حصاد الهشیم" احمد امین کی "فیض الروح" مصطفیٰ الرافعی کی "وحی القلم" اور احمد حسن الزیات کی "وحی الرسالہ" اُن مقالات کے مجموعے ہیں جو پہلے مختلف رسالوں میں چھپ چکے تھے۔

چند مقالات کی جھلکیاں:

ہم ذیل میں چند نامور عظام رائٹرز کے مقالات کی کچھ جھلکیاں پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے عربی مقالات میں مختلف انسانی۔ اسلامی، قومی، سیاسی، سماجی، فلسفی، دینی اور ثقافتی رجحانات آشکارا ہو جائیں۔

۱ عربی مقالہ میں انسانی رجحان کی جھلکی

۲۔ عربی مقالہ میں اسلامی رجحان کی جھلکی

۳۔ عربی مقالہ میں قومی رجحان کی جھلکی

۴۔ عربی مقالہ میں سیاسی رجحان کی جھلکی

۵۔ عربی مقالہ میں سماجی رجحان کی جھلکی

۶۔ عربی مقالہ میں فلسفی رجحان کی جھلکی

۷۔ عربی مقالہ میں دینی رجحان کی جھلکی

۸۔ عربی مقالہ میں ثقافتی رجحان کی جھلکی

اگر اجازت ہو تو عربی مقالہ میں مذکورہ رجحانات کی جھلکیاں آئندہ پیش کی جائیں گی۔

خواجہ محمد امین کشمیری اور توسل ولی اللہ

از مسعود انور علوی۔ ایم۔ اے (علیگ)

اہل علم حضرات کے لیے آپ کا اسم گرامی غیر معروف نہیں لیکن حضرت حکیم الامت آقائے نعمت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ کے دیگر خلفاء مجاز کی طرح آپ کے حالات وواقعات اور افادات بھی اب تک حجابات میں مستور رہے ہیں۔ اس مضمون میں آپ کے تمام حالات وواقعات پر روشنی ڈالنا مقصود نہیں بلکہ ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنا ہے کیونکہ صرف آپ کے افادات ومکاشفات ہی ایک طویل مضمون کے متقاضی ہیں۔

حضرت خواجہ صاحبؒ کا حال بشرط توفیق الٰہی انشاء اللہ آئندہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا یہاں صرف مختصر تعارف پیش ہے۔

آپؒ کشمیر کے تجارت پیشہ باشندے تھے۔ قسّام ازل نے طبیعت میں زہد واتقا کا مادہ شروع ہی سے ودیعت فرما دیا تھا۔ جہاں کہیں کسی صاحب دل کے بارے میں سُن پاتے اس کے پاس جاتے، صحبت اختیار کرتے مگر کسی طرح جمعیت قلبی وکشود کار نہ ہوتا بالآخر توفیق الٰہی کے قائد نے خواجہ محمد ناصر نقشبندیؒ کی رہبری میں مرشد برحق کے حضور میں کشاں کشاں پہنچا دیا۔ مرشد برحق کی نگاہ حق بیں نے اپنا کام کیا چنانچہ تمام مال واسباب تجارت لٹا کر ہمہ تن اپنے کو آپؒ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ آپ سے ظاہری وباطنی فیوض اخذ کیے اور آپ کے بعض اہم مسودات مثل مسوّیٰ شرح موطا، قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین، رسالہ فوز الکبیر فی اصول التفسیر، فتح الخبیر، رسالہ الانصاف فی سبیل الاختلاف

وعقد المجید وغیرہ اپنی سعی بلیغ سے مرتب فرمائے۔

خداداد عقل وفراست کی بنا پر اپنے ہمعصروں میں ممتاز رہے۔ مرشد کامل کی نگاہ حق بیں میں اپنے حق شناس مرید کا کیا مقام تھا۔ صاحب القول الجلی کی زبان سے سنیے۔

در بعضے اوقات خازن نور مبین خواجہ محمد امین از زبان حضرت اقدس بہ این شرف خطاب یافتند کہ شمارا بے شبہ جوارح خود می دانم[1]

حضرت اقدس نے اکثر اوقات خازنِ نورِ مبین خواجہ محمد امین سے زبانِ مبارک سے فرمایا، بلا شبہ میں تم کو اپنے اعضائے بدن کی طرح سمجھتا ہوں۔

صرف یہی نہیں بلکہ ایک دوسری جگہ حضرت مرشد برحق خطاب فرماتے ہیں کہ:

حالا تو محتاجِ دعاءِ جداگانہ نیستی کہ محبت تو مرکوزِ باطن است۔ انچہ از حق سبحانہ برائے خود خواستہ می آید برائے تو مثل آں مسائلت می رود[2]

اب تم جداگانہ دعا کے محتاج نہیں رہے ہو تمہاری محبت باطن (قلب) میں مرکوز (جم) ہو چکی ہے جس چیز کے لیے اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے دعا کی جاتی ہے اس میں تم بھی شامل وشریک رہتے ہو۔

شعر گوئی اور انشاء پردازی میں دست رسا رکھتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے جہاں کہیں اپنے کلام میں اپنا تخلص امینؔ لکھا ہے اس سے مخاطب صرف آپ ہی کی ذات ہے۔

ایک کتاب اپنے مرشد برحق کے حقائق ومعارف میں نہایت عمدہ طریقہ پر مرتب کی۔

مرشد کامل کے مراتب عالیہ کے بارے میں ایک مبشرہ میں آپ کو معلوم ہوا کہ "حضرت اقدس کا مقام 'مقام مجددیہ' سے بھی فوق ہے"[3]

---

[1] القول الجلی واسرار الخفی للشیخ محمد عاشق پھلتی قدس سرہٗ ص: ۱۱۲۔ "کتب خانہ انوریہ" خانقاہ کاظمیہ۔ کاکوری ضلع لکھنؤ۔

[2] ص: ۴۶۴۔　(۳) ص: ۲۵۵۔

ایک جزء ولطیف مثنوی کا بھی تحریر کیا جس میں کمال رقّت و شیرینی ہے۔ اس مناجات میں مرشدِ برحق کے فضائل و مناقب کو حُسنِ ادا سے شامل کر کے وسیلہ بنایا ہے خواجہ صاحب موصوف کی یہ مناجات جس کا عنوان ۲ عتصام الامین بحبل اللہ بتوسل ولی اللہؒ ہے ان کی شخصیت کی مکمل آئینہ دار ہے۔ اس سے اُن کی نسبتِ حُبّی کا پتہ چلتا ہے۔ ترجمہ کر کے ہدیۂ قارئین کر رہا ہوں ؎

خداوندا آہ جان غم ناک	بچشم خوں فشان و سینۂ چاک
بنام آں کہ جاں خاکِ رہِ اوست	قلم شیدائے روئے چوں مہِ اوست
باں مہرِ سپہرِ رہنمائی	باں اعجوبۂ صُنعِ الٰہی
باں دریائے علمِ بے کرانہ	باں قطبِ جہاں فردِ زمانہ
باں غواصِ بحرِ بے نشانی	باں سیاحِ اقلیمِ معانی
باں مشکل کشائے مستمنداں	چراغ افروز بزم نقشبنداں
حکیم نکتہ دانِ سرِّ اشیاء	مرادِ حکمتِ تعلیمِ اسماء
باں جانِ جہانِ زندگانی	باں روحِ روانِ شادمانی
باں دُرِّ ثمینِ کانِ وحدت	باں نورِ مبینِ جانِ کثرت
باں خورشید برجِ فضل و ارشاد	باں نجمِ ہدایت قطبِ اوتاد
باں عینِ ظہورِ نورِ ہستی	باں مرآتِ وجہِ حق پرستی
باں دانا رموزِ پردۂ غیب	باں کشافِ حُسنِ ذاتِ لاریب
باں عکسِ جمالِ ذاتِ مطلق	چہ عکسے گشتہ اندر ذاتِ ملحق
ابوالفیاض[1] نامِ قدسیانش	بنازم من ازیں تعظیمِ شانش

[1] حضرت شیخ بزرگ شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ سے آپ نے ملاءِ اعلیٰ میں ان کے لقب کی بابت استفسار کیا جس پر انھوں نے جواب دیا کہ میرا لقب ابوالفیض اور تمہارا ابوالفیاض ہے۔[2] [الخ]

ذکیے[1] امتی گفتش پیمبر ؐ رسول مجتبیٰ ؐ آں بدرِ انور
قدم بنہادہ اندر ملک ابتہاج بنام احمد شیخ خوانند ارواح
امام و مقتدار و قبلہ گاہم ولی اللہ شاہِ دیں پناہم
تنم را خاکِ راہِ ایں حرم کن سرم زیں خاکساری محترم کن
مرا مہجور منگن از درِ او کہ تا چوں حلقہ باشم بر درِ او

ترجمہ: اے خدائے بے نیاز غم زدہ جان کی آہ، خون برساتی ہوئی آنکھ اور چاک سینہ کے ساتھ اس نام کو وسیلہ بناتے ہوئے عرض پرداز ہوں جس کی خاکِ راہ میری یہ جان حزیں ہے اور اس کے روئے انور کا عاشق میرا یہ قلم ہے، اس کو اپنا وسیلہ بناتے ہوئے ملتجی ہوں جو آسمانِ رہنمائی کا آفتاب اور تیری مخلوق میں تیری صناعی کا حیرت انگیز نمونہ ہے، علم کا ایک بحرِ ناپیدا کنار، یگانۂ آفاق و نادرِ روزگار اور اپنے زمانہ کا قطب ہے، بے نشان بحر مواج کا غوطہ زن اور ملک حقیقت کا سیاح ہے، حاجت مندوں کا حاجت روا اور نقشبندیوں کی محفلِ قدس کا روشن چراغ ہے، اشیا کی حقیقت و ماہیت پرکھنے والا اور تعلیم اسرار کی حکمت کا اصل مقصد ہے، اپنی زندگی کی جانِ جہان کو وسیلہ بناتے ہوئے تیری بارگاہ میں سرِ نیاز خم کرتا ہوں جو مسرت و شادمانی کی روح و جان، وحدت کی کان کا بیش قیمت گوہر آبدار، جان کثرت کا نورِ مبیں، فضل و ارشاد کے برج کا آفتاب، اوتاد کا قطب، اور ہدایت کا ستارۂ نورِ ہستی کا عین ظہور، درجِ حق پرستی کا آئینہ، حجاباتِ غیب کے رموز کا دانا، ذاتِ لاریب کے حسن کو بے نقاب کرنے والا، ذاتِ مطلق کے جمال کا عکس اور عکس بھی کیسا جو اس کی ذات میں ملحق ہو چکا ہے اس کا نام پاک ابو الفیاض ہے اور میں اس کی اس عظیم الشانی پر نازاں ہوں وہ جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمایا ہے کہ "میری امت کا

---

[1] فیوض الحرمین میں اس کی بابت آپ کا مشاہدہ درج ہے۔ ۱۲ منہ۔

سب سے ذکی شخص" اس نے ملک افساح میں قدم رکھا جس کی ارواح نے احمد کے نام سے ندا کی، وہ میرا امام و مقتدا، میرا قبلہ گاہ اور میرا ملجا و ماوٰی ہے، اس کا نام نامی ولی اللہ ہے۔

پھر آخر میں شدتِ جذبات میں کہتے ہیں کہ اے اللہ میرے اس جسم خاکی کو اسی آستانہ کا پیوند کر دے، میرے سرِ نیاز کو اس خاکساری کی بدولت سرفرازی عطا فرما اور مجھ حلقہ بگوش غلام کو اس کے درِ دولت سے جدا نہ فرما۔

تبصرے

زمخشری کی تفسیر الکشاف ایک تحلیلی جائزہ از پروفیسر فضل الرحمٰن سابق صدر شعبہ سنی دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ضخامت ۵۱۵ صفحات، کتابت وطباعت بہتر، قیمت -/55 روپے، شائع کردہ دینیات فیکلٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

علامہ جار اللہ زمخشری کی تفسیر الکشاف نہایت مقبول و مروج تفسیر ہے، اس کی بلند پائیگی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا مصنف معتزلی ہے اور اس لئے اس نے یہ تفسیر رزمیہ اعتزال کے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے لیکن اس کے باوجود اہل سنت والجماعت میں بھی اس کا درس دیا جاتا ہے، اس مقبولیت کی وجہ سے اس تفسیر پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے باوجود ضرورت تھی کہ اس کتاب کا تجزیاتی اور تحلیلی مطالعہ کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ یہ کتاب تفسیر کے نوع در نوع تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتی ہے اور نیز یہ کہ اس کی علمی اور ادبی خصوصیات وہ کیا ہیں جن کے باعث تفاسیر کے وسیع ذخیرہ میں اسے امتیاز خاص حاصل ہے، خوشی کی بات ہے کہ لائق مصنف نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے ماتحت جب یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے اسی کو موضوع بنایا اور برسوں کی محنت و کاوش کے بعد زیر تبصرہ مقالہ لکھ کر ڈگری

حاصل کی، حقیقت یہ ہے کہ اس مقالہ کو بوجوہ ان اعلیٰ اور بلند پایہ مقالات میں بے تکلف شمار کیا جاسکتا ہے جو اب تک کسی بھی ملکی یا غیر ملکی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے لکھے گئے ہیں،

یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے، اختتامیہ، فہرست مضامین اور فہرست ماٰخذ مراجع ان کے علاوہ ہے، مقدمہ میں جو چھیانوے (۹۶) صفحات پر پھیلا ہوا ہے پہلے اس پر بحث کی گئی ہے کہ تفسیر، تاویل اور معنی ان تینوں میں مفہوم کے اعتبار سے کیا فرق ہے، پھر عہد نبوت سے لیکر تفسیر کے ایک مستقل فن بننے تک تفسیر کا ایک مختصر جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد ان تفسیری رجحانات پر گفتگو ہے جو شروع سے زمخشری کے زمانہ تک برروئے کار رہے ہیں، باب اول میں تحریک اعتزال کا نشو نما، اس کا عروج وزوال اور چوتھی صدی ہجری میں تشیعیت سے اس کی مصالحت اور مملکت اسلامیہ کے مشرقی علاقوں میں اس کی اشاعت پر اور سیر حاصل کی گئی ہے اور اس کے بعد زمخشری کے خاندانی اور ذاتی حالات وسوانح اور اس کے علمی اور ادبی کارناموں کا تذکرہ اور زمخشری کی ایک ایک مطبوعہ ہو یا مخطوطہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ہے "کشاف اور اعتزال" اس باب میں فاضل مصنف نے زمخشری کے ان تفسیری بیانات وتشریحات کا جائزہ لیا ہے جو انھوں نے معتزلہ کے اصول خمسہ یعنی توحید، عدل، الوعد والوعید، المنزلۃ بین المنزلتین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے پیش نظر آیات متعلقہ کے بارے میں تحریر کئے ہیں۔ یہ بحث نہایت مفصل اور بصیرت افروز ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جو آیات اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے معتزلی مسلک

کے خلاف نہیں زمخشری نے اپنے فن معانی و بلاغت کے زور سے ان کو معتزلی مسلک کے موافق بنانے کی کوشش کی ہے اس ذیل میں ایک دلچسپ بحث یہ آگئی ہے کہ زمخشری کی معتزلی تفسیر کی تکنیک کیا ہے ؟ مصنف نے ثابت کیا ہے، یہ کہنا غلط ہے کہ معتزلی تفسیر بالماثور کے قائل نہیں ہیں اور وہ صرف عقلی توجیہات و تاویلات سے سروکار رکھتے ہیں۔ زمخشری فن بلاغت و معانی اور لغت وادب کے امام ہیں اس لئے انہوں نے بڑی قوت اور زور شور سے اعجاز قرآن کا اثبات انہیں علوم و فنون کی روشنی میں کیا ہے۔ یہ تمام بحث و گفتگو جو بڑی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے کتاب کے باب سوئم کا موضوع ہے۔ باب چہارم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ زمخشری تفسیر بالماثور کے بھی قائل ہیں اور ساتھ ہی عقلی توجیہات سے بھی کام لیتے ہیں تو یہ دونوں چیزیں کس طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور اس سلسلہ میں زمخشری کی تفسیری تکنیک کیا ہے، ان چار ابواب کے بعد اختتامیہ ہے، اس میں کشاف کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں مصنف لکھتے ہیں :

کشاف سے پہلے تفسیر کی کتابوں میں یہ پابندی نہ تھی کہ پیش کردہ معانی و مطالب پر ہو سکنے والے اعتراضات کی تقریر کر کے انہیں رفع کیا جائے۔ یہ زمخشری کی جدت پسند طبیعت کی پیداوار ہے کہ وہ آیات قرآنی کا مفہوم پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس تفسیر پر جو بھی اعتراضات کسی نقطۂ نظر سے ہو سکتے ہیں، خواہ وہ نقلی ہوں یا عقلی، لغوی ہوں یا نحوی، بلاغی ہوں یا کلامی، زمخشری فان قلت کے الفاظ کے ساتھ ان کی ایک جامع مگر مختصر تقریر کرتے ہیں اور اس کے بعد قُلتُ کہہ کر ان تمام اشکالات کا حل پیش کر کے قاری کے ذہن کو ہر طرح مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اختتامیہ میں کشاف کی اس انفرادی صفت کا تنقیدی جائزہ دیدہ وری سے لیا گیا ہے، اس کے بعد کشاف کے بارے میں اکابر علم

کی آرا کیا ہیں؟ اور کشاف پر کس نے کیا کام کیا ہے؟ ان دونوں کا مفصل اور جامع خاکہ پیش کر دیا گیا ہے۔ کتاب یہاں ختم ہو جاتی ہے، لیکن یہ کس محنت اور تحقیق سے مرتب ہوئی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آخر میں ماخذ و مراجع کی فہرست عربی، انگریزی اور اردو کی مطبوعہ اور مخطوطہ ۴۰۸ کتابوں پر مشتمل ہے غرض کہ کتاب بحیثیت ایک تصنیف کے بہمہ وجوہ کامیاب ہے اور فاضل مصنف اس کاوش اور محنت کے لئے اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

البتہ تین باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔

۱۔ معلوم نہیں پیش لفظ کے صفحہ ۳ پر مصنف نے یہ کیسے لکھ دیا کہ اب سے کوئی چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ گولڈ سیہر نے تاریخ تفسیر پر اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ..... حالانکہ گولڈ سیہر اب سے دو سو برس پہلے کا مشہور مستشرق ہے۔

۲۔ باب دوم و سوئم میں صفات باری و افعال باری سے متعلق آیات کی تفسیر میں جو کچھ زمخشری نے لکھا ہے ان سب کے متعلق یہ کہنا کہ یہ معتزلی نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں درست نہیں۔ کیونکہ آیات متشابہات اور صفات و افعال باری کی آیات کی تاویل و توجیہ علمائے اہل سنت والجماعت نے بھی تقریباً وہی لکھا ہے جو زمخشری نے لکھا ہے اور جس میں بڑا حصہ استعارہ یا لکنایہ کا ہے،

۳۔ مصنف بڑی کثرت سے کشاف کی اصل عربی عبارتیں بغیر ترجمہ کے نقل کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قاری کے ذہن میں بار بار الجھنیں پیدا ہوتی ہے اور غیر عربی داں تو اس سے استفادہ کر ہی نہیں سکتا۔ اس لئے مناسب یہ تھا کہ آج کل کے عام قاعدہ کے مطابق کشاف کی اصل عربی عبارتوں کے بجائے مصنف ان کو اپنی زبان اردو میں لکھتے ہیں اور نیچے حواشی میں ان کا حوالہ نقل کر دیتے۔

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس، روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب و [illegible]

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ - ۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، عرب دنیا
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ ردّہ، سرکشی ضلع بجنور، علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم، رموز عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب، اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

I. No. D. (DN) 231 PHONE : 262815 JULY 1984
o. 965—57 Subs. 40- Per Copy Rs. 3-50
BURHAN (Monthly)
4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے شائع کیا۔

ٹائیٹل جلال پریس جامع مسجد دہلی ۶

اگست ۱۹۸۴ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

قیمت سالانہ: چالیس روپے

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامان اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ سرایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ"۔ تدوین قرآن۔ اسلام کا نظام مساجد۔
اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

سالانہ چندہ چالیس روپے	# برہان	قیمت فی پرچہ تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۴	ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۹۸۴ء	شمارہ ۱۶/۵

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

پچھلے دنوں مہاراشٹر کے ہندو مسلم فسادات، دربار صاحب امرتسر میں فوج کا داخلہ اور وہاں حرب و ضرب اور پھر کشمیر میں فاروق عبداللہ گورنمنٹ کی برطرفی، تین ایسے نہایت سنگین اور افسوسناک واقعات ہیں جو حکومت ہند کی پیشانی کا بدنما داغ ہیں اور اس لیے ان کی مذمت جس قدر بھی کی جائے کم ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی مذہبی عبادت گاہ کو کسی سیاسی مقصد کے لیے جائے پناہ بنانا، اسلحہ کا ذخیرہ اس میں جمع کرنا اور جب نوبت جنگ کی آجائے تو عبادت گاہ کو بطور ایک قلعہ کے استعمال کر کے اسے محاذ جنگ کی شکل میں تبدیل کر دینا، یہ سب اعمال و افعال وہ ہیں جن سے مذہب کے تقدس اور اس کی پاکیزگی پر حرف آتا ہے اور عبادت گاہ کی توہین ہوتی ہے، اس لیے یہ اعمال و افعال سخت قابل مذمت ہیں اور اس بارہ میں دو رائیں ہرگز نہیں ہو سکتیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ دہشت پسند ایک دو نہیں، ہزاروں کی تعداد میں اسلحے سے لیس، پورے پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے اور نہایت مہلک اور اعلیٰ قسم کے اسلحہ ہزاروں کی تعداد میں اسمگل ہو کر ایک عرصہ سے آتے رہے اور دربار صاحب میں خصوصاً اور دوسرے مقامات پر عموماً ان کے انبار لگتے رہے اور یہ سارا کھیل چند دنوں اور چند ہفتوں کا تو ہو ہی نہیں سکتا، ایک عرصہ سے یہ سب کچھ ہو رہا اور حکومت کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوئی، حکومت کے پاس ان خفیہ سرگرمیوں سے اور اس

عظیم اور وسیع پیمانہ پر، باخبر رہنے کے لیے کیا کچھ نہیں ہے؟ اس کا محکمۂ خفیہ خبر رسانی بڑا مضبوط ہے، اس کے پاس پولیس ہے، پنجاب میں باقاعدہ آئینی حکومت قائم ہے اور وہاں گورنر بھی موجود ہے اس بنا پر ان تمام چیزوں کے باوجود یہ سب کچھ ہوا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حکومت کے اعلیٰ افسران بھی اس سازش میں شریک تھے، اب حکومت کو اس کی اطلاع تھی مگر اس نے چشم پوشی کی یا سرے سے اسے اس کی خبر ہی نہیں ہوئی، دونوں صورتوں میں حکومت خود بھی مجرم قرار پاتی ہے اور اس جرم کی قباحت بیرونی ملکوں کی سازش کا چرچا کرنے سے ہرگز کم نہیں ہو سکتی۔ قانون کی نگاہ میں اگر جرم کا مرتکب مجرم اور اس لیے سزا کا مستحق ہے تو جو شخص مجرم کے لیے ارتکاب جرم کے مواقع فراہم کرتا ہے وہ جرم سے بری الذمّہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر اتنا بڑا اسکنڈل یورپ کے ایک ملک میں ہوا ہوتا تو گورنمنٹ کو فوراً مستعفی ہونا پڑتا۔

اس مرتبہ عروس البلاد بمبئی اور بھیونڈی میں فرقہ وارانہ فسادات اس شدومد اور زور کے ہوئے کہ خدا کی پناہ، لوگ مرادآباد اور میرٹھ کی ہلاکت خیزیوں کو بھول گئے، ہزاروں جانیں تلف ہوئیں، بے شمار بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو گئیں، کروڑوں روپے کا نقصان ہوا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ صرف اس لیے کہ شیو سینا جو ایک مرہٹہ فاشسٹ جماعت ہے اس کے سربراہ نے ایک مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہایت گستاخانہ اور توہین انگیز الفاظ کہہ دیے تھے، مسلمانوں نے اس پر غم وغصہ کا اظہار اور اس کے خلاف احتجاج کیا، بس پھر کیا تھا! ان کی جانوں پر بن گئی، اور قتل وغارتگری کا بازار گرم ہو گیا۔ اگر حکومت میں بیدار مغزی اور دستور و قانون کا ذرا لحاظ ہوتا تو وہ اس صورت حال کا فوراً انسداد اسی طرح کر سکتی تھی کہ شیو سینا کے سربراہ کو گرفتار کر لیتی اور اس پر مقدمہ چلاتی یا کم از کم اس کو اس پر مجبور کرتی کہ وہ مسلمانوں سے معافی مانگے، لیکن حکومت نے نہ یہ کیا اور نہ وہ اور سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ حکومت نے اب تک اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے۔

یاد ہوگا جن دنوں میں ملک میں ایمرجنسی لگی ہوئی تھی وہ سماجی جرائم جو آج عام ہیں ان کا بہت بڑی حد تک انسداد ہو گیا تھا۔ ہر شخص اپنا فرض منصبی ادا کرنے لگا تھا، اور ایک دو معمولی جھڑپوں کے علاوہ اس مدت میں کوئی بڑا اور قابل ذکر فرقہ وارانہ فساد بھی نہیں ہوا، یہ سب کچھ آخر کیوں تھا؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس دور میں حکومت اپنے اختیارات کا استعمال کرنے میں آزاد اور خود مختار تھی اور لا اینڈ آرڈر کو مکمل بالا دستی حاصل تھی، اس سے یہ ثابت ہوا کہ حکومت اگر مضبوط ہے اور وہ دائیں بائیں دیکھے اور کسی کی رو رعایت کے بغیر قانون کا نفاذ کرے تو ان تمام خرابیوں کا قلع قمع ہو سکتا ہے جن سے آج ہمارا معاشرہ دوچار ہے، قومی یک جہتی کونسل نے فرقہ وارانہ فساد کے انسداد کے لیے جو سفارشات کی ہیں حکومت ان کو تسلیم کر چکی ہے، لیکن افسوس کہ ان پر عمل آج تک کہیں نہیں ہوا۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر کہیں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری اور مسئولیت براہ راست حکومت کے سر عاید ہوتی ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فاروق عبداللہ کی گورنمنٹ پاپولر (Popular) گورنمنٹ تھی اور اسے ۸۰ فی صد عوام کی حمایت حاصل تھی، اب اگر پارٹی کے بارہ ممبر پارٹی سے باغی ہو کر فاروق عبداللہ کی صف مخالف میں جا بیٹھے تھے اور ان کی وجہ سے فاروق عبداللہ کے حامی اقلیت میں رہ گئے تھے تو ریاست کی خیر خواہی اور عدل و انصاف کا تقاضا تھا کہ اس سلسلہ میں کسی قسم کا اقدام کرنے سے پہلے امور ذیل پر غور کر لیا جاتا۔

(۱) یہ بارہ حضرات کس قسم کی شخصیت اور کردار کے حامل ہیں۔

(۲) ان حضرات نے کسی طمع اور لالچ سے تو ادلی بدلی نہیں کی

(۳) اگر الکشن ہو تو کیا یہ حضرات اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔؟

اور ان تینوں سوالات کا جواب معلوم کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ریاست میں الکشن

از سر نو کرایا جاتا اور اگر یہ نہیں تو کم از کم اسمبلی کا اجلاس تو طلب کرنا چاہیے ہی تھا۔ کیونکہ ایک مرتبہ گورنمنٹ کی تشکیل کے بعد اقلیت اور اکثریت کا فیصلہ محض کاغذ پہ دستخطوں سے نہیں بلکہ پارلیمنٹ یا اسمبلی کے فرش پر ہوتا ہے لیکن گورنر نے نہ یہ کیا اور نہ وہ، اور ریاست کی ایک ہر دلعزیز اور عوامی گورنمنٹ کو بیک جنبش قلم برطرف کر کے دوسری گورنمنٹ قائم کر دی، اس حکومت کے قیام کا اعلان ہوتے ہی جمہوریت کا دم گھٹ گیا، انصاف نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اور دنیا نے نہایت حیرت اور تعجب سے دیکھا۔ (۱) عوام نے اس نئی حکومت کا استقبال جشن چراغاں کے بجائے ہڑتالوں۔ سخت مخالفانہ مظاہروں اور دن اور رات کے کرفیو سے کیا اور (۲) ساتھ ہی یہ بھی دیکھا کہ وہ یاران دوازدہ جنھوں نے فاروق کا تختہ الٹ دیا تھا سب کے سب وزارت کی کرسیوں پر براجمان ہو گئے ہائے ع۔ زشت روی سے تیری آئینہ ہے رسوا تیرا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسز اندرا گاندھی نے یہ سب کچھ آئندہ الکشن کے پیش نظر ہندو اکثریت کا ووٹ حاصل کرنے کی غرض سے کیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ایسا خیال کرنا نہ اندرا جی کے ساتھ انصاف ہے اور نہ ہندو اکثریت کے ساتھ، کیونکہ اگر ہندو اکثریت اس ذہنیت کی ہوتی تو ملک میں ہندو مہا سبھا کا راج کبھی کا قائم ہو گیا ہوتا، اسی طرح مسز گاندھی کی گھٹی میں سیکولرزم پڑا ہوا ہے، وہ اسی فضا میں پیدا ہوئیں اور پلی اور بڑھی ہیں اس لیے ان کی ذات پہ فرقہ پرستی کا الزام عاید نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مسز گاندھی کی حکومت کے دو دور ہیں، ایک ایمرجنسی سے پہلے کا اور دوسرا ایمرجنسی سے بعد کا، پہلا دور نہایت شاندار اور کامیاب تھا، اس دور میں کتنے اہم قومی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات پیش آئے اور مسز گاندھی خوش اسلوبی سے ان کو حل کرنے میں کامیاب رہیں، لیکن اس کے بالمقابل دوسرے یعنی موجودہ دور حکومت کو شاندار اور کامیاب نہیں کہا جا سکتا، اس دور میں جو اہم معاملات و مسائل پیش آئے ان میں کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوا۔ بلکہ جتنی جتنی کوششیں

اس کے حل کی کی گئیں اسی قدر وہ الجھتا گیا، ان دونوں دوروں میں اس عظیم فرق کی وجہ یہ ہے کہ دور اول میں گورنمنٹ اور پارٹی میں اندرا جی کو ان حضرات کی رفاقت حاصل تھی جو تجربہ کار سیاست داں اور پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے صحبت یافتہ تھے، وہ اس ملک کی تہذیب اور اس کی روایات اور علاقائی خصوصیات کا ذاتی طور پر عملی تجربہ رکھتے تھے، اس کے برعکس دور ثانی میں اندرا جی کے جو ساتھی، رفیق اور مشیران کار ہیں، اگرچہ ان کی دفتری لیاقت وقابلیت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میدان سیاست میں ان کی حیثیت نو واردکی ہے، اور اس ملک کی روایات وعلاقائی امتیازات وخصوصیات کا ان کو بلا واسطہ ذاتی علم اور تجربہ نہیں ہے، اس کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ریاستوں پر مرکز کی گرفت ڈھیلی اور کمزور ہوگئی ہے۔

مصر سے الاستاذ الدکتور خالد الحدیدی، امین عام الجمعیۃ العالمیۃ لاحیار التراث الاسلامی، طنطا، مصر نے اطلاع دی ہے کہ الجمعیۃ العالمیۃ لاحیار التراث الاسلامی بمصر کی مجلس نے ہمارے فاضل دوست اور عربی زبان وادب کے مشہور محقق پروفیسر مختار الدین احمد، صدر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو "اسلامی ذخائر اور تراث عربی کو عالمانہ انداز میں پیش کرنے، اسلام کی ثقافت وتہذیب کی نشر واشاعت اور انھیں اقطاع عالم میں پھیلانے کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر" اتفاق رائے سے جمعیۃ کا رکن منتخب کیا ہے۔ یہ مصر کا مشہور بین الاقوامی علمی ادارہ ہے جس کا مقصد تراث اسلامی کا احیار، اور مسلم عرب مصنفین کی تصانیف کی حفاظت اور اہم نادر مخطوطات کی اشاعت ہے، اس کے ارکان میں عرب اور اسلامی ممالک کے علاوہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ کے مستند اور مشہور محقق اور اہل قلم شامل ہیں۔ اسلامی علوم وفنون کی احیار کے لیے اس بین الاقوامی ادارے کی سرگرمیاں مصر اور دوسرے عرب ممالک ہی نہیں بلکہ افریقہ اور ایشیا تک پھیلی ہوئی ہیں۔

برہان پروفیسر صاحب موصوف کو اس اعزاز پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

سعید احمد اکبر آبادی

(۱)

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی سے میری پہلی ملاقات تو اس وقت ہوئی جب میں طالب علمی کی غرض سے دیوبند حاضر ہوا۔ لیکن مفتی صاحب کے خاندان سے میرے خاندان کے تعلقات اور روابط میری پیدائش (۱۹۰۸ء سے بھی پہلے سے تھے) اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحی صاحب اور ان کے پھوپھا حافظ سید عنایت حسین صاحب یہ دونوں سرکاری ملازمت میں ہونے کے ناطے آگرہ میں، مع متعلقین کے رہتے تھے اور والد صاحب قبلہ کے ان دونوں بزرگوں سے بڑے گہرے مراسم تھے، ان کے اہل خانہ ہمارے گھر آتے اور میری والدہ ماجدہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو لے کر ان کے گھر جاتیں اور بعض مرتبہ دو دو تین تین دن قیام رہتا۔ اور ہاں یاد آیا، مفتی صاحب کے ایک اور پھوپھا ڈپٹی محمد اشفاق تھے، وہ بھی آگرہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ نہر تھے، والد صاحب کا ان سے بھی گہرا ربط و تعلق تھا، کم از کم ہفتہ میں ایک دن ملاقات ضرور ہوتی تھی جب والد صاحب اور یہ حضرات جمعہ کی نماز پابندی سے جامع مسجد میں پڑھتے اور اس سے فراغت کے بعد امام صاحب کے کمرہ میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھ کر لطف صحبت و ملاقات اٹھاتے۔

ان رشتہ داریوں کی وجہ سے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا

گاہے گاہے آگرہ آنا جانا رہتا اور مفتی صاحب بھی ان کے ہمراہ ہوتے، حضرت مفتی صاحب جب کبھی آگرہ آتے ہمارے گھر بھی تشریف لاتے اور والد صاحب قبلہ آپ کی بڑی شاندار دعوت کا اہتمام کرتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے ایک مرتبہ مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی کی بڑی بہن عطیہ بھی ہمارے گھر آئی تھیں اور میں ان کے اور چند اور خواتین کے ساتھ تاج محل دیکھنے گیا تھا، ایک مرتبہ مفتی صاحب سے آگرہ کا ذکر آیا تو بولے: اباجی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) (کا کشف قبور کا علم بہت بڑھا ہوا تھا) قیام آگرہ کے دنوں میں ایک روز بادشاہ اکبر کے مقبرہ سکندرہ تشریف لے گئے، تو قبر پر پہنچتے ہی آپ کی حالت متغیر ہو گئی اور طبیعت پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہو گئی اور فرمایا: جلد چلو، عذاب الٰہی نازل ہو رہا ہے، اس کے برعکس تاج محل میں شاہجہاں اور ممتاز محل کی قبروں پر آپ آئے تو وہاں اطمینان سے فاتحہ پڑھی۔

مفتی صاحب نے ایک مرتبہ یہ واقعہ بھی سنایا: ایک مرتبہ اباجی میرے ماموں حافظ عبدالحی صاحب کے ساتھ مغرب کے بعد تشریف لے گئے، گھومتے پھرتے جمنا کی طرف جو فصیل ہے اس پر چادر بچھا کر بیٹھ گئے، اس وقت فضا بڑی دلکش اور سہانی تھی، موسم نہ گرم نہ سرد بڑا خوشگوار تھا، چاندنی چھٹکی ہوئی اور سبک وخنک ہوائیں موجزن ——— حافظ عبدالحی صاحب دراز قامت، گورے چٹے وجیہہ ومقبول صورت بزرگ تھے، سینہ چوڑا چکلا اور جسم ورزشی رکھتے تھے، عابد وزاہد اور نہایت متقی اور پرہیزگار اس درجہ کے تھے کہ کلکٹری میں سررشتہ دار کے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود کیا مجال تھی کہ ایک پیسہ بھی رشوت کا گھر میں آسکے، حافظ قرآن اعلیٰ درجہ کے تھے، قرآن سے ان کو عشق تھا، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے تلاوت کرتے رہتے تھے، فن تجوید سے واقف تھے یا نہیں! اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ ان کی آواز میں اس درجہ درد اور لب ولہجہ میں اس غضب کا سوز وگداز تھا کہ سامعین پر ایک وجد اور سرشاری کا عالم طاری ہو جاتا تھا ——— مفتی صاحب کا بیان ہے: تاج محل کی اس ولولہ انگیز فضا میں بیٹھ کر اباجی (حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ) نے حافظ عبدالحی صاحب سے

قرآن مجید سنانے کی فرمائش کی، وہاں تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا، باوضو تو وہ ہر وقت رہتے اور سبحہ گردانی کرتے رہتے ہی تھے، فوراً سورۂ واقعہ شروع کر دی، سورت کے مضامین اور ان کا وہ اسلوب اور آہنگ اور پھر حافظ صاحب کا وہ لحن داؤدی! اک سماں بندھ گیا۔ اباجی پر استغراق کا عالم دیر تک طاری رہا۔

حضرت مفتی صاحب کے علم کشف قبور کا ذکر ابھی آیا ہے، اس سلسلہ کا ایک واقعہ اور سن لیجیے، ایک دن مفتی صاحب نے ذکر کیا: ایک مرتبہ اباجی مجھے ساتھ لے کر مدراس تشریف لے گئے جہاں آپ کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا وسیع حلقہ تھا۔ اس سفر میں ہم سرنگاپٹم بھی گئے، یہاں اباجی جب سلطان ٹیپو شہید کے مزار پر پہنچے تو آپ بیٹھ گئے اور دیر تک مراقب ہو کر ایصال ثواب کرتے رہے جب فارغ ہو کر اٹھے تو چہرہ پر بشاشت ونشاط کا عجیب عالم تھا اور فرمایا: اس مزار میں جو شخص دفن ہے، اللہ کے ہاں اسے شہادت کا بڑا اونچا مقام ملا ہے، رحمت باری کا نزول مسلسل ہو رہا ہے۔

بہر حال یہ تھی نوعیت ان تعلقات کی جو مفتی صاحب کے اور میرے خاندانوں میں میری پیدائش سے بھی پہلے سے تھے۔

اب میرے ابتدائی حالات بھی سنیے تاکہ مجھ کو اکابر مشائخ وعلمائے دیوبند کے ساتھ اللہ کے فضل وکرم سے جو قرب واختصاص رہا ہے اس کا پس منظر آپ کے سامنے آسکے۔

اگرچہ میرا ددھیال بچھرایوں ضلع مرادآباد اور ننھیال سیوہارہ ضلع بجنور ہے لیکن والد ماجد ڈاکٹر محمد ابرار حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بسلسلۂ ملازمت سرکاری پہلے اترپردیش کے مختلف شہروں میں ادھر ادھر رہے، پھر آخر میں آگرہ پہنچے تو یہاں ایسا جمے کہ یہیں سے پنشن یاب ہوئے اور یہیں پر رہ پڑے، میری پیدائش آگرہ کی ہے اس لیے اکبرآبادی کہلاتا ہوں۔[1]

---

[1] میں پہلے نام کے ساتھ "اکبرآبادی" نہیں لکھتا تھا، یوں کبھی بھولے بسرے سے لکھ دیا ہو اس کا اعتبار نہیں، چنانچہ میری تمام اسانیف ابتدائی تصنیفات اور خود برہان کے ٹائیٹل پیج پر صرف (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیں)

والد صاحب آگرہ کے نامی گرامی ڈاکٹر تھے اس لیے سرکاری تنخواہ کے علاوہ پرائیوٹ پریکٹس کی آمدنی بھی بہت معقول رکھتے اور بڑی فراخی اور کشادہ دستی سے گذر بسر کرتے تھے اور میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے رسم ورواج زمانہ کے مطابق انھیں چاہیے تھا کہ مجھ کو انگریزی تعلیم دلاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور اس کی وجہ سے دوستوں میں مطعون ہوئے اور سارے آگرہ میں نکو بنے، مسٹر اختر عادل آگرہ کے مشہور ایڈوکیٹ تھے اور بعد میں پاکستان گورنمنٹ کے ایڈوکیٹ جنرل ہو گئے تھے، والد صاحب سے ایک مرتبہ انھوں نے خود میرے سامنے کہا: ڈاکٹر صاحب! آپ کو یہ کیا سوجھی کہ لڑکے کو ملّا بنا رہے ہیں، آپ اس کو انگریزی پڑھاتے ذہین بچہ ہے، بڑا اچھا بیرسٹر ہوتا، ڈاکٹر تصدق حسین آگرہ کے بڑے نامور ڈاکٹر تھے، ایک روز انھوں نے ارشاد فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ سعید کو انگریزی پڑھوا کر میڈیکل ایجوکیشن میں بھیجیے بڑا ہونہار لڑکا ہے، بہت کامیاب ڈاکٹر ہوتا، عربی پڑھ کر اسے کیا ملے گا! سید نیاز احمد صاحب

(بقیہ صفحہ گذشتہ) میرا نام درج ہے، لیکن ۱۹۴۷ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے گورنمنٹ مغربی بنگال کو میری کلکتہ مدرسہ کی پرنسپلی کے بارہ میں خط لکھا تو اس خط میں مولانا نے میرے نام کے ساتھ اکبرآبادی کا بھی اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ سے تمام سرکاری کاغذات میں اکبرآبادی میرے نام کا جزء لاینفک ہو گیا، اس سلسلہ میں یہ ایک واقعہ بھی لائق ذکر ہے کہ ۱۹۶۳ء میں جب میں کناڈا سے نیویارک (امریکہ) گیا اور وہاں سے ایک دن کے لیے پرنسٹن یونیورسٹی بھی آیا تو جب میں یونیورسٹی کی لائبریری میں گھوم پھر رہا تھا اچانک لائبریرین میرے پاس آئے اور میری کتاب "فہم قرآن" کا جو نسخہ ان کے ہاتھ میں تھا اس کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "جناب! کیا اس کتاب کے مصنف آپ ہی ہیں" جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے فوراً کتاب کی لوح پر میرے نام کے آگے اکبرآبادی کا لفظ بڑھا دیا تاکہ یہ Surname کی حیثیت سے مستعمل ہو۔

کوتوال شہر حضرت ریاض خیرآبادی کے برادر خورد اور خود بھی صاحب دیوان شاعر والد صاحب قبلہ کے جگری دوست تھے، ایک دن بولے: ابرار (والد صاحب کا نام) تمھارے پاس کس چیز کی ہے، سعید کو انگریزی کی تعلیم دلاکر مقابلہ کے امتحان میں بٹھاتے، بڑا اچھا ڈپٹی کلکٹر یا مجسٹریٹ ہوتا، یہ عربی تعلیم کس کام آئے گی" غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں اور فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" ایسے موقعوں پر والد صاحب کا عام جواب یہ ہوتا: اللہ کا حکم اور مشیت ہی یہ ہے، اس کی مشیت کے بغیر تو کوئی کام ہوتا نہیں ہے' لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ آخر والد صاحب نے ایسی تعلیم کا فیصلہ کیوں کیا جس کی اس زمانہ میں کوئی قدر و منزلت نہیں تھی اور جو مولانا شبلی کے لفظوں میں "آنچہ باہیچ نیرزد بجہاں" کا مصداق تھی!

ایک روز احباب خاص کی مجلس میں والد صاحب قبلہ نے فرمایا:

"سعید میاں کی پیدائش سے پہلے میرے ایک لڑکی تھی، قمرالنساء نام تھا۔ یہ بچی دس برس کی تھی کہ آگرہ میں طاعون پھیلا۔ خدا کی شان ہے اس مرض کے کتنے ہی بیمار میرے ہاتھوں اچھے ہوگئے تھے، لیکن خود میری اپنی بچی اس کا شکار ہوگئی، قمر کے بعد میرے ہاں کوئی اور بچہ پیدا نہیں ہوا تھا، اس لیے اب کیا توقع ہوسکتی تھی، میرا جی دنیا سے اچاٹ ہوگیا اور میں نے ہجرت کا پکّا ارادہ کرلیا، لیکن اجازت طلبی کے لیے جب میں نے اپنے پیر و مرشد حضرت قاضی عبدالغنی صاحب[1] منگلوری کو خط لکھا تو انھوں نے جواب میں ہجرت نہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی لکھا؛

---

[1] بچپن میں متعدد بار خاکسار کو حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت خوب مندرجت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ حضرت مولانا محمد اسماعیل منگلوری جو مشہور عالم اور بزرگ تھے ان کے فرزند ارجمند تھے، شروع میں لاابالیانہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن پدر بزرگوار کی وفات کے بعد اچانک آپ میں انقلاب پیدا ہوا، ایک کوٹھری میں بند ہوکر چالیس دن کا چلہ کھینچا جس میں جو کی دو ٹکیوں کے علاوہ کچھ اور نہ کھاتے تھے، مقررہ مدت کے بعد چلہ سے باہر آئے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

تم گھبراؤ نہیں اور مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ تم کو " فرزند سعید " عطا فرمائے گا۔
چنانچہ اس بشارت کے کئی برس بعد یہ بچہ پیدا ہوا ؛ اس کے علاوہ ایک واقعہ یہ ہوا کہ اس بچہ کی ولادت سے دو تین گھنٹے پہلے میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی تشریف لائے ہیں، میں نے انھیں دیکھا تو سروقد کھڑا ہو گیا، علیک سلیک کے بعد عرض کیا: حضرت تشریف رکھیے، ادھر سے ارشاد ہوا: " ڈاکٹر! فرزند سعید مبارک ہو، ہم بیٹھیں گے نہیں، اسی مبارک باد کی غرض سے آئے تھے " بس یہ فرمایا اور رخصت ہو گئے "۔

والد صاحب نے اس کے بعد فرمایا:

" پیر و مرشد کی بشارت اور پھر یہ خواب اور دونوں میں فرزند سعید کے الفاظ مشترک میں نے غور کیا تو میں سمجھا کہ یہ سب کچھ اشارہ غیبی ہے اس امر کی طرف کہ میں بچہ کا نام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تو اب عالم ہی دوسرا تھا، جذب اور استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ نگاہوں میں عجیب کشش تھی، ان کے کشف اور کرامتوں کا چرچا عام تھا۔ مریدوں کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ اس میں سرکاری افسروں اور امراء و رؤسا کی تھی، حضرت اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی بھی آپ کے جاں نثار مرید تھے، زندگی شاہانہ تھی، سات مشکی گھوڑے میں نے خود ان کے اصطبل میں گنے ہیں، بدعات کے سخت دشمن تھے، اتباع سنت پر ہمیشہ زور دیتے تھے، ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: تو میری دعاؤں سے پیدا ہوا ہے، اپنے باپ اور ماں کی طرح تو بھی میرا مرید ہو جا " میں بزرگوں کی مجلس میں گستاخ ہمیشہ کا ہوں، فوراً عرض کیا: حضرت مجھ پر تو ابھی نماز بھی فرض نہیں ہے۔ والد صاحب اس گستاخی پر مجھے سرزنش کرنا چاہتے تھے، لیکن حضرت قاضی صاحب نے روک دیا اور ہنس کر فرمایا: شاباش! ایسا ہی صاف گو ہونا چاہیے۔

⁂

سعید رکھوں اور دیوبند میں اسے عربی اور دینی تعلیم دلاؤں۔

جب والد صاحب قبلہ نے میری تعلیم کے بارہ میں یہ قطعی فیصلہ کرلیا تو اب انھوں نے اس کا اہتمام بھی اس درجہ کیا کہ کوئی اولاد کی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا، میری بسم اللہ کے لیے حضرت قاضی صاحب کو منگلور لکھا تو آپ نے اسی مقصد کے لیے اپنے ایک عزیز میاں محمد افضل کو بھیج دیا۔ یہ اگرچہ عالم نہیں تھے، لیکن نیم مجذوب تھے اور مشہور تھا کہ مادرزاد ولی اور مستجاب الدعوات ہیں، اس کے بعد ایک حافظ اور ایک مولوی صاحب کا تقرر کردیا گیا جن سے میں نے علی الترتیب قرآن مجید پڑھا اور اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

اب عربی کی تعلیم شروع کرنے کا وقت آیا تو والد صاحب نے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی کو دیوبند لکھا کہ مجھے اپنے بچہ کی عربی تعلیم کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت ہے، ازراہ کرم کسی اچھے عالم کا انتخاب کرکے بھیج دیجیے، تنخواہ معقول دوں گا، لیکن عالم کا متقی پرہیزگار ہونا ضروری ہے، کیونکہ بچہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی ان کے سپرد ہوگی۔" دیوبند کے شیوخ میں سے ایک صاحب مولوی خورشید علی نام کے تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور آج کل دارالافتاء میں کام کررہے تھے، عمر پچاس پچپن کے لگ بھگ ہوگی، گورے چٹے اور نورانی شکل وصورت کے انسان تھے، حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا عبدالکریم صاحب سے بیعت تھے اس لیے اوراد و وظائف کے بھی پابند تھے، حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے لیے ان کا انتخاب کیا اور انھیں آگرہ بھیج دیا۔[۱]

---

[۱] مولوی خورشید علی صاحب کے والد مولوی فرزند علی دیوبند کے وکیل یا مختار تھے، دارالعلوم دیوبند کا مکان جس میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رہتے تھے، دراصل انھیں مولوی فرزند علی کا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد جب مولوی خورشید علی اس کے مالک ہوئے تو باپ چونکہ قرض بہت کافی چھوڑ گئے تھے اس لیے مولوی خورشید علی صاحب نے یہ مکان دارالعلوم کے ہاتھ فروخت کردیا تھا۔

مولوی صاحب کی تنخواہ کیا تھی ؟ اس کا تو مجھے علم نہیں ہے، البتہ یہ معلوم ہے کہ موصوف ہمارے مکان (واقع لوہا منڈی) کے قریب ہی ایک مکان کرایہ پر لے کر مع متعلقین کے رہتے اور اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے تھے، ان کے متعلقین میں ایک عمر سے ڈھلی ہوئی خوبصورت بیوی، دو جوان لڑکیاں، رضیہ اور فاطمہ اور ایک جوان لڑکا حسن۔ اس طرح لے دے کے کل پانچ آدمیوں کا یہ کنبہ تھا، میں وَالَّذِینَ لَمۡ یَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ کا مصداق تھا، اس لیے پردہ گردہ کسی سے نہیں تھا، بے تکلف گھر میں آنا جانا تھا۔

والد صاحب قبلہ اس سے بے خبر نہیں ہو سکتے تھے کہ صرف فارسی اور عربی کی تعلیم کافی نہیں ہے، بلکہ بعض اور اہم مضامین کی تعلیم بھی ضروری ہے، چنانچہ انھوں نے میرے لیے ایک قابل ہندو گریجویٹ، مسٹر مکٹ بہاری لال ماسٹر کا بھی تقرر کیا اور اب پروگرام یہ ہو گیا کہ صبح چار گھنٹے مولوی خورشید علی صاحب مجھ کو عربی اور اس کے متعلقات کی تعلیم دیں گے اور شام کو دو گھنٹے ماسٹر صاحب انگریزی، حساب اور تاریخ و جغرافیہ پڑھائیں گے، مولوی صاحب کے سپرد یہ کام بھی تھا کہ وہ دونوں وقت کھانا میرے ساتھ کھائیں گے، مسجد میں اپنے ساتھ مجھ کو بھی لے جائیں گے اور صبح شام کی ہوا خوری میں بھی وہ میرے ساتھ ہوں گے۔

مولوی خورشید علی صاحب محبت اور توجہ سے پڑھاتے تو تھے ہی، بڑی بات یہ ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ان کو تصوف کا بڑا ذوق تھا، مثنوی مولانا روم کے عاشق تھے۔ اس لیے اکثر بزرگان اور اولیائے کرام کے قصے سناتے اور قرآن مجید کے احکام کی حکمتیں بیان کرتے رہتے تھے، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دین کی عظمت اور بزرگان دین کی محبت بچپن میں ہی دل میں بیٹھ گئی اور اتالیق رکھنے سے دراصل والد صاحب کا مقصد بھی یہی تھا، میری عربی کی تعلیم کافیہ تک ہوئی تھی کہ مولوی خورشید علی صاحب چلے گئے اور ان کی جگہ دیوبند سے ہی مولوی غلام نور صاحب آئے جو سرحدی اور نہایت قابل آدمی تھے، وہ ہمارے ہاں نو دس ماہ رہے ہوں گے لیکن اس مدت میں مشق و تمرین کے ذریعہ انھوں نے صرف و نحو کے قواعد دماغ میں

کالنقش فی الحجر کرادیے جس کا اثر میں اب تک محسوس کرتا ہوں اور چونکہ مشق و تمرین کے لیے مولوی صاحب سب مثالیں قرآن مجید سے لیتے تھے اس لیے ابتدا ہی سے قرآن مجید سے مناسبت اور کچھ شدید بیدا ہوگئی، علاوہ ازیں مجھ کو نحو ایسے خشک اور بے مزہ فن سے ایسی دلچسپی ہوگئی کہ بعد میں کتاب سیبویہ اور النحو الوافی کا مطالعہ میں نے خود اپنے شوق سے کیا۔

کم وبیش چار برس تعلیم کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ کافیہ، قدوری وغیرہ تک پڑھ چکا تھا اس کے بعد والد صاحب نے میری انگریزی تعلیم موقوف کردی کیونکہ اب دونوں قسم کی تعلیم ساتھ نہیں چل سکتی تھی اور مقصد اصل عربی تعلیم کی تکمیل تھا۔ علاوہ ازیں اب والد صاحب نے مجھ کو مدرسہ میں داخل کرنے کا ارادہ بھی کرلیا، چنانچہ مراد آباد کے مدرسہ امدادیہ میں داخل کردیا گیا۔ مراد آباد میں میرے اعزا و اقربا کافی تعداد میں تھے، لیکن والد صاحب نے کسی کے مکان پر میرے تنہا رہنے کو پسند نہیں فرمایا، ایک مکان کرایہ پر لیا اور دونوں کمروں کے ساتھ میری والدہ اور ہمشیرہ خورد کو بھی میری خاطر مراد آباد بھیج دیا، مدرسۂ امدادیہ مراد آباد کے صدر مدرس مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری تھے اور مدرس مولوی محمد اسحاق صاحب کانپوری اور مولوی محمد حنیف صاحب امروہوی تھے، میری کتابیں شرح جامی، شرح وقایہ وغیرہما ان تینوں حضرات کے پاس تھیں، تعلیمی سال کے ختم پر مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری امدادیہ مدرسہ چھوڑ دارالعلوم دیوبند آگئے تو اب والد صاحب نے مجھ کو بھی دیوبند بھیجنے کا ارادہ فرمالیا، یہ غالباً ۱۹۲۱ء یا ۲۲ء کی بات ہے۔

لیکن والد صاحب نے جو اہتمام مراد آباد میں کیا تھا وہی یہاں کیا، مفتی صاحب کے ماموں حافظ عبدالحی صاحب مرحوم و مغفور آگرہ کی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوکر دیوبند میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، یہاں محلہ شاہ ابوالمعالی میں ان کا ایک ذاتی مکان تھا اس میں رہتے تھے، اسی مکان کی بغل میں حافظ صاحب کا ایک اور مکان تھا، والد صاحب نے یہ مکان جس کا اصل دروازہ بھی پہلے مکان کے اندر ہی تھا حافظ صاحب سے کرایہ پر

لے لیا اور میرے ساتھ آگرہ کا پورا گھر بار مع دو نوکروں کے اس گھر میں منتقل کر دیا، اور صرف یہی نہیں بلکہ چھ ماہ کی رخصت لے کر خود بھی دیوبند آگئے، میں نے اگر شروع میں کہا ہے کہ والد صاحب قبلہ نے میری عربی تعلیم کا اہتمام اتنا کیا کہ کوئی انگریزی تعلیم کا بھی کیا کرے گا۔ تو فرمایئے میں نے کیا غلط کہا۔ والد صاحب کی پریکٹس کی آمدنی کا اوسط اگر کم سے کم ایک ہزار روپیہ ماہوار بھی مان لیا جائے تو چھ مہینے کی رخصت کے معنی یہ ہوئے کہ انھوں نے چھ ہزار کا نقصان کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند سے والد صاحب کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ڈاکٹر صاحب! آپ لڑکے کو طالب علمی کرانے لائے ہیں یا نوابی کرنے، والد صاحب نے جواب دیا: حضرت! بچہ بہت لاڈ اور پیار کا پالا ہوا ہے، کبھی گھر سے باہر نکلا نہیں ہے اس لیے مہربانی فرما کر صرف ایک برس کی اجازت دے دیجیے، بات رفت گذشت ہوئی، دارالعلوم میں میرا داخلہ ہوگیا، اور میں پورے گھر کے ساتھ محلہ شاہ ابوالمعالی میں رہنے لگا۔

مفتی صاحب کے اور میرے تعلق کی داستان کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ اکثر و بیشتر عصر کی نماز کے بعد اپنی بہنوئی یعنی حافظ عبدالحی صاحب مرحوم کے گھر تشریف لاتے تھے اور مفتی صاحب، آپ کے فرزند اکبر آپ کے ہمراہ ہوتے، ہمارا مکان بغل میں تو تھا ہی، وہاں سے اٹھ کر حضرت مفتی صاحب ہمارے گھر آتے اور کچھ دیر والد صاحب کے پاس بیٹھ کر واپس تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ والد صاحب سخت بیمار ہوگئے، اور علالت کا سلسلہ طویل ہوگیا جس کے باعث ہم سب لوگ سخت پریشان تھے، اس زمانہ میں دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی پابندی سے ہمارے گھر آتے اور والد صاحب پر کچھ پڑھ پڑھ کے دم کرتے رہتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ خاص اور ان کی دعاؤں کا اثر تھا کہ جس روز والد صاحب کی رخصت ختم ہونے والی تھی اور ہم لوگ سخت پریشان اور فکرمند تھے کہ اگر رخصت کے ختم ہونے تک والد صاحب شفایاب نہ ہوئے تو ان کی سرکاری ملازمت کا کیا ہوگا۔

اس کے دو دن پہلے اچانک خود بخود ایسے صحت یاب ہوئے کہ گویا کبھی بیمار ہی نہ ہوئے تھے۔

مجھ میں اور مفتی صاحب میں فاصلہ بہت کافی تھا، کیونکہ وہ عمر میں مجھ سے سات برس بڑے، میں متوسطات کا طالب علم اور وہ معین المدرسین۔

اس قدرتی فاصلہ کے باعث شروع شروع میں میرے اور ان کے درمیان یک گونہ حجاب سا رہا لیکن مفتی صاحب کی روزانہ آمد و رفت اور غیر معمولی توجہ اور کرم نے مجھ کو جلد بے تکلف بنا دیا۔

ایڈیٹر برہان کو صدمہ

قارئین برہان کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ ۱۰ر جولائی کو مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر برہان کا جواں سال بیٹا "عمر سعید" عمر ۴۰ سال مختصر علالت کے بعد انتقال کر گیا۔

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجعون

مولانا کو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا صدمۂ جانکاہ ابھی تازہ ہی تھا کہ ناگاہ ایک یہ حادثہ بھی پیش آ گیا۔ مولانا کو اس قدر سخت صدمہ ہے کہ انھوں نے لکھنا پڑھنا سب ترک کر دیا ہے اور ان پر ایک عالم گمشدگی طاری ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کریں اور مولانا کے لیے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

عمید الرحمٰن عثمانی (منیجر)

شیخ بو علی سینا کی شخصیت
حقائق کی روشنی میں

جناب شبیر احمد غوری

شیخ (بو علی سینا) پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، پھر بھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے

وہ ایک کثیر الحیثیات عبقری تھا، ایک عظیم مفکر اور ایک بہت بڑا انقلابی:

جہاں تک اُس کے فضل و کمال، بالخصوص اس کی فلسفیانہ عبقریت، حکیمانہ بصیرت

اور فن طب میں اس کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت کا تعلق ہے اس باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

لیکن اس سے قطع نظر جہاں تک اس کی نجی زندگی، بالخصوص اُن کمزوریوں کا تعلق ہے،

جن سے سوائے انبیاء کرام کی ذوات مقدسہ کے اور کوئی فرد بشر نہیں بچا ہوگا، یہ ایک بالکل ہی

غیر ضروری بلکہ لایعنی بحث ہے، بقول خیامؒ۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو		واں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زلیست، بگو

ایک قلم کار کا اپنے رئیس التذکرہ کی پرائیوٹ زندگی کے پیچھے پڑ جانا کہ وہ کیا کھاتا تھا۔ کیا

پیتا تھا، کس سے معاشقہ کرایا، کس سے ڈویل لڑا، کوئی پسندیدہ کاوش نہیں ہے، کہ

محتسب را درون خانہ چہ کار

بالخصوص جب کہ ان لایعنی ابحاث سے کہیں اہم تر مباحث تشنۂ تحقیق ہوں: مثلاً

اُس کی فلسفیانہ عبقریت کی تشکیل میں کن کن عوامل نے حصّہ لیا۔

اس کی "القانون فی الطب" کہاں تک اس کے ابتکار فکر اور ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہے اور
کہاں تک اپنے پیشروؤں کی خوشہ چینی کا، یا

جن شورش پسندانہ سرگرمیوں میں اُس کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا اُن کا وقت کی عظیم تر
انقلابی تحریکوں سے کیا تعلق تھا۔

پھر اُس کی پرائیوٹ زندگی سے متعلق تحقیقی مساعی کا ایک ناخوشگوار پہلو یہ بھی ہے کہ عقیدت
مفرط پر مبنی "تولاّ"، "تبرّا" کو جنم دیے بغیر نہیں رہ سکتا، کیوں کہ

عمل سے ردعمل ہمیشہ دگنا ہوا کرتا ہے

اور یقیناً یہ کوئی خوش گوار صورت حال نہیں ہو سکتی۔

اس لیے اس نام نہاد تحقیق سے کیا حاصل کہ وہ جو مشروب پیتا تھا، وہ کیا تھا؟ نبیذ، شراب،
مقوی ٹانک، مفرح مشروب اور پھر یہ لغوی تحقیق کہ یہ "شراب" "شربت انگور" کا مصداق تھی،
یا "شراب انگور" کا، "شراب الصالحین" تھی یا "شراب الطالحین"۔ یہ سب تطویل لاطائل ہے۔

پھر "سندعالی" (Original Source) سے اغماض برت کر "سندسافل"
(Secondary Sources) سے استشہاد کرنا، کسی طرح سمجھ میں آنے والی
بات نہیں ہے اور اس پر مستزاد یہ بحث کہ بعد کے تذکرہ نگاروں میں اس واقعہ کی تفصیل کے بارے میں
کیا اختلاف ہے اور اُن سے کیا تسامحات ہوئے ہیں۔ اس کوہ کندن و کاہ برآوردن کی صرف اسی
وقت قدروقیمت ہو سکتی ہے جب اصل ماخذ دنیا سے ناپید ہو، اسی طرح اس لغوی تحقیق کی اسی
وقت اہمیت ہو سکتی ہے جب خود شیخ نے اس کی کوئی وضاحت نہ کی ہو۔ مزید توضیح حسب ذیل ہے:

(۱) جہاں تک ماخذ کا تعلق ہے اصل ماخذ خود شیخ کی خودنوشت سوانح عمری ہے، شیخ کی اس
خودنوشت سوانح عمری کو ڈاکٹر سعید نفیسی نے

"سرگزشت ابن سینا (بقلم خود و شاگردش)"

کے نام سے فارسی ترجمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے (انجمن دوستداران کتاب طہران) بعد کے

تذکرہ نگاروں بیہقی (تتمہ صوان الحکمہ) ابن القفطی (تاریخ الحکماء) ابن ابی اصیبعہ (عیون الانباء فی طبقات الاطباء) وغیرہ نے واقعہ زیربحث کو اسی "خودنوشت سوانح عمری" سے باختلاف عبارات نقل کیا ہے۔ اصل ماخذ کے ہوتے ہوئے ثانوی ماخذ سے مراجعہ محض تضیع اوقات ہے۔

بہرحال شیخ اس خودنوشت سوانح عمری میں لکھتا ہے:

"فمہما غلبنی النوم او شعرت بضعف عدلت الی شرب قدح من الشراب لیما (ریثما) یعود الی قوتی"

پس جب مجھ پر نیند کا غلبہ ہوتا، یا میں کمزوری محسوس کرتا تو شراب کا ایک پیالہ پی لیتا، تاکہ میری قوت بحال ہو جائے۔

لہٰذا یہ مسئلہ تو طے ہوگیا کہ شیخ کا یہ مشروب شراب ہوتا تھا۔

(۲) رہی یہ بات کہ یہ "شراب"، خمر تھی یا شربت اور اس باب میں متاخر لغت نویسوں کا سہارا لینا اسی وقت مستحسن ہو سکتا تھا، جب اس سلسلے میں خود شیخ یا اس کے معاصرین کی تصریحات نہ ملتیں اور پھر بھی یہ استشہاد فیصلہ کن نہ ہوتا، کیوں کہ "غیاث اللغات" اور "المنجد" وغیرہ شیخ کے کوئی آٹھ نو سو سال بعد لکھی گئی ہیں اور اس طویل عرصہ میں لفظوں کے مفاہیم کا بدل جانا فطری ہے۔ مگر خوش قسمتی سے یہاں بھی ہمیں خود شیخ کے یہاں اس لفظ کے مصداق کی صراحت مل جاتی ہے وہ "القانون (جلد دوم مفردات) میں جو کچھ لکھتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ لفظ شراب سے اس کی مراد یہی اصطلاحی شراب ہے جو ام الخبائث ہے:

"الشراب = الماهية: اعرفه بالقوة- الخواص: يعدل الفضول التي من جنس المرار ..... الذهيار ..... يختلف تناوله بحسب الامزجه،

اما الشباب فالقدر القليل منه مع الرمان وللشيوخ كما هو من غير مزج...

اعضاء الرأس: يسكر ويسبت ويزيل الحفظ ويحذر القوى النفسانية....

اعضاء الصدر: ينمي الحرارة الغريزية ويفرح القلب .... اعضاء الغذاء:

سریع الاحمر، والا نہضام کثیرا لغذاء، الخ

ان دو وضاحتوں کے بعد بات صاف ہو جاتی ہے اور کسی مزید قیل و قال کی گنجایش نہیں رہتی۔ اب شیخ اس شراب کو بحالی قوت کے لیے پیتا تھا یا عیاشی اور ہلڑ بازی کے لیے، اس سے اصل واقعہ "بود" سے "نابود" نہیں بن سکتا اور نہ ہی یہ کاوش و تدقیق شراب کی حرمت کو حلت میں بدل سکتی ہے۔

لیکن "الشیٔ یذکر بالشیٔ" بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ شیخ کی صفائی اور برأت پر اصرار سے ایک انتہائی ناخوش گوار اور تکلیف دہ بحث پیدا ہونا فطری ہے، جس سے بادل ناخواستہ تعرض کرنا ہی پڑے گا۔

پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ آیا۔ مسئلہ متنازع فیہ کی کوئی اساس ہے؟ اور نزاع صرف فرع میں ہے یا اُس "اصل" میں بھی ہے جس پر وہ فرع متفرع ہوتی ہے۔؟

دوسرا تحقیق طلب امر یہ ہے کہ شہود نے رئیس التذکرہ کی صرف تعدیل ہی کی ہے یا جرح بھی بصورت ثانی دونوں شہادتوں میں کون سی شہادت زیادہ قابل اعتماد ہے؟

پھر انفصال قضایا میں مصرحہ شہادتوں کے ساتھ ساتھ قرائن کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تیسری تحقیق طلب بات یہ ہے کہ مسئلہ فیما نحن فیہ میں قرائن کیا ہیں اور اُن کا تقاضا کیا ہے۔

(۱) مسئلہ کی اساس

اس سلسلے میں جو بنیادی نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے یہ ہے کہ شیخ بے شک ایک عظیم عبقری تھا جس کی عبقریت نے انسانی فکر کی خدمت میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ برصغیر کے مدارس میں وہ کون معلم یا متعلم ہے جس کا فلسفہ میں سلسلۂ تلمذ شیخ تک نہ پہنچتا ہو۔ نام نہاد "فلسفہ اسلام" کا بانی دہادی شیخ بوعلی سینا ہی ہے۔ اسی کا مرتب کردہ فلسفہ ہمارے مدارس میں پڑھایا جاتا ہے۔ اسی کی "القانون فی الطب" جملہ اطبار روزگار کی تشخیصی و معالجاتی سرگرمیوں کا سرچشمہ ہے اور یہی اس کی عظمت و جلالت قدر کا مبنیٰ علیہ ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود شیخ کوئی پیشوائے دین نہ تھا جس کا اسوہ اس کے عقیدتمندوں کے لیے واجب الاتباع ہو اور جب اس کی ذاتی زندگی ہمارے لیے واجب الاتباع ہی نہیں تو پھر اس کی نجی زندگی کی جزئیات کی تلاش عبث و بے سود ہے کہ وہ کیا کھاتا تھا، کیا پیتا تھا، جنس کے معاملے میں حصور اور برہمچاری تھا یا جنس زدہ اور ہوس پرست؟

لہذا اگر وہ اپنے وقت کا ارسطوئے زماں و جالینوس دوراں تھا تو کیا ضرور ہے کہ ثانی جنید وشبیل بایزید بھی ہو۔

پھر تقوی ہو یا فسق دونوں کی اساس اسلام ہے متقی بھی مسلمان ہوتا ہے اور فاسق بھی مسلمان ہوتا ہے "شرح عقائد نسفی" میں بعض متکلمین کا قول نقل کیا ہے:

"لا یضر مع الایمان معصیۃ کما لا ینفع مع الکفر طاعۃ" ایمان ہوتے ہوئے کوئی گناہ مضرت نہیں پہنچاتا، جس طرح کفر کی حالت میں کوئی طاعت فائدہ نہیں پہنچاتی، اس کا پہلا جزء متنازع فیہ ہے مگر دوسرا جزء فیما بین مسلّم ہے، جبھی تو پہلے جزء کے قائلین نے اسے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

لہذا یہ سوال پیدا ہونا فطری ہے کہ

"کیا وہ مسلمان بھی تھا؟"

بظاہر یہ سوال انتہائی مستبعد معلوم ہوتا ہے، مگر محتمل الوقوع تو ہے بالخصوص جبکہ ثقات (جن کے دین و دیانت، علم و فضل اور اُن سے زیادہ احساس ذمہ داری اور خوف احتساب اُخروی کی قسم کھائی جا سکتی ہے) جہت مخالف میں گئے ہیں (تفصیل آگے آرہی ہے)۔ لہذا جو شراب شیخ پیتا تھا "شراب انگور" نہ سہی "شربت انگور" ہی سہی، لیکن بقول خیام

آں (صد) کار کنی کہ مے غلام است آنرا

جب اس کا اسلام ہی معرض بحث میں ہو تو اس کی پرہیزگاری سے کیا حاصل عظیم مفکر و جلیل القدر ماہر طبیعیات آئن سٹائن کے بارے میں ہم کبھی اس قسم کی لایعنی اور لاحاصل بحث و تحمیص

میں وقت ضائع نہیں کرتے۔

اس لیے شیخ کی تقویٰ شعاری کے اثبات سے زیادہ اہم مسئلہ اس کے اسلام کا ہے۔

(۲) رئیس التذکرہ کی جرح و تعدیل

الف - تعدیل

شیخ کے زہد و اتقا کے باب میں بسا اوقات اتنا کچھ کہا جاتا ہے کہ بڑے سے بڑا عقیدت مند مرید بھی اپنے پیر سے بیعت فسخ کر کے شیخ ہی کے مزعومہ "دست حق پرست" پر بیعت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ سلطان ابوسعید ابوالخیر جس شخص کے بارے میں یہ سرٹیفکٹ دیں کہ

"جو میں دیکھتا ہوں، وہ جانتا ہے۔

معرفت کی طے منازل میں اس کے لیے اس سے زیادہ اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے۔

یا پھر خواجہ فریدالدین عطار یاد خداوندی میں جس کے انہماک و مشغولیت کو بنظر رشک و غبط دیکھتے ہوں، اس کی ثقاہت کے باب میں سوء ظن کا کیا محل۔

ب - جرح

مگر ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ تصویر کے اور بھی پہلو ہوتے ہیں اور تحقیقی ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ ان سے بھی کلیتاً "صرف نظر" نہ کیا جائے بالخصوص جب ان پہلوؤں کی جانب ایسے ذمہ دار اکابر نے توجہ دلائی ہو جن کا ثقہ ہونا قیل و قال سے بلند ہو۔

سلطان ابوسعید ابوالخیر اور خواجہ فریدالدین عطار کی شخصیتیں عظیم اور واجب الاحترام ہیں، لیکن کیا اُن کی طرف منسوب واقعے یا اُن کے افادات کو تنقید کی سخت و سنگین کسوٹی پر بھی کس لیا ہے؟

پھر حضرت مولانا انورشاہ کشمیری، شیخ ابن القدوہ کا خاندان، حضرت مجدد الف ثانی اور حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین بھی دین متین کے اسرار و رموز کے امین ہیں۔ ان کا مقام بھی شریعت بیضائے اسلام کی تاریخ میں اتنا بلند ہے کہ ان کے ارشادات عالیہ کی صحت کے

ب میں کسی سوء ظن کی گنجائش نہیں ہے ۔

۱۔ محدث شہیر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ صرف علوم دینیہ (قرآن وسنت) کے نکات و دقائق کے محرم راز نہیں تھے، نام نہاد "علوم حکمیہ" (فلسفہ و معقولات) کے ہفوات اباطیل بھی اُن کی نگاہ دُور رس کی زد سے باہر نہ تھے۔ بخاری شریف کی شرح "فیض الباری" ں "توحید باری تعالیٰ" (جو اسلام کے کارکن رکین ہے) کی توضیح میں فرماتے ہیں :

واللہ کان ولیس شیئ غیرہ		سبحانہ جل العظیم الشان

واللہ خالق کل شیئ غیرہ		ما ربنا والخلق مقترنان

(صرف اللہ تعالیٰ ہی تھا اور اس کی غیر کوئی شے موجود نہیں تھی ۔ وہ پاک ہے ذوالجلال ہے عظیم الشان ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے سوا ہر چیز کا خالق ہے ہمارا پروردگار اور مخلوق مقترن نہیں تھے (ازل میں ساتھ ساتھ نہیں تھے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی تھا اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔)

مگر اس "سرخیل فلاسفۂ اسلام" نے توحید باری کے اس منہل صافی کو شرک کی نجاست سے ندہ کر دیا اس لیے اس سے تبرا و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں :

لسنا نقول کما یقول الملحد الزندیق صاحب منطق الیونان

بدوام ھذا العالم المشہود والا		رواح فی ازل ولیس یفان

ہم وہ بات نہیں کہتے جو کہ وہ ملحد و زندیق کہتا ہے جو یونانی منطق کا معلم (ثالث) ہے اور جو اس عالم مشہود نیز ارواح کی ہمیشگی اور دوام کا قائل ہے اور اس بات کا کہ یہ (دونوں عالم مشہود اور ارواح) فانی نہیں ہیں ۔

اور پھر اس غرض سے کہ کہیں اس "ملحد و زندیق" کے پہچاننے میں کوئی ابہام یا شک نہ رہے صرح طور پر اس کا نام مع اُن اوصاف کے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، بتاتے ہیں :-

ھو ابن سینا القرمطی غدا امری		شرک الوری دشریطۃ الشیطان

(اور وہ ابن سینا قرمطی اور غدامری ہے، شیطان کا ساتھی)

واضح رہے کہ حضرت مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کا یہ تبصرہ کسی "ملایانہ تعصب" کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ذمہ دارانہ تحقیق وکاوش کا ماحصل ہے جس کی تفصیل حجۃ الاسلام امام غزالی کے تبصرہ کے سلسلے میں آرہی ہے۔

۲۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ تعالیٰ کا احیاء شریعت کی مساعی جمیلہ کی تاریخ میں جو بلند مقام ہے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ذمہ داران امت نے حدیث نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم

"ان اللہ سیبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لہا دینھا۔"

(اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر اس امت (کی اصلاح اور رشد وہدایت) کے لیے ایک نفس قدسی کو مبعوث فرمائے گا جو اس کے لیے اس کے دین کی تجدید کرے گا۔)

کی شرح وتوضیح کے سلسلے میں ان کی تجدید واحیاء دین کی کوششوں کو نہ صرف قرن یازدہم، بلکہ ہزارہ دوم کے لیے اللہ رب العزۃ کی نعمت عظمیٰ قرار دیا اور انھیں "مجدد الف ثانی" کے خطاب کا مستحق سمجھا۔ یہی مجدد ملت اور محی دین مبین اس "علوم صوفیہ" کے محرم راز کے بارے میں فرماتے ہیں:

"از کوتہ نظری ابن سینا است کہ باسلام حقیقی دلالت ننمودہ ...... بلکہ او از اسلام مجازی ہم حظ وافر نہ گرفتہ ودر خرخشہائے فلسفی ماندہ۔ امام غزالی تکفیر او می نماید والحق کہ اصول فلسفی او منافی اصول اسلام است۔"

(واضح رہے کہ حضرت مجدد صاحب نے یہ افادہ اس مسائل کے جواب میں فرمایا تھا، جس نے سلطان ابوسعید ابوالخیر اور بوعلی سینا کی مزعومہ ملاقات کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ اس کی مزید تفصیل نیز امام غزالی نے ابن سینا کی جو تکفیر

کی ہے، آگے آرہی ہے)

۳۔ سلطان معزالدین محمد غوری کے برادر اکبر غیاث الدین کے عہد حکومت (زمانہ چھٹی صدی ہجری کا آخر) غور وفیروز کوہ کے عالم مشار الیہ مجدالدین عبدالمجید بن عمر تھے جو ابن القدوہ کے نام سے ..... مشہور ہیں۔ سارا دارالحکومت ان کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کا معتقد تھا۔ اسی زمانہ میں امام فخر الدین رازی شہر بامیان سے آئے اور اپنا بازار گرم کرنے کے لیے انھیں فلسفہ ومنطق کے ذریعہ مغلوب کرنا چاہا۔ شیخ ابن القدوہ فلسفہ سے بیزار تھے، لہٰذا ناراض ہو کر مجلس مناظرہ سے تشریف لے گئے۔ اہل شہر کو جب شیخ ابن القدوہ کے مقابلے میں امام رازی کی اطالت لسان کا پتہ چلا تو ہنگامہ عظیم برپا کر دیا اور جب صورت حال قابو سے باہر ہو گئی تو سلطان کو امام رازی کو شہر بدر کرنا پڑا۔

انھیں شیخ ابن القدوہ کی مدافعت میں ان کے چچازاد بھائی نے دوسرے دن جامع مسجد میں آکر تقریر کی اور بو علی سینا کے اُن مزعومہ "اسرار ولطائف" کو جن کی بنا پر سلطان ابو سعید ابوالخیر نے فرمایا تھا۔

"جو میں دیکھتا ہوں، وہ جانتا ہے۔"

کفریات سے تعبیر کیا، چنانچہ ابن الاثیر نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"فلما صعد المنبر قال بعد ان حمد اللہ وصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لا الٰہ الا اللہ، ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاھدین ایھا الناس انا لا نقول الا ما صح عندنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما علم ارسطاطالیس	پس جب وہ منبر پر چڑھے تو بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ حمد وثنا کی اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وصلوٰۃ بھیجی، فرمایا: نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ اے ہمارے پروردگار جو کچھ تو نے اپنے رسول پر اتارا ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی۔ پس ہمیں اپنی وحدانیت کی شہادت

وکفریات ابن سینا و فلسفۃ الفارابی فلا نعلمہا" دینے والوں میں لکھ دے ۔ اے لوگو! ہم صرف وہی کہتے ہیں جس کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہوئی ہے، رہا ارسطو کا مزعومہ علم اور شیخ بوعلی سینا کی کفریات اور فارابی کا فلسفہ تو ہم انھیں نہیں جانتے (نہ درخور اعتنا سمجھتے ہیں)۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ امام رازی اپنی "فلسفہ بیزاری" کے باوجود شیخ بوعلی سینا کی "الاشارات والتنبیہات" کے نمط تاسع سے جو علوم صوفیا کے باب میں ہے، حد درجہ متاثر تھے، چنانچہ انھوں نے اس "نمط" کی شرح شروع کرنے سے پہلے لکھا تھا:

"ھذا الباب اجل ما فی ھذا الکتاب فانہ رتب علوم الصوفیۃ ترتیباً ما سبقہ الیہ من قبلہ ولا لحقہ من بعدہ"

یہ باب اس کتاب میں سب سے زیادہ جلیل القدر ہے، کیونکہ (اس کے اندر شیخ بوعلی سینا نے) علوم صوفیہ کو ایک ایسے انداز سے مرتب کیا ہے جس کی نہ اس کے پیش رووں کو ہوا لگی تھی اور نہ بعد میں آنے والے اس تک پہنچ سکے۔

لیکن یہ نام نہاد "علوم صوفیاء کی تبیین و توضیح"، نبوۃ کی فلسفیانہ توجیہہ ہے اور اسلام دشمن منکرین کا اسلام کے خلاف نہایت ہی مؤثر حربہ رہا ہے کیونکہ اس نے نبوت کے "وہبی" ہونے کے عقیدہ کے خلاف اس کے "کسبی"، و اکتسابی ہونے کے شوشہ کو ہوا دی۔ امام رازی ابن سینا کی اس فلسفیانہ توجیہ کے اس درجہ گرویدہ تھے کہ انھوں نے اس کے رسالہ "معراج نامہ"، کو جس میں اس نے "الاشارات" سے کہیں زیادہ وضاحت کے ساتھ اس توجیہہ کو قلمبند کیا ہے، اپنے ہاتھ سے نقل کیا۔ اس "معراج نامہ" نے بعد کے تفلسف زدہ متصوفین کو بے حد متاثر کیا۔ ان میں نمایاں نام دسویں صدی ہجری کے شیخ غوث گوالیری کے "رسالہ معراجیہ" کا ہے۔ اس کی خلاف شرع عبارتوں سے برہم ہو کر پہلے شمالی ہند کے علماء نے اور پھر گجرات کے علماء نے ان کی تکفیر کی اور قتل کا فتویٰ صادر کیا۔

یہ ہے ابن سینا کے "علوم صوفیہ" کی حقیقت جس سے امام رازی جیسا فلسفہ بیزار متکلم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس "علوم صوفیہ" سے متاثر ہو کر سلطان ابوسعید ابوالخیر نے کہا تھا: "جو میں دیکھتا ہوں، وہ جانتا ہے" لہذا جب امام رازی نے غور کے لوگوں پر رعب ڈالنے کے لیے اس "توجیہہ" کو اپنی گلفشانی کا موضوع بنایا، تو پھر شیخ ابن القدوہ کے عم زاد کے لیے اسے "کفریات ابن سینا" کہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا۔

۴۔ لیکن ان بزرگوں میں سب سے زیادہ واجب الاحترام شخصیت حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی ہے جنھوں نے "مسائل ثلاثہ" (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) میں منصوصات قرآنی کے خلاف موقف اختیار کرنے پر بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے اور جس کا اس کے عقیدت مند کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔

ہوا یہ کہ ۱۰۵۶ھ میں بادشاہ شاہجہاں نے شاہ ایران کے یہاں ایک سفیر کو، جن کا نام جاں نثار خاں تھا روانہ کیا۔ سفارت خانے کے عملہ میں دو شخص محمد فاروق اور محب علی بھی تھے، جنھیں اپنی معقولات دانی پر بڑا ناز تھا اور اسی زعم باطل میں وہ وزیر اعظم ایران سے جو فلسفہ میں اعلم علمائے عراق" تھا جا بھڑے۔ وزیر اعظم نے امتحاناً پوچھا کہ امام غزالیؒ نے "مسائل ثلاثہ" میں مخالف اسلام عقیدہ (قدم عالم، انکار حشر اجساد اور نفی علم باری بجزئیات مادیہ) رکھنے کی بنا پر بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے۔ آپ اس کی برأت میں کیا کہتے ہیں۔ مگر جو بات لاجواب ہو اس کا جواب کیا۔ لہذا یہ دونوں مدعی ہمہ دانی بقول وزیر اعظم سعد اللہ خاں علامی

مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند

بعد کی تفصیل کہ شاہجہاں کو اس علمی شکست سے کس درجہ صدمہ ہوا اور علامی سعد اللہ خاں نے اس سلسلے میں مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی سے "الدرۃ الثمینہ" کے عنوان سے اس کا جواب لکھوایا دغیر ضروری ہے۔

یہاں صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ امام غزالی نے بوعلی سینا کی تکفیر کی تھی، چنانچہ علامی

سعد اللہ خاں نے جو خط مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی کو لکھا تھا اس میں اس تکفیر کا صراحۃً ذکر کیا ہے اس خط کو مولانا امام الدین ریاضی (مصنف "التصریح فی الہیئۃ") نے اپنے "تذکرہ باغستان" میں (جس کا واحد نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے) نقل کر دیا ہے۔ رضا لائبریری رامپور میں "الدرۃ الثمینہ" کا جو مخطوطہ ہے اس کے آخر میں بھی سعد اللہ خاں علامی کا یہ مکتوب موجود ہے۔ سعد اللہ خاں نے لکھا تھا:

"وحید العصر فرید الدہر بادراک نشاتین داحراز دارین کامیاب باشند، حسب الحکم اشرف می نویسد کہ ...... خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و محب علی واقعہ نویس کہ بامارت مآب جاں نثار خاں سفیر متعین اند، بس از دعوائے ایناں بفضل و کمال پرسیدہ باشند کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم و نفی علم واجب تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جہلاً مرکباً بجزئیات مادیہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی و شیخ ابو علی سینا نمودہ، و جمعے تاویل کلام حکما کردہ اند۔ ایں مراتب راتقریر باید کرد۔ مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند ..... لہذا کمترین مریداں حکم شد کہ آں فضائل و کمالات دستگاہ سطرے چند بزنگارد و بہ گزارد کہ ..... دریں مسائل مختصرے جامع ..... نوشتہ در حضرت خلافت .... باید فرستاد کہ بایران فرستادہ شود۔"

اس سرکاری دستاویز سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حجۃ الاسلام امام غزالی کا خلاف ۔۔ اسلام معتقدات رکھنے کی بنا پر شیخ بو علی سینا کی تکفیر کرنا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

مگر انھوں نے آج کل کے کافر ساز ملاؤں کی طرح بھونڈے طریقہ سے یہ تکفیر نہیں کی، بلکہ بڑے محتاط مگر مدلل انداز میں اس وظیفۂ افتاء کی ذمہ داری کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے "تہافت الفلاسفہ"

کے دیباچہ میں پہلے تو اس زمانہ کے آزاد خیال طبقے میں فلسفہ پسندی کی بڑھتی ہوئی وبا کے خطرات سے متنبہ کیا ہے۔ اس وبا کی اشاعت کے علل واسباب کا بڑی دقتِ نظر سے تجزیہ کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ اسی فتنۂ عظیم کے سدباب کے لیے میں یہ کتاب "تہافت الفلاسفہ" لکھ رہا ہوں۔

پھر لکھا ہے کہ مختلف یونانی فلاسفہ کے اقوال میں بہت زیادہ اختلاف اور ان کے افکار میں شدید نزاع ہے، لہٰذا میں نے اس کام (ابطال فلسفہ) کے لیے ان کے پیشوا ارسطو کے افکار کو منتخب کیا ہے:

"لیعلم ان الخوض فی حکایۃ اختلاف الفلاسفۃ تطویل
فان خبطهم طویل ونزاعهم کثیر..... فلنقتصر علی اظهار
التناقض فی رای مقدمهم .... وهو ارسطاطالیس"

پھر چونکہ ارسطو کے شارحین اور مترجمین کا کلام تحریف و تبدیل کا شکار ہو گیا، جس کی وجہ سے ان کے درمیان شدید نزاع پیدا ہوئی اور چونکہ فلاسفۂ اسلام میں ارسطاطالیسی تعلیمات کے ان ناقلین میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ابونصر فارابی اور بوعلی ابن سینا ہیں، اس لیے میں نے انھیں کے مختارات کو قابل اعتنا اور درخور ردو ابطال سمجھا:

"ثم المترجمون لکلام ارسطاطالیس لم ینفک کلامهم
من تحریف وتبدیل.... واقومهم بالنقل والتحقیق
من المتفلسفۃ الاسلامیۃ الفارابی ابونصر وابن سینا
علی ابطال ما اختاراه ورایاه الصحیح
من مذهب رؤسائهم فی الضلال .... فلیعلم انا
مقتصرون علی رد مذاهبهم بحسب نقل هذین الرجلین"

لہٰذا امام صاحب کی تہافت الفلاسفہ "ارسطاطالیسی - ابن سینائی" فلسفہ کی تنقید ہے جو آج بھی کم از کم برصغیر کے عربی مدارس میں پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے اور اس طرح عملاً یہ

بو علی سیناہی کے افکار و تصورات کی تنقید و تردید ہے۔

اس تنقیدی فریضہ کی ادائیگی کے لیے انھوں نے اس "ارسطا طالیسی ابن سینائی" فلسفہ کے، جو بوعلی سینا کا مذہب مختار ہے بیس مسئلے منتخب کیے ہیں' ان میں سے محوّلہ بالا "مسائل ثلاثہ"۔ (جن کے متعلق خلیفہ دانشور عراق نے کہا تھا کہ امام غزالی نے ابن سینا کی تکفیر کی ہے) حسب ذیل ہیں:

۱- المسئلۃ الاولی: فی ابطال مذھبہم فی ازلیۃ العالم	}	یعنی فلاسفہ اور بالخصوص ابن سینا کے عقیدہ قدم عالم کا ابطال۔
المسئلۃ الثانیۃ: فی ابطال مذھبہم فی ابدیۃ العالم		

۲- المسئلۃ الثالثۃ عشر: فی ابطال قولھم ان الاول لا یعلم الجزئیات
یعنی فلاسفہ بالخصوص ابن سینا کے عقیدہ نفی علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ ابطال۔

۳- العشرون: فی ابطال انکارھم البعث وحشر الاجساد مع التلذذ والتالم۔
یعنی فلاسفہ بالخصوص ابن سینا کے عقیدہ "انکار حشر جسمانی" کا ابطال

خاتمہ میں انھوں نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ آیا ان سبھی مسائل بست گانہ میں تشکیک وجحود سے مسلمان خارج از اسلام ہو جاتا ہے' اس کے جواب میں فرماتے ہیں' ان میں سے تین مسئلے ایسے ہیں جن کا اعتقاد "کفر بواح" ہے۔ باقی میں چونکہ مختلف فرق اہل اسلام کا اختلاف ہے اس لیے ان کے قائل کو خارج از اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا:

"فان قال قائل قد فصلتم من اھب ھٰؤلاء
افتقطعون بکفرھم ووجوب القتل لمن یعتقد اعتقادھم؟
قلنا تکفیرھم لا بد فی ثلاث مسائل:
احداھا مسئلۃ قدم العالم وقولھم ان الجواھر کلھا قدیمۃ،
والثانیۃ قولھم ان اللہ تعالیٰ لا یحیط علماً بالجزئیات
الحادثۃ من الاشخاص

والثالثة فی انکار بعث الاجساد وحشرھا

فھذہ المسائل الثلاث لا تلائم الاسلام بوجہ و

معتقدھا معتقد کذب الانبیاء.... وھذا ھو الکفر الصریح

لم یعتقد احد من فرق المسلمین ـــ"

امام غزالی کی اس مدلّل توضیح کے بعد بوعلی سینا کے اسلام اور کفر کا مسئلہ کسی مزید قیل و قال کا محتاج نہیں رہتا، چنانچہ بعد کے علمائے ربانیین مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس قول فیصل کی توثیق کردی۔

تمام قارئین اور متعلق ادارہ ندوۃ المصنفین، مصنف اور مضمون نگاران وغیرہ وغیرہ اور حضرت محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانیؒ سے عقیدت اور خلوص رکھنے والے ان قابل لوگوں سے درخواست ہے کہ مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں بہت جلد ان کی زندگی سے متعلق روشنی ڈال کر اور زیادہ قربت رکھنے والے حضرات ان کی سوانح پر بہت جلد مضامین لکھ کر مینجر رسالہ برہان دہلی کے نام ارسال فرمائیں۔ کیونکہ حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں ایک ضخیم شاندار معیاری نمبر ان کے کردار اور عظمت کے مطابق شائع ہونے والا ہے اس لیے آپ کو مطلع کیا گیا کہ اس کی طرف خصوصیت سے توجہ فرمائیں۔

(مینجر)

"بدعت کیا ہے؟ ایک تنقیدی جائزہ"

از محمد سعید الرحمٰن شمس، مدیر ماہنامہ نصرۃ الاسلام، کشمیر۔

تمہید اسلام ایک مکمل ترین مذہب، قرآن مجید ایک کامل دستور العمل اور ضابطۂ قانون ہے۔ یہ تغیر پذیر دنیا ہزاروں کروٹیں بدلے، انسانی افکار و خیالات، تمدن و معاشرت، اقتصادیات و معاشیات، عمرانیات و اخلاقیات کی قدریں یکسر بدل جائیں، فکر و ذہن کے پیمانوں میں تبدیلیاں رونما ہوں، دنیا علم و آگہی اور تحقیق و ریسرچ کی آخری منزلوں کو پار کرلے، لیکن قرآن حکیم کی لازوال تعلیمات، جامع وہمہ گیر اصول اور مسلّمہ نظریات، انسانی زندگی کے مختلف حوائج و دینی ضروریات کا بہترین اور فطری حل پیش کرتے رہیں گے، یہ کوئی خوش دل کن اور وقتی بات نہیں بلکہ حقائق سے لبریز اور تسلیم شدہ بات ہے جسے آج بھی پوری دنیائے انسانیت خواہی نخواہی ماننے پر مجبور ہے اور اسلام کا نام لیے بغیر اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہے، بے شبہ یہ چیز خوش آئند بھی ہے اور امید افزا بھی!

اسلام کی عظیم الشان دولت، قرآنِ مقدس جیسا علمی، فکری، مذہبی دینی اور معلوماتی خزینہ جس ذات ستودہ صفات کی بدولت ہمیں نصیب ہوا وہ سالارِ کائنات، سائرِ ہفت سماوات، سردار رسل، مہبطِ وحی، حاملِ قرآن، محمد عربی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپؐ جامع العلوم والکمالات ہیں، نبوت و رسالت کے جتنے فضائل، مناقب، مراتب اور محاسن و خوبیاں ہیں وہ سب آپؐ کی ذاتِ گرامی میں بدرجۂ اتم جمع کردی گئی ہیں۔ کوئی بھی کمال و جمال چاہے وہ علمی ہو یا

عملی، اخلاقی ہو یا دینی، سیاسی ہو یا تمدنی آپؐ کی مقدس ذات پر اختتام پذیر ہے، اسی لیے آپؐ خاتم النبیین بھی ہیں، ختم نبوت کے معنی قطع نبوت کے نہیں کہ نبوت دنیا سے اٹھ گئی بلکہ ختم نبوت کے معنی تکمیلِ نبوت کے ہیں، چنانچہ مسلمانانِ عالم کا یہ متفقہ عقیدہ اور مسلک نصوص و آیات کی روشنی میں ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر اور رسول ہیں، آپؐ کے سر مبارک پر رسالت و نبوت کا آخری تاج رکھ کر یہ دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے، نبوت کی تکمیل و تتمیم کر دی گئی ہے

فرمانِ خداوندی ہے۔

"مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ"
(الاحزاب)

محمدؐ باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن رسول ہے اللہ کا اور مہر سب نبیوں پر۔
(ترجمہ شیخ الہندؒ)

چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری فرستادۂ خداوندی ہیں اس لیے لازمی اور قدرتی طور پر آپ نے قیامت تک کے لیے نسل انسانی کی خاطر ایسا دستورِ حیات بخش کر کے اسوہ اور نمونہ چھوڑا جس میں عمرانی اور تمدنی زندگی کے علاوہ دینی و اخروی مسائل کا تسلی بخش حل اور جواب موجود ہے، چنانچہ دین الٰہی اپنی آخری شکل میں آپؐ پر مکمل ہوا، پیغام خداوندی کی دل نواز اور روح پرور صدا دنیا کے کانوں تک پہنچ گئی :۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"
(المائدہ)

آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے دین تمہارا، اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین" (ترجمہ شیخ الہندؒ)

آیت بالا کے فوائد کے ذیل میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس سرہٗ رقمطراز ہیں: یعنی اس کے اخبار و قصص میں پوری سچائی، بیان میں پوری تاثیر، اور قوانین و احکام میں پورا توسط و اعتدال موجود ہے، جو حقائق کتب سابقہ اور دوسرے ادیانِ سماویہ میں محدود و ناتمام تھیں ان کی تکمیل و تعمیم اس دین قیم سے کر دی گئی، قرآن و سنت نے "حلت ... و حرمت ... وغیرہ کے متعلق تنصیصًا یا تعلیلاً

جو احکام دیے ان کا اظہار اور ایضاح تو ہمیشہ ہوتا رہے گا لیکن اضافہ یا ترمیم کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑی

سب سے بڑا احسان تو یہی ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاء جیسا نبی تم کو مرحمت فرمایا مزید برآں اطاعت واستقامت کی توفیق بخشی، روحانی غذاؤں اور دنیوی نعمتوں کا دسترخوان تمہارے لیے بچھا دیا، حفاظتِ قرآن، غلبۂ اسلام اور اصلاحِ عالم کے سامان مہیا فرما دیے۔

اس عالمگیر اور مکمل دین کے بعد اب اور کسی دین کا انتظار کرنا سفاہت ہے "اسلام" جو تفویض وتسلیم کا مرادف ہے، اس کے سوا مقبولیت اور نجات کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں، **تنبیہ** اس آیت "الیوم اکملت لکم دینکم" الخ کا نازل فرمانا بھی منجملہ نعمہائے عظیمہ کے ایک نعمت ہے، اسی لیے بعض یہود نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ امیر المومنین! اگر یہ آیت ہم پر نازل کی جاتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید منایا کرتے، حضرت عمرؓ نے فرمایا! مجھے معلوم نہیں کہ جس روز یہ ہم پر نازل کی گئی مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہو گئی تھیں، یہ آیت سنہ ۱۰ ھ میں "حجۃ الوداع" کے موقعے پر "عرفہ" کے روز "جمعہ" کے دن "عصر" کے وقت نازل ہوئی جبکہ میدانِ عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد انقیاء وابرار رضی اللہ عنہم کا مجمع کثیر تھا اس کے بعد صرف اکیاسی روز حضورؐ اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔[۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تئیس سالہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات ونامرضیات کی پوری تفصیل اپنے قول وعمل، گفتار وکردار اور نشست وبرخاست کے ذریعے خوب خوب واضح فرما دیا ہے، احکامِ خداوندی کو من وعن، جوں کا توں، بغیر کسی تغیر وتبدل، لیت ولعل اور لومۃ لائم کے اہل دنیا تک پہنچا دیا ہے، صراط مستقیم اور سواء السبیل کی واضح اور دوٹوک الفاظ میں نشاندہی فرما دی ہے، حق وباطل کے مابین صاف خطِ امتیاز کھینچ دیا ہے، توحید وشرک، اور سنت وبدعت کی تفریق کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا ہے، بے شبہ آپؐ نے نبوت کے وہ سارے

---

[۱] بحوالہ تفسیر وترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن رحؒ اسیر مالٹا ص ۱۳۸ "مدینہ پریس بجنور"

فرائض بخوبی اور بااحسن وجوہ انجام دیے جو آپؐ کا فرض منصبی تھا، دین کی تفہیم وتشریح کے ذیل میں قرآن مجید کے علاوہ احادیث مبارکہ کا وہ عظیم الشان اور فقید المثال ذخیرہ چھوڑا کہ جس کی نظیر دیگر اقوام وملل کی تاریخ میں ہرگز نہیں مل سکتی، الحمد للہ وہ علمی، عملی، قولی وفعلی ذخیرہ ہمارے سامنے واضح انداز میں موجود ہے اور دنیا اپنے ظرف وبساط کے مطابق استفادہ کر رہی ہے؛

اسلام کی بنیاد اسلام کی بنیاد اور اساس، جن فکری نقطہ اور فلسفہ پر ہے بلاشبہ وہ توحید خالص اور وحدانیت خداوندی کا دل سے اعتراف اور زبان سے اقرار کرکے عملی زندگی میں اسے نافذ کرنا ہے۔

عبودیت کی بنیاد عقائد اور ایمان کی تصحیح پر ہے، جس کے عقائد میں خلل اور ایمان میں بگاڑ ہو، اس کی نہ کوئی عبادت مقبول، نہ اس کا کوئی عمل صحیح مانا جائے گا اور جس کا عقیدہ درست اور ایمان صحیح ہو اس کا تھوڑا عمل بہت ہے اس لیے ہر شخص کو اس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا ایمان وعقیدہ صحیح ہو اور صحیح ایمان وعقیدہ کے حصول اور اس پر اطمینان اس کا مقصود عمل اور منتہائے آرزو ہو، اس کو ناگزیر اور بے بدل سمجھے اور اس میں ایک لمحہ بھی تاخیر سے کام نہ لے[1]۔

نبوت کا بنیادی مقصد جس شخص کو قرآن سے کچھ بھی تعلق ہے (جو پچھلی تمام کتابوں کی تعلیمات کا جامع ہے) اس کو یقینی اور بدیہی طور پر یہ بات معلوم ہوگی کہ شرک وبت پرستی کے خلاف صف آرائی اس سے جنگ کرنا، اس کو دنیا سے نیست ونابود کرنے کی کوشش کرنا اور لوگوں کو اس کے چنگل سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانا نبوت کا بنیادی مقصد تھا۔ انبیاء کی بعثت کی اصل غرض، ان کی دعوت کی اساس، ان کے اعمال کا منتہا اور ان کی جدّ وجہد کی غایت اصل یہی تھی، یہی ان کی دعوتی سرگرمیوں کا محور ومرکزی نقطہ تھا۔ قرآن کبھی تو ان کے بارے میں اجمالاً کہتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ	اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے ان کی طرف
اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا	بھی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں

[1] بحوالہ دستور حیات ص ۷۶ (مولانا علی میاں ندوی)

فَاعْبُدُوْنِ" (سورۃ الانبیاء) تو میری عبادت کرو!

اور کبھی تفصیل کے ساتھ ایک ایک نبی کا نام لیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کی دعوت کی ابتداء اسی توحید کی دعوت سے ہوئی تھی اور پہلی بات جو انھوں نے کہی وہ یہی تھی:

"قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ" اے میری قوم کے لوگو! خدا کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (الاعراف) [۱]

بہر حال عقیدۂ توحید ہی بنیادی اور کلیدی عقیدہ ہے، خدانخواستہ اگر عقیدۂ توحید کے اندر کسی قسم کا ریب، وشک اور Deffect پیدا ہو جائے تو زبانی ایمان کا دعویٰ ہی سرے سے بے بنیاد اور غلط ہو جاتا ہے۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

بدعت کیا ہے؟ توحید کی ضد اگرچہ شرک ہے، لیکن انسانی عقل اور فہم، علم ودانش کی اتنی رسائی نہیں کہ وہ نبی صادق کی توضیح و تنبیہ کے بغیر پوری طرح یہ سمجھ سکے کہ کون سے امور ہیں جو شرک کے تحت آتے ہیں اور کون سے معتقدات باوجود مشرکانہ نظر نہ آنے کے فی الحقیقت مشرکانہ ہوتے ہیں مثلاً "ریا" ہی کو دیکھ لیجیے یہ اپنی ظاہری شکل میں زیادہ سے زیادہ ایک ناقص اور عیب دار فعل نظر آتا ہے جس کا مرتکب اکثر حالات میں انکار توحید کا وہم بھی نہیں کر سکتا اور یہ تصور تک نہیں کر سکتا کہ وہ شرک کی غلاظت سے آلودہ ہو رہا ہے لیکن زبان رسالت نے اسے متعدد بار مختلف پیرائے میں شرک سے تعبیر فرمایا ہے۔

ٹھیک یہی حال "بدعت" کا بھی ہے۔

بدعت اس کی مضرتیں اور کامل و مکمل اور لازوال شریعت کے ساتھ اس کا تضاد۔ کسی ایسی چیز کو جس کو اللہ و رسول نے دین میں شامل نہیں کیا اور اس کا حکم نہیں دیا، دین میں شامل کر لینا

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "دستور حیات" ص ۸۱ و ۸۲ مؤلفہ مولانا علی میاں ندوی مدظلہ

اس کا ایک جز بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لیے کرنا اور اس کے خود ساختہ شرائط وآداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک حکم شرعی کی پابندی کی جاتی ہے" بدعت" ہے، بدعت درحقیقت دین الہٰی کے اندر شریعتِ انسانی کی تشکیل اور" ریاست اندرونِ ریاست" ہے۔ اس شریعت کی الگ فقہ ہے اور مستقل فرائض وواجبات اور سنن ومستحبات، جو بعض اوقات شریعت الہٰی کے متوازی اور بعض اوقات تعداد اور اہمیت میں اس سے بڑھ جاتے ہیں، بدعت اسی حقیقت کو نظر انداز کرتی ہے کہ شریعت مکمل ہو چکی، جس کا تعین ہونا تھا اس کا تعین ہو گیا اور جس کو فرض و واجب بننا تھا وہ فرض وواجب بن چکا، دین کی ٹکسال بند کر دی گئی اب جو نیا سکّہ اس کی طرف منسوب کیا جائے گا وہ جعلی ہوگا۔

امام مالک نے خوب فرمایا:

"من ابتدع فی الاسلام بدعۃ یراھا حسنۃ فقد زعم ان محمداً صلی اللہ علیہ وسلم خان الرسالۃ فان اللہ سبحانہ یقول" الیوم اکملت لکم دینکم" فما لم یکن یومئذٍ دیناً، فلا یکون الیوم دیناً۔[1]

جس نے اسلام میں کوئی بدعت پیدا کر دی اور اس کو وہ اچھا سمجھتا ہے وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے (نعوذ باللہ) پیغام پہنچانے میں خیانت کی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" کہ میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا" پس جو بات عہدِ رسالت میں دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔

شریعت منزل من اللہ کی خصوصیت، اس کی سہولت اور اس کا ہر ایک کے لیے ہر زمانہ میں قابل عمل ہونا ہے اس لیے کہ جو دین کا شارع ہے وہ انسان کا خالق بھی ہے وہ انسان کی ضروریات، اس کی فطرت اور اس کی طاقت وکمزوری سے واقف ہے۔

---

۱ ؎ روایت ابن الماجشون عن الامام مالکؒ۔

"اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ" (سورۃ الملک) (اور بھلا) کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا اور وہ باریک بیں (اور) پورا باخبر ہے۔

اس لیے تشریع الٰہی اور شریعت سماوی میں ان سب چیزوں کی رعایت ہے مگر جب انسان خود شارع بن جائے گا تو اس کا لحاظ نہیں رکھ سکتا، بدعات کی آمیزشوں اور وقتاً فوقتاً اضافوں کے بعد دین اس قدر دشوار، پیچ دار اور طویل ہو جاتا ہے کہ لوگ مجبور ہو کر ایسے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار دیتے ہیں اور "مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ" (خدا نے تمہارے لیے دین میں تنگی نہیں رکھی) کی نعمت سلب کر لی جاتی ہے، اس کا نمونہ عبادات ورسوم اور فرائض وواجبات کی اس طویل فہرست میں دیکھا جا سکتا ہے جس میں بدعت کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کا موقعہ ملا ہے۔

دین وشریعت کی ایک خصوصیت اس کی عالمگیر یکسانی ہے، وہ ہر زمانہ اور ہر دور میں ایک ہی رہتا ہے دنیا کے کسی حصہ کا کوئی مسلمان باشندہ دنیا کے کسی دوسرے حصہ میں چلا جائے تو اس کو دین وشریعت پر عمل کرنے میں نہ کوئی دقت پیش آئے گی نہ کسی مقامی ہدایت نامہ اور رہبر کی ضرورت ہوگی اس کے برخلاف بدعات میں یکسانی اور وحدت نہیں پائی جاتی، وہ ہر جگہ کے مقامی سانچہ اور ملکی یا شہری ٹکسال سے ڈھل کر نکلتی ہیں، وہ تاریخی یا مقامی اسباب اور شخصی وانفرادی مصالح واغراض کا نتیجہ ہوتی ہیں اس لیے ہر ملک بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بعض اوقات ایک ایک صوبہ اور ایک ایک شہر اور گھر گھر کا دین مختلف ہو سکتا ہے[۱]

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حال پر کبھی قائم ہی نہیں رہ سکتی، اس میں اضافے ہی ہوتے چلے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ "بدعت" کوئی ہلکی یا معمولی برائی نہیں ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے، یہ تو اپنی فطرت، ساخت اور مزاج کے لحاظ سے سراسر "ضلالت" اور "گمراہی" ہی ہے۔

مملکت عالم کے لیے جس "دستور جاودانی" کی ضرورت تھی اسے بہ تمام وبہ کمال نباضِ فطرت نے

۱؎ بحوالہ "دستور حیات" ص ۸۴ تا ۸۶

انسان کو عطا فرما دیا اور اس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی کہ اب قیامت تک اس میں اضافہ یا اپنی طرف سے کچھ کمی کی جاسکے۔

انہی دائمی، ابدی، اور لازوال مصالح و حکم کی بنیاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالفاظ صریح اپنی امت کو "بدعت" سے بچنے کی تاکید بلیغ فرمائی۔

"من احدث فی امرنا او فی روایۃ او فی دیننا ھٰذا مالیس فیہ فھو رد۔" (متفق علیہ)

جس شخص نے ہمارے اس امر میں اور ایک روایت میں ہے ہمارے دین میں کوئی نئی چیز نکالی جو اس میں داخل نہیں تھی تو وہ بات مسترد اور ناقابل قبول ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

"ایاکم والبدعۃ فان کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار" (بحوالہ مشکوٰۃ شریف)

بدعت سے ہمیشہ بچو، اس لیے کہ بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں ہوگی!

ایک اور جگہ حکیمانہ پیش گوئی فرمائی کہ جب کسی جگہ کوئی بدعت اختیار کی جاتی ہے تو وہاں سے اس کے عوض ایک سنت اٹھالی جاتی ہے۔

الفاظ ہیں:

ما احدث قوم بدعۃ الا رفع بھا مثلھا من السنۃ (مسند امام احمد)

جب کچھ لوگ دین میں کوئی نئی بات پیدا کرتے ہیں تو اس کے بقدر کوئی سنت ضرور اٹھ جاتی ہے۔

گویا دوہری محرومی اور خسران، ایک تو بدعت کا گناہ دوسرے سنت کی برکت سے محرومی!

ایک اور موقع سے فرمایا گیا کہ دین میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے انتہائی غضب کا مستحق ہوگا۔

ان سارے نصوص و ارشادات کی روشنی میں کس کو جرأت اور ہمت ہوسکتی ہے کہ "دین و شریعت" کے معاملات میں خود ساختہ "بدعات و خرافات" کو داخل کرے سوائے اس کے جو

عنداللہ اپنے آپ کو جواب دہی سے آزاد اور شرعی حدود و قوانین سے اپنے آپ کو بالاتر رکھے!

بدعت کا شرعی مفہوم لغوی اعتبار سے "بدعت" ہر اس کام کو کہا جائے گا جو نیا نیا کیا گیا ہو اور اس سے پہلے اس پر عمل نہ ہوا ہو لیکن شریعت میں یہ لغوی مفہوم مراد نہیں بلکہ مراد صرف وہ نئے کام ہیں جنھیں دین کا جزء اور حصہ بنایا جارہا ہو[1] قرآن مجید کی آیت کریمہ:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ۝" (البقرہ)

اے ایمان والو! داخل ہوجاؤ اسلام میں پورے اور مت چلو قدموں پر شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

آیت بالا کے فوائد کے ذیل میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ خامہ فرسا ہیں کہ "اسلام کو پورا پورا قبول کرو، یعنی ظاہری و باطنی اور عقیدہ اور عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو، یہ نہ ہو کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی کلمہ تسلیم کرلو یا کوئی عمل کرنے لگو سو اس سے "بدعت" کا قلع قمع مقصود ہے کیوں کہ بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا کسی عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شامل کرلیا جائے مثلاً نماز اور روزہ جو کہ افضل عبادات ہیں اگر بدون حکم شریعت کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے جیسے عید کے دن عیدگاہ میں نوافل پڑھنا یا ہزارہ روزہ رکھنا تو بدعت ہوگا۔

خلاصہ ان آیات کا یہ ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو چند حضرات یہودیوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے مگر احکام اسلام کے ساتھ احکام تورات کی بھی رعایت کرنی چاہتے تھے مثلاً ہفتہ کے دن کو معظم سمجھنا اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام ماننا اور تورات کی تلاوت کرنا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس سے بدعت کا انسداد کامل فرمایا گیا شیطان اپنے وسوسے سے بے اصل چیزوں کو تمہارے دل نشین کردیتا ہے اور دین میں بدعات

---

[1] بدعت کیا ہے؟ ص ۲۶۰۔

کو شامل کرا کر تمہارے دین کو خراب کرتا ہے اور تم اس کو پسند کرتے ہو۔"[۵]

بدعت کے عظیم نقصانات اسلامی تاریخ کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ کرنا دشوار نہ ہوگا کہ مسلمانوں اور اسلام کو اگرچہ غیر مسلم اقوام و ملل سے بارہا شدید نقصانات پہنچے ہیں اور عصر حاضر میں بھی طرح طرح کی سازشوں، صہیونیت، سامراجیت اور باطل قوتوں کے پردے میں پہنچائے جارہے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ سب کچھ خارجی حملے ہیں جن کا دفاع کرنا اور احقاقِ حق کرنا چنداں دشوار نہیں لیکن دور حاضر میں جن عظیم نقصانات اور خسارہ کا . . . نام نہاد مسلمانوں بلفظ دیگر "آستین کے سانپوں" کی وجہ سے ہوا ہے یہ وہی بدعت پسند طبقہ اور جماعت ہے جس نے توحید خالص ہیں شرکیات کی آمیزش اور سنت نبوی میں بدعات و خرافات کی تخلیط و شیوع اور منظم انداز میں پھیلاؤ ہے۔

یہ نام نہاد فرقہ اس دور میں جس اسلام کا اپنے قول و عمل سے مظاہرہ کر رہا ہے بے شبہ وہ حقیقی اسلام (وہ اسلام جو حضور ختمی مآب صلی اللہ علیہ وسلم فداہ روحی نے پیش فرمایا تھا) سے کوسوں دور ہے۔ انھوں نے دین میں اپنے طور پر (اور زیادہ صحیح الفاظ میں اپنے نان و نوش، تن و توش، مرغ و ماہی اور حلوے مانڈے کی خاطر) نئی نئی چیزیں معتقدات اور اعمال میں شامل کر کے دین کو چوں چوں کا مربہ بنا رکھا ہے۔ جن چیزوں کا شریعت مطہرہ میں وجود تو دور کی بات ایک واقعی اور مخلص و موحّد مسلمان کے لیے تصور بھی زیب نہیں دیتا اور نوبت بایں جا رسید کہ امت کے ناخواندہ اور عام افراد کو اصل و نقل اور سنت و بدعت کے درمیان تمیز کرنی بھی مشکل ہو رہی ہے حالانکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک و کفر کے بعد جس چیز کو پوری شدت اور نبوی جاہ و جلال کے ساتھ رد کیا تھا وہ دین میں "بدعت" کے ایجاد اور اختراع کا مسئلہ ہے۔ بطور نمونہ اور مدعا کے اثبات کی خاطر صرف دو مستند اور معتبر حدیثیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے اہل نظر اور متلاشیان حق مسئلہ کی نوعیت اور نزاکت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں!

---

[۵] بحوالہ ترجمہ شیخ الہند، اسیر مالٹا ص ۴۰-۴۳ مدینہ پریس بجنور۔

معمولاً پیغمبر اسلام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فکر انگیز اور بصیرت افروز خطبے میں فرمایا کرتے تھے:۔

" ان خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الہدی ھدی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) وشر الامور محدثاتھا و کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار " (مسلم شریف)	بلاشبہ بہترین کلام اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ و طرز عمل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل اور طریقہ ہے اور بدترین چیز نوایجاد بدعات ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔

حدیث نبویؐ کی شرح کرتے ہوئے برصغیر کے مشہور نقاد اور اہل قلم جناب ماہر القادری (رح) نے اپنے فاضلانہ مقالہ "نقش اول" میں لکھا ہے:

" اس حدیث میں ہر بدعت کو گمراہی کہا گیا ہے' اس میں بدعت کی قسمیں نہیں کی گئی ہیں کہ یہ تو بدعت سیئہ ہے اور یہ بدعت حسنہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "کل بدعۃ" فرماکر ہر "بدعت" کے "ضلالت" ہونے کی تصدیق فرمادی ہے"۔

ایک دوسرے ارشاد گرامی جس میں سنت پر مواظبت اور استقامت کے ساتھ "بدعت" سے اجتناب کلی اور مکمل پرہیز کی تاکید کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

" علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثۃ بدعۃ وکل بدعۃ ضلالۃ (بحوالہ ترمذی شریف)	لازم پکڑو میرے طریقے کو اور خلفائے راشدین کے طریقوں کو جنھیں اللہ نے ہدایت دی ہے' اس پر بھروسہ کرو اور اس کو دانتوں سے پکڑو اور خبردار دین میں نئی نئی باتوں سے بچے رہنا ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

صحابہ کرام رضؓ کا مزاج اور بدعت سے تنفر و بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں جو قدسی الاصل جماعت منصۂ شہود پر آئی، توحید و رسالت اور عقیدۂ آخرت کے پاسبان دین کے

مزاج شناس اور رمز داں، رضوان خداوندی کے حامل، دین متین کے صحیح ترجمان، اور صالح فکروذہن کا وہ مبارک گروہ جنھیں "اصحاب النبیؐ" کے لقب سے دنیا جانتی اور پہچانتی ہے، ذرا دین میں "بدعت" کے معاملہ میں ان حضرات کے موقف اور مسالک پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے اور پھر خود ہی فیصلہ کیا جائے کہ بدعات وخرافات سے ان حضرات کو کس درجہ نفرت، بعد اور کبیدگی ہے۔

"ایک شخص نے اپنے کسی عزیز بچے کے ختنہ پر کچھ لوگوں کو بلا لیا، اس پر صحابہ کرامؓ نے اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں "ختنہ" کے لیے نہ کوئی اعلان ہوتا تھا اور نہ لوگوں کو اکٹھا کیا جاتا تھا۔"[1]

خلیفۂ اول سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں اگرچہ بدعات بہت کم پیدا ہوئیں تاہم جب کبھی کسی بدعت کا ظہور ہوا تو انھوں نے اس کو مٹا دیا۔ ایک دفعہ حج کے موقع پر قبیلہ احمس کی ایک عورت کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ کسی سے گفتگو نہیں کرتی انھوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا اس نے خاموش حج کا ارادہ کیا ہے یہ سن کر اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا یہ جاہلیت کا طریقہ ہے، اسلام میں جائز نہیں تم اس سے باز آجاؤ اور بات چیت کرو، اس نے کہا: آپ کون ہیں؟ بولے ابوبکرؓ!۔[2]

یقیناً دینی معاملات میں ہر اس "بدعت" "احداث" اور "جدت" کو ٹھکرا دیا جائے گا جس کے لیے قرآن وسنت میں دلیل نہ ملتی ہو اور بقول شخصے ع۔

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں

حجر اسود جس کی پاکی اور تقدس ہر ایک کے نزدیک مسلم ہے ظہور اسلام سے پیشتر ایام جاہلیت میں بھی جس کے تقدس اور احترام میں فرق نہیں آیا جسے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

---

[1] ملاحظہ ہو بدعت کی پہچان۔ ص
[2] بحوالہ سیرت خلفاء راشدین ج ۱ ص ۶۲

لبہائے مبارک سے بارہا بوسہ دیا ہے اور چوما ہے اور کروڑوں صالحین اور اولیاء اللہ نے اس کو چھوا اور بوسہ دیا ہے۔ ایک موقعہ پر اسے مخاطب کر کے خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"رأیت عمرؓ یقبّل الحجر ویقول لا علم انک حجر ما تنفع ولا تضر ولو لا انی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبلک ما قبلتک۔"

(بحوالہ بخاری شریف)

(عابس ربیعہؒ کہتے ہیں) کہ میں نے حضرت عمرؓ کو حجر اسود چومتے دیکھا کہ وہ کہتے جاتے تھے کہ میں جانتا ہوں تو پتھر ہے نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو تجھے میں ہرگز بوسہ نہ دیتا۔

اسلام میں شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کو بوسہ دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کو اپنے زمانہ خلافت میں جب اس کا موقع پیش آیا تو اس خیال سے کہ ایسا نہ ہو کہ پتھر کو بوسہ دینے سے کبھی مسلمانوں کو یہ دھوکہ ہو کہ اس میں بھی الٰہی شان ہے لہذا بوسہ دے کر کھڑے ہو کر مذکورہ بالا فقرہ فرمایا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس درخت کے نیچے (صلح حدیبیہ کے موقع سے) تقریباً چودہ سو جاں نثار صحابہ کرامؓ سے بیعت لی تھی اور جس کا ذکر خود قرآن کریم میں آیا ہے:

"لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ"

یہ درخت برکت کا کتنا بڑا اثر اور نشان بن سکتا تھا مگر سیدنا عمر فاروق نے یہ دیکھ کر کہ لوگ اس درخت کے پاس کثرت سے آنے جانے لگے تھے اور خطرہ ہو گیا تھا کہ عقیدت کا غلو کہیں مسلمانوں کو کسی بے اعتدالی میں مبتلا نہ کردے اور آنے والی نسلیں اس درخت کو "نشان عظیم" نہ بنا لیں۔ حضرت عمرؓ نے اس درخت کو ہی سرے سے کٹوا دیا۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو سیرت خلفائے راشدین جلد اول ص۱۶۵۔

[2] بحوالہ بدعت کیا ہے؟ ص۱

بدعت شریعت کی نظر میں مردود اور ناقابل اجر وثواب ہونے پر جملہ دلائل وشواھد ایک طرف اور امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہ چند تاریخی جملے ایک طرف، غور کیا جائے کس قدر صفائی، قطعیت اور سلیقہ سے حضرت نے اپنا نقطۂ نظر واضح فرمایا ہے:

"ان رجلاً یوم العید اراد ان یصلی قبل صلوٰۃ العید فنھاہ علیؓ فقال الرجل یا امیر المومنین انی اعلم ان اللہ لا یعذب علی الصلوٰۃ، فقال علی وانی اعلم ان اللہ لا یثیبہٗ علی فعلٍ حتی یفعلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او یحث علیہ فتکون صلوٰتک عبثاً والعبث حراماً۔

(بحوالہ مجمع البحرین)

ایک شخص نے عید کے دن ارادہ کیا کہ نماز عید سے پہلے کچھ نماز پڑھے اسے حضرت علیؓ نے روکا، اس نے کہا یا امیر المومنین! میں جانتا ہوں کہ اللہ نماز پڑھنے سے عذاب نہیں دے گا۔ حضرت علی نے فرمایا اور میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے فعل پر جسے نہ تو رسول اللہ نے خود کیا ہو نہ اس کا ایما فرمایا ہو، ثواب نہیں دیتا بس تیری نماز فعل عبث ہوگی اور فعل عبث حرام ہے!!

اس میں شک نہیں کہ نماز نفل پڑھنا ایک ثواب کا کام ہے مگر چونکہ نماز عید سے پہلے نفل نماز پڑھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول نہیں تھا اور نہ کبھی آپؐ نے اس کا امر فرمایا اس لیے یہ فعل عبث اور خودساختہ عمل (بدعت) ٹھہرایا جائے گا۔

وارثین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور عاملین شریعت کا بدعتوں اور رسم ورواج کے خلاف جہاد۔

ہندوستان کے نامور مفکر اور اہل قلم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی مدظلہٗ اپنی تازہ تصنیف "دستور حیات" میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"صحابۂ کرامؓ اور ان کے بعد ائمہ وفقہائے اسلام اپنے اپنے وقت کے مجددین ومصلحین اور علمائے ربانی نے ہمیشہ اپنے اپنے زمانہ کی بدعات کی سختی سے مخالفت کی اور اسلام کے معاشرہ اور دینی حلقوں میں ان بدعات کو مقبول ورواج پذیر ہونے سے روکنے کی جان توڑ کوشش کی۔

ان بدعات میں عوام اور خوش عقیدہ لوگوں کے لیے جو مقناطیسی کشش ہر زمانہ میں رہی ہے اور ان سے پیشہ ور، دنیادار مذہبی گروہوں اور افراد کے جو ذاتی مفادات وابستہ رہے ہیں جن کی تصویر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس معجزانہ آیت میں کھینچی ہے:

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ، لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (سورۃ التوبہ)	اے ایمان والو! اکثر احبار و رہبان لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں۔!

⁂ ⁂ ⁂

اس کی بنا پر ان کو سخت مخالفتوں اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور اس کو اپنے وقت کا جہاد، اور شریعت کی حفاظت کا اور دین کو تحریف سے بچانے کا مقدس نام سمجھا۔ ان مخالفین بدعت اور حاملین لواءِ سنت کو اپنے زمانہ کے عوام یا خواص کالعوام سے "جامد" "روایت پرست" "مذہب دشمن"[1] وغیرہ خطابات ملے لیکن انھوں نے کوئی پرواہ نہیں کی، ان کی اس لسانی اور قلمی جہاد "احقاق حق اور ابطال باطل" سے بہت سی بدعات کا اس طرح خاتمہ ہوا کہ ان کا معاشرہ و تمدن کی بعض تاریخوں میں ذکر رہ گیا ہے اور جو باقی ہیں ان کے خلاف علمائے حقانی اب بھی صف آرا رہیں گے[2]

"مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ ج فَمِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ زصلے وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا۔" (سورۃ الاحزاب)	ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے نکلے پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور بعضے ان میں مشتاق ہیں اور انھوں نے ذرا تغیر و تبدل نہیں کیا۔

---

[1] اور کہیں کہیں "وہابی" کا خطاب ملا، (مؤلف)

[2] بحوالہ دستور حیات ص ۸۷ و ۸۸۔

شرک و بدعت اور مبالغہ آمیز عقیدت و غلو کے رد میں اور توحید خالص اور سنت نبوی کی حمایت میں صحابۂ کرام رضی کا یہی طرز فکر ہے جو ہر دور کے صالحین اور علماء حق کے قول و عمل میں کارفرما رہا ہے۔ مثلاً متقدمین میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیم الجوزیؒ، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ، شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، رئیس المفسرین امام رازیؒ، حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندی، وغیرہ اسی طرح متاخرین میں خانوادۂ حضرت شاہ ولی اللہ امام الدہلویؒ مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی، مولانا اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم النانوتویؒ، حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ کثر اللہ امثالہم، اور عصر حاضر میں مسلک اہل سنت والجماعت کے ترجمان علمائے دیوبند اور ان کے ہم خیال و متفق المشرب علماء، اور صاحب عزیمت اسلامی مفکرین کے افکار و خیالات، معتقدات و نظریات اور ردّ شرک و بدعت میں "مزاجِ صحابہ و سلف" ہی کارفرما ہے۔

حقیقی صوفیاء کرام بدعات و محدثات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں

بدعات و محدثات حضرات صوفیاء کی نظر میں حقیقی صوفیاء کرام بدعات و محدثات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کا طرز عمل کیا رہا ہے، ذیل میں اکابر صوفیاء کی آراء مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظمؒ کی مرتبہ کتاب "ثمرات الاوراق" سے اخذ کرکے پیش کیا جا رہا ہے، قارئین ملاحظہ فرمائیں:

"بدعات اور محدثات کے ایجاد کرنے والے اور ان پر عمل کرنے والے عموماً حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ طریقت کی پناہ لیتے ہیں اور انہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، یہاں تک کہ بہت سے عوام اس خیال میں ہیں کہ طریقت و شریعت دو متضاد چیزیں ہیں، بہت سے احکام جو شریعت میں ناجائز ہیں اہل طریقت ان کو جائز قرار دیتے ہیں اور یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ اس میں مبتلا ہونے کے بعد دین و ایمان کی خیر نہیں، کیونکہ انسان کو تمام گمراہیوں سے بچانے والی صرف شریعت ہے جب اس کی مخالفت کو جائز سمجھ لیا گیا تو پھر ہر گمراہی کا شکار ہو جانا سہل ہے اسی لیے مناسب معلوم ہوا کہ حضرات صوفیائے کرام اور مشائخ طریقت کے ارشادات، بدعات

کی مذمت" اور اتباع سنت کی تاکید میں بقدر کفایت جمع کیے جائیں تاکہ عوام اس دھوکہ سے بچ جائیں کہ مشائخ طریقت بدعات کو مذموم نہیں سمجھتے یا اتباع سنت میں متساہل تھے۔ اس سال میں علامہ شاطبی نے اپنی کتاب "الاعتصام ص۸۱ جلد نمبر ۱" میں ایک مستقل فصل قائم کی ہے جس میں صوفیائے متقدمین کے ارشادات درباره مذمت بدعات جمع کیے ہیں، ہمارے لیے ان کا ترجمہ کر دینا کافی ہے، وھی ھذا:

امام طریقت حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ "جو شخص کسی بدعتی کے پاس بیٹھتا ہے کو حکمت نصیب نہیں ہوتی"۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمانے کا قرآن کریم میں وعدہ فرمایا ہے، فرمایا "اُدْعُونِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ" مگر ہم بعض کاموں کے لیے زمانہ دراز سے دعا کر رہے ہیں قبول نہیں ہوتی اس کا کیا سبب ہے۔ ؟ آپ نے فرمایا تمہارے قلوب مر چکے ہیں اور مردہ دل کی دعا قبول نہیں ہوتی اور موت قلب کے دس سبب" اول یہ کہ تم نے حق تعالیٰ کو پہچانا مگر اس کا حق ادا نہیں کیا دوسرے تم نے کتاب اللہ پڑھی مگر اس پر عمل نہیں کیا، تیسرے تم نے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ تو کیا مگر آپ کی سنت کو چھوڑ بیٹھے (اور بدعت اختیار کر لی) چوتھے شیطان کی دشمنی کا دعویٰ کیا مگر اعمال میں اس کی موافقت کی، پانچویں تم کہتے ہو کہ ہم جنت کے طالب ہیں مگر اس کے لیے عمل نہیں کرتے اسی طرح پانچ چیزیں اور شمار کرائیں،

غرض اس حکایت کی نقل سے یہ ہے کہ ابراہیم بن ادہم نے ترکِ سنت کو موتِ قلب کا سبب قرار دیا۔

حضرت ابوبکر دقاق قدس سرہ جو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کے معاصر ہیں فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اس میدان میں سے گذر رہا تھا، جہاں چالیس سال تک بنی اسرائیل قدرتی

۱؎ لیکن خاکسار یہاں موضوع سے متعلق ہی آرام تحریر کر رہا ہے۔ ۱۲-

طور پر محصور رہے اور نکل نہ سکتے تھے جس کو وادی "تیہ" کہا جاتا ہے اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گذرا کہ علم حقیقت، علم شریعت سے مخالف ہے، اچانک بے غیبی آواز آئی "کل حقیقة لا تتبع با لشریعة فھو کفر" یعنی جس حقیقت کی موافقت شریعت نہ کرے وہ کفر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ "بدعت" شریعت اور سنت کی ضد ہے اس لیے اس پر جتنا نکیر کیا جائے کم ہے۔

حضرت ابو علی جوزجانیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ اتباع سنت کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا کہ "بدعات" سے اجتناب اور ان عقائد و احکام کا اتباع جس پر علمائے اسلام کے صدر اول کا اجماع ہے اور ان کی اقتدار کو لازم سمجھنا!

حضرت ابو بکر ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ "کمال ہمت"[1] اس کے تمام اوصاف کے ساتھ سوائے اہل محبت کے کسی کو حاصل نہیں ہوئی اور یہ درجہ ان کو محض اتباع سنت اور ترکِ "بدعت" کی وجہ سے حاصل ہوا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے زیادہ صاحب ہمت اور سب سے زیادہ واصل الی اللہ تھے۔!

حضرت ابراہیم بن شیبانؒ حضرت ابو عبداللہ مغربیؒ اور حضرت ابراہیم خواصؒ کے معاصر واصحاب میں سے ہیں، "بدعات" سے سخت متنفر اور مبتدعین پر سخت رد کرنے والے، کتاب وسنت پر مضبوطی سے قائم اور مشائخ ائمہ متقدمین کے طرز کا التزام کرنے والے تھے، یہاں تک کہ عبداللہ بن منازلؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ابراہیم بن شیبانؒ" تمام فقرا اور اہل آداب ومعاملات پر خدا کی طرف سے ایک حجت ہیں۔

حضرت ابو یزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تیس سال مجاہدات کیے مگر مجھے کوئی مجاہدہ علم اور اتباع علم سے زیادہ شدید نہیں معلوم ہوا اور علمار کا اختلاف نہ ہوتا تو میں مصیبت میں

---

[1] یہ ایک تصوف کی اصطلاح ہے۔۱۲

پڑجاتا، بلاشبہ علماء کا اختلاف رحمت ہے (مگر وہ اختلاف جو تجرید توحید میں ہو کہ وہ رحمت نہیں) اور اتباع صرف " اتباعِ سنت " کا نام ہے (کیونکہ علم سنت کے علاوہ دوسری چیز علم کہلانے کی مستحق نہیں)

ایک مرتبہ ایک بزرگ ان کے وطن میں تشریف لائے شہر میں ان کی ولایت اور بزرگی کا چرچا ہوا، حضرت ابو یزیدؒ نے بھی زیارت کا قصد کیا اور اپنے ایک رفیق سے کہا، چلو! ان بزرگ کی زیارت کر آئیں۔ ابو یزیدؒ اپنے رفیق کے ساتھ ان کے مکان پر تشریف لے گئے، یہ بزرگ گھر سے نماز کے لیے نکلے جب مسجد میں داخل ہوئے تو جانب قبلہ تھوک دیا ابو یزیدؒ یہ حالت دیکھتے ہی واپس آگئے اور ان کو سلام بھی نہ کیا، اور فرمایا یہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب میں سے ایک ادب پر مامون نہیں کہ اس کو ادا کر سکے اس لیے کیا توقع رکھی جائے کہ یہ کوئی ولی اللہ ہو؟

امام شاطبیؒ اس واقعہ کو " کتاب الاعتصام " میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت ابو یزیدؒ کا یہ ارشاد اصل عظیم ہے جس سے معلوم ہوا تارک سنت کو درجۂ ولایت حاصل نہیں ہوتا، اگرچہ ترک سنت بوجہ ناواقفیت کے ہوا ہو! اب آپ اندازہ کریں کہ جو اعلانیہ ترک سنت اور " احداثِ بدعت " پر مُصر ہوں ان کو بزرگی اور ولایت سے دور کا بھی کوئی واسطہ ہو سکتا ہے؟؟

حضرت ابو حفص حدّاد سے " بدعت " کی حقیقت دریافت کی گئی تو فرمایا کہ احکام میں تعدّی یعنی حدود شرعیہ سے تجاوز کرنا اور تہاون فی السنن یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سستی کرنا اور اتباع الآراء والاھواء یعنی اپنی خواہشات اور غیر معتبر آراءِ رجال کی پیروی اور " ترک الاتّباع والاقتداء " یعنی سلفِ صالح کے اتباع اور اقتدا کو چھوڑنا۔ اور کبھی کسی صوفی کو کوئی حالت رفیعہ امرِ صحیح کے اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہوئی۔

حضرت حمدون قصّارؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگوں کے اعمال پر احتساب اور دار و گیر کسی شخص پر کب جائز ہوتی ہے؟ فرمایا کہ جب وہ یہ سمجھے کہ یہ احتساب اور امر بالمعروف مجھ پر فرض کیا گیا ہے (فرض ہونے کی صورت یہ ہے کہ جس کو امر بالمعروف کیا جائے گا وہ اس کا ماتحت

اور تحت القدرت ہو یا یہ یقین ہو کہ وہ ہماری بات مان لے گا (وغیر ذالک) یا یہ خوف ہو کہ کوئی انسان "بدعت" میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے گا اور اس کو یہ گمان ہو کہ ہمارے کہنے سننے سے اس کو نجات ہو جائے گی۔!

حضرت ابو عثمان حیریؒ کی وفات کے وقت جب آپ کا حال متغیر ہوا تو صاحبزادے نے بوجہ شدتِ غم و الم کے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، ابو عثمانؒ نے آنکھ کھولی اور فرمایا بیٹا! ظاہر اعمال میں خلاف سنت کرنا یہ باطن میں ریا ہونے کی علامت ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اپنے نفس پر قول و فعل میں سنت کو حاکم بنا دے گا وہ حکمت کے ساتھ گویا ہوگا اور جو قول و فعل میں خواہشات و ہوا کو حاکم بنا دے گا وہ "بدعت" کے ساتھ گویا ہوگا، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے "وان تطیعوہ تھتدوا" یعنی اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے!!

حضرت ابراہیم خواصؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ عافیت کیا چیز ہے؟ تو فرمایا:

" دینٌ بلا بدعة وعمل بلا آفة وقلبٌ بلا شغل، ونفسٌ بلا شهوة " دین بغیر "بدعت" کے عمل بغیر آفت کے (یعنی بدعات و مخترعات کی آفتیں اس میں شامل نہ ہوں) اور قلب فارغ جس کو غیر اللہ کا شغل نہ ہو اور نفس جس میں شہوت (کا غلبہ) نہ ہو اور فرمایا: حقیقی صبر یہ ہے کہ احکام کتاب و سنت پر مضبوطی سے قائم ہو۔

بدعتی کے لیے انتباہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تمام سابقہ مذاہب و ادیان کے فسخ اور ناقابل عمل ہو جانے کے اسباب میں سے ایک سبب وہ "بدعات و اختراعات" ہیں جو رفتہ رفتہ جزء مذہب ہو کر اس کی اصل صورت کو اس طرح بدل دیتی ہیں کہ بانیانِ مذاہب کی صحیح تعلیم اور متبعین کی جدت طرازیوں میں امتیاز و تفریق کی بھی دشواری ہو جاتی ہے۔ مذہب اسلام کے جملہ احکامات و مسائل مکمل، مدلل اور مفصل ہونے کے ساتھ ساتھ چونکہ اب قیامت تک کے لیے معمول بہا ہیں اس لیے دین کے فسخ اور معطل ہونے کا تو سوال ہی نہیں، البتہ جو ایسی ناپاک سازش اور گھناؤنا جرم کا مرتکب

ہوگا اور طرہ یہ کہ اپنے آپ کو اہلِ اسلام اور مسلمانوں میں شمار کرانے پر اپنے طور پر اصرار بھی کرتا ہوگا تو اسے جہلِ مرکب اور شیطانی فریب سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کو جو بدعت اور بدعتی کے معاملہ میں مداہنت یا نرم گوشہ رکھتے ہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنبیہ اور صریح پیش گوئی یاد رکھنی چاہیے۔ صحیحین کی مستند اور معتبر روایت کے الفاظ ہیں:

"عن سهل بن سعدٍ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم انى فرطكم على الحوض من مرّ علىّ شرب ومن شرب لم يظمأ ابداً .... علىّ اقوام اعرفهم ويعرفوننى، ثمّ يحال بينى وبينهم، فاقول انهم منى! فيقال انك لا تدرى ما احدثوا بعدك فاقول سُحقاً سُحقاً لمن غيّر بعدى۔" (بخاری ومسلم)

سہل ابن سعدؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں حوض کوثر پر تم سب سے پہلے جاؤں گا۔ جو کوئی حوض کوثر کی طرف آنکلے گا اور (آب کوثر) پیئے گا تو اسے پھر کبھی پیاس نہیں لگے گی، البتہ میرے پاس کئی فرقے آئیں گے کہ میں ان کو پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھ کو پہچانتے ہوں گے پھر میرے اور ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جائے گا تو میں کہوں گا یہ لوگ تو میرے ہیں۔ (یعنی میری امت ہیں) اس پر کہا جائے گا آپؐ نہیں جانتے کہ ان لوگوں نے آپؐ کے بعد (دین میں) کیا کیا نئی باتیں (بدعات) نکالی تھیں۔ تب میں کہوں گا: مجھ سے دور ہوں دور ہوں وہ لوگ جنھوں نے میرے بعد میرے دین کو متغیر کر دیا۔!!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسے بے غبار اور واضح ارشاد کو پیش کر دینے کے بعد اب قطعاً اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس سلسلہ میں مزید کچھ عرض کیا جائے کہ "بدعت" کے ایجاد و اختراع سے خود "بدعتی" کو کتنا بڑا بھاری اور عظیم اُخروی نقصان ہے، بھلا کیا ٹھکانہ اس راندۂ درگاہ آدمی کا؟ اور کتنی حرماں نصیبی ہے اس بدنصیب انسان کے لیے جسے سردارِ دو جہاں، رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے دور کر دیں، اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا

بدعتی سے میل جول اور توقیر کی ممانعت | متقدمین اور امت کے عبقری علماء کی تصانیف میں تو "اہل بدعت" سے میل جول اور خلاملا رکھنے سے بھی شدت کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے اس لیے کہ "الصحبۃ مؤثرۃ" کے حکیمانہ اصول کے تحت "بدعات وخرافات" سے نفرت کا ایمانی جذبہ مضمحل اور کمزور نہ پڑ جائے اور ایک مسلمان اس سے چشم پوشی اور مداہنت کو روا رکھے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "اہل بدعت" کی تعظیم وتوقیر کی ان لفظوں میں ممانعت فرمائی ہے:

"من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام"

(بحوالہ مشکوٰۃ شریف)

کہ جس شخص نے کسی "بدعتی" کی تعظیم وتوقیر کی تو اس نے اسلام کی عمارت کے ڈھانے میں تعاون کیا۔

بدعتی کا یہ احساس اور جذبہ کس قدر بھیانک اور اندوہناک ہے کہ نعوذ باللہ اللہ ورسول سے کچھ ایسی باتیں قصداً یا عمداً بیان کرنے سے رہ گئی ہوں گی جن کے کرنے سے آخرت سنور جائے گی اور روحانیت کا بلند مقام حاصل ہو جائے گا۔ یہ خیال آنا ہی کس قدر گمراہ کن اور ضلالت آمیز ہے، ہر حساس مسلمان بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔

بدعت اور اجتہاد | یہ اختیار کسی کو نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی نیا طریق عبادت، کوئی جدید طریق پرستش اور کوئی خود ساختہ اصل وفرع دین میں بڑھا سکے اور نہ گھٹا سکے۔

ہاں اتنا اختیار ضرور ہے کہ جن امور ومسائل کے لیے وضاحت اور صراحت کے ساتھ کھلے احکام بیان نہیں کیے گئے ہیں سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں نت نئے مسائل اور الجھنوں کا پیش آنا ان سارے عصری مسائل کے بہترین حل کے لیے دین کے دیگر احکام اور اصولوں کی روشنی میں اجتہاد اور غور وفکر اور استنباط سے کام لیا جائے گا۔ اجتہاد اور بدعت کے فرق کے سلسلے میں اتنا بتا دینا اور سمجھ لینا کافی ہے کہ "بدعت" اور "اجتہاد" میں زمین و آسمان کا فرق ہے "بدعت"

ضلالت اور گمراہی ہے جب کہ "اجتہاد" دین کی ضرورت اور مطالبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجتہد کو نیک نیتی اور دین کی خیر خواہی کے سبب غلطی کر جانے پر بھی اجر ملتا ہے۔[۱]

موجودہ زمانہ میں بدعات کا فروغ بدقسمتی سے موجودہ دورِ ہوا و ہوس میں پورے برصغیر میں "بدعات و خرافات" کا ایک لامتناہی اور طویل سلسلہ ہمیں نظر آتا ہے اور اکثر جگہوں میں عبادات کے ہر ہر جزء پر کسی نہ کسی صورت میں بدعت اپنا ڈیرا ڈالے ہوئے ہے۔ اس مختصر سے مقالہ میں نہ ہر ہر بدعت کی تفصیل بیان کی جا سکتی ہے اور نہ محدود صفحات میں اس کی گنجائش ہے البتہ موقع کی مناسبت سے ایک عمومی مرض "قبر پرستی" اور قبروں کے ساتھ "شرک و بدعت کا مظاہرہ اور معاملہ" کا تذکرہ ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے اور اسی سے ؎

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

قبر پرستی ہندوستان کی دینی اور مذہبی تاریخ سے جن حضرات کو دلچسپی ہے اور انھوں نے پوری دیانت داری سے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو محسوس کیے بغیر بھلا کیسے رہ سکتے ہیں کہ جب جاہلیت کے مشرکانہ اور دیومالائی تصورات نے عام مسلمانوں پر حملہ کیا اور اکثریت کو خالص توحید کی شاہراہ سے ہٹا کر "بدعت" اور "ضلالت" کی بے شمار راہوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا تو کھلم کھلا اور اعلانیہ شرک اور بت پرستی تو نہ ہو سکی باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بری طرح ملوث نہ ہو گیا ہو۔ غرض پرست اور مفاد پرست علمائے سوء نے نہ صرف ان کی ہر ہر قدم پر مدد کی بلکہ آگے بڑھ کر سرپرستی بھی کی۔ انھوں نے بڑی دیدہ ریزی اور دلیری سے آیات بینہ اور احادیث صریحہ کی غلط تاویل اور تشریح کی اور توڑ مروڑ کر اسلام میں اولیا پرستی اور قبر پرستی کی جگہ نکال لی، مشرکانہ اعمال و افعال کے لیے اسلام کی اصطلاحی زبان میں الفاظ کا ذخیرہ بہم پہنچائے اور ذہن سازی کی اس طرح مہم چلا رکھی اور فضا و ماحول کو کچھ اس طرح ہموار اور سازگار بنا لیا کہ ورڈ یار اللہ تعالیٰ کی پناہ!!

---

[۱] تفصیل کے لیے دیکھیے "بدعت کیا ہے؟" مرتبہ مولانا عامر عثمانی مرحوم۔

ایک واقعہ | مشہور عالم و محدث امام ابوبکر شیبہؒ نے اپنی کتاب "مصنّف" میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی مدینہ طیبہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار انور کے قریب کھڑے ہو کر کچھ عرض و معروض کر رہا تھا حضرت امام زین العابدین ابن حسین رضی اللہ عنہ نے ایسا کرنے سے اسے منع فرمایا اور کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے :

"لا تتخذوا قبری وثناً"　　یعنی مری قبر کو بُت نہ بنانا۔

مشروع زیارت | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قبورِ صحابہؓ کی زیارت کو تشریف لے جاتے تو ان کے حق میں دعا فرماتے اور خود افسوس کرتے اور عبرت حاصل کرتے، یہی وہ زیارتِ قبور ہے جو امت کے لیے مسنون ہے اور مشروع ہے اور اس میں یہ کہنے کا حکم دیا گیا ہے:

"السلام علیکم اھل الدیار من المومنین والمسلمین وانّا انشاء اللہ بکم لاحقون نسئل اللہ لنا ولکم العافیۃ۔"

اے دیار مومنین و مسلمین کے رہنے والو! تم پر سلام ہو ہم انشاء اللہ تم سے مل جانے والے ہیں، اللہ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت چاہتے ہیں۔

قبروں کی توہین و تعظیم | سنت نبویؐ یہ ہے کہ قبروں کی توہین نہ کی جائے، انھیں روندنا، ان پر بیٹھنا یا ان سے ٹیک لگانا ممنوع ہے۔ قبروں کی تعظیم بھی ممنوع ہے۔ انھیں مسجد قرار دینا، ان کے پاس یا اُن کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا، عرس کرنا، لوگوں کا ان کے گرد جمع ہونا، روشنی کرنا، یہ سب باتیں ناروا ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والوں پر لعنت کی ہے[۱] لیکن آج کل کیا ہو رہا ہے؟ پوری قبر پرستی جاری ہے، قبروں پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہیں جن میں نقرئی و طلائی دروازے لگے ہوئے ہیں، سنگ مرمر کا فرش ہے، قیمتی چادریں اور پردے لٹکے ہوئے ہیں، مسلمان ان کے گرد طواف اور رکوع و سجود و قیام میں مصروف ہیں، منتیں مانی جاتی ہیں، دعائیں کی جاتی ہیں اور خدا سے زیادہ "اصحاب قبور" پر بھروسہ کیا جاتا ہے، سب سے زیادہ جس بات پر دل شق

---

[۱] بحوالہ اسوۂ حسنہ ترجمہ و اختصار زاد المعاد لابن قیمؒ صفحہ ۲۱۲۔

ہوتا جو وہ بہت سے "مدعیانِ علم وتصوف" کا طرزِ عمل ہے یہ لوگ اپنی ذاتی اغراض ومنفعت کے لیے "قبر پرستی" کو اور بھی رواج دیتے ہیں، جھوٹی اور موضوع حدیثوں سے اس کا جواز ثابت کرتے ہیں اور طرح طرح کی ضلالتوں اور فریبوں سے کام لے کر عوام کو اس گمراہی میں باقی رکھنا چاہتے ہیں اگر کوئی خدا کا بندہ اس بدعت وضلالت پر معترض ہوتا ہے تو اسے "وہابی" "نیچری" "دہریہ" وغیرہ طرح طرح کے نام دیتے ہیں اور عوام میں بدنام کرتے ہیں حالانکہ یہ نہیں سمجھتے کہ محض دنیا کے دوں پر اپنی آخرت بگاڑ رہے ہیں اور اسلام کی توہین وتنزل کے خود باعث بن رہے ہیں حال میں ایک واقعہ سننے میں آیا جس سے نہایت عبرت ہوئی مسلمانوں کی عبرت کے لیے درج کرتا ہوں۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۲۰ء میں جب اکثر ہندو مسلم لیڈر عرس کے موقعے پر اجمیر گئے تھے تو ان میں یو.پی کے سب سے بڑے ہندو لیڈر نے "عرس کی تمام رسمیں" اور مزار کے گرد لوگوں کا طواف وسجود دیکھ کر انتہائی مسرت اور خلوص نیت سے کہا "لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے لیکن آج یہاں کی حالت دیکھنے کے بعد مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد بالکل ممکن ہے" کیونکہ درحقیقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں واقعی کوئی فرق نہیں۔ ہم بتوں کے سامنے جھکتے ہیں اور مسلمان قبروں کے سامنے، ہمارے رام، لچھمن کرشن اور مہادیو ہیں اور مسلمانوں کے .... پھر ہم میں اور مسلمانوں میں فرق ہی کیا رہا؟ صرف ناموں کا فرق ہے جو حقیقت میں کوئی وقعت نہیں رکھتا" یہ اس نیک دل ہندو رہنما کا خیال ہے جو "اجمیر" کی حالت دیکھ کر اسے پیدا ہوا، مسلمانوں کے پاس اس کا کیا جواب ہے۔؟

تعجب ہے کہ انسان خدا کو حاضر وناظر، سمیع وبصیر، حی وقدیم اور اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب تسلیم کر لینے کے بعد غیر اللہ کی طرف کیوں رجوع کرتا ہے۔؟

کیا یہ قبریں خدا سے زیادہ قدرت رکھتی ہیں؟ کیا یہ بزرگ خدا سے سفارش کر سکتے ہیں؟ کیا معاذ اللہ خدا تمہارے ظاہر وباطن سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے؟ جو اسے ان مُردے

ہوئے آدمیوں کی یاد دہانی کی ضرورت ہو؟ پھر انسانی عظمت و خودداری کے یہ بالکل منافی ہے کہ انسان پتھر کے بتوں یا اینٹ یا چونے کی قبروں کے سامنے جھکے جو اپنے اوپر سے ایک مکھی بھی اڑانے کی قدرت نہیں رکھتیں۔ مسلمان روتے ہیں کہ ہم تباہ حال ہیں مگر جب تک تم یہ کفر و شرک و توہم پرستی نہ چھوڑ دوگے اس وقت تک خوش حالی و سُرخ روئی سے دو چار نہ ہوسکوگے۔ اپنی بربادی کی تاریخ پر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ اس کا آغاز اسی وقت سے ہوا جب سے تم میں یہ باتیں آئیں، سینکڑوں برس "قبر پرستی" کا بھی تجربہ کر چکے اور دن دونی رات چوگنی بربادی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا، کیوں نہ ایک مرتبہ خدا پرستی کا بھی تجربہ کرلو! کہ جس میں ایک مرتبہ (صدر اول) میں کامیاب ہوچکے ہو اور ایسے کامیاب کہ اب تک دنیا تمہاری افسانہ خواں ہے[1]

عام بدعت | افسوس صد افسوس قرآن و سنت کے صریح احکام کے بالکل برعکس رواج پانے والی "بدعات" ہیں، غالباً سب سے زیادہ بدتر لیکن سب سے زیادہ عام بدعت "قبر پرستی" ہے جو کافی مقبول ہوچکی ہے اور جس کی بہت سی صورتیں شرک جلی میں داخل ہیں۔

ہمارے سامنے آج تک ایک بھی دلیل ایسی نہیں آئی جس سے معلوم ہوسکتا کہ مروجہ "قبر پرستی" قرآن یا حدیث کے کس حکم یا اصول کے تحت اختیار کی گئی ہے ہمیں تو غور و فکر اور مطالعہ کے بعد یہی اندازہ ہوا کہ قبر پرستی کی تمام تر عمارت محض جہل و نادانی، نفس پرستی اور اندھی تقلید پر کھڑی ہوئی ہے۔ آپ کے غور و فکر کے لیے چند نصوص پیش خدمت ہیں۔

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجلسوا علی القبور ولا تصلوا الیھا"	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبروں پر مت بیٹھو! اور ان کی طرف رُخ کر کے نماز نہ پڑھو۔

اگر کسی کو اس سے یہ غلط فہمی ہو کہ یہاں تو قبر پر چڑھ کے بیٹھنے کو منع کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ کبھی اور کہیں بھی ایسا نہیں دیکھا گیا یا سنا گیا کہ لوگ قبروں پر چڑھ کے بیٹھتے ہوں۔

---

[1] بحوالہ اسوۂ حسنہ صہ ۲۱۳ و ۲۱۴

لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو اس معنی میں لینا گویا رسول اللہ ؐ پر یہ الزام رکھنا ہے کہ آپ ؐ عبث باتیں بھی فرمایا کرتے تھے (نعوذ باللہ) ظاہر ہے کہ منع اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو زیر عمل آئی ہو، زیر عمل یہی چیز آتی رہی ہے کہ لوگ قبروں کے پاس بیٹھتے اور اس کو متبرک سمجھتے رہے ہیں، باقاعدہ درگاہیں بنی ہیں - اور وہاں نیازمندیوں کے مختلف پیرائے اختیار کیے گئے ہیں اسی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ لوگ حضرت آدم ؑ اور حضرت یوسف ؑ کو سجدے کیے جانے کی دلیل سے قبروں اور غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا جواز لاتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کرنا تو درکنار قبروں کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے تک کو منع فرمایا ہے کہ اس میں اشتباہ کا اندیشہ ہے اور قبر کو سجدہ کرنے کا ایہام ہو سکتا ہے پھر یہ بھی نہ کہا جائے کہ نماز تو چوں کہ قبلہ رُخ ہو کر پڑھنی چاہیے اس لیے قبر کی طرف نماز پڑھنے کو منع فرمایا یہ حکم رسول ؐ بلاشبہ اسی صورت میں ہے جب کہ قبر قبلہ کی طرف واقع ہو رہی ہو ورنہ کون دیوانہ مسلمان ہوگا جو قبلہ کے سوا کسی طرف منہ کر کے نماز پڑھے گا۔؟

مسلم اور ترمذی میں ہے:-

"قال علیؓ رضی اللہ عنہ الا ابعثک علی ما بعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان لا تدع تمثالاً الا طمستہ ولا قبراً مشرفاً الا سویتہ"

حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ میں تمہیں اس مہم پر نہ بھیجوں جس پر رسول اللہ نے مجھے بھیجا تھا؟ یہ کہ تم کسی بت کو مٹائے بغیر نہ رہو اور کسی اونچی قبر کو برابر کیے بغیر نہ چھوڑو۔

یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امام الاتقیا خلیفۂ چہارم، رسول اللہ ؐ کے داماد حضرت علی رضؓ فرما رہے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

"لما نزل برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طفق یطرح خمیصۃ لہ علی

رسول اللہ ؐ پر جب جاں کنی کی کیفیت طاری ہوئی تو آپ ؐ نے چہرے پر چادر کھینچ لی جب سانس

وجهه واذا اغتم كشفها عن وجهه وهو كذالك فقال لعنة الله على اليهود والنصارى، اتخذوا قبور انبياءهم مساجد، يحذر ما صنعوا ولولا ذالك ابرز قبره غير انه خشى ان يتخذ مسجداً"

(بخاری ومسلم)

گھٹتا چادر ہٹا دیتے اسی عالم میں فرمایا یہود ونصارا پر اللہ کی لعنت جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا، ایسا کہہ کر آپؐ امت کو اس طرح کی حرکتوں سے ڈرا رہے تھے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو خود رسول اللہ کی قبر شریف بھی کھلی رکھی جاتی لیکن اس خوف سے کہ اسے عبادت گاہ بنالیا جائے گا بند رکھا گیا۔

اندازہ کیجیے، قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی نفرت وکراہت تھی۔ بہت ہی کم آپؐ کسی کے لیے "لعنت اللہ" کہا کرتے تھے لیکن اس فعل کے کرنے والوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جاں کنی کے عالم میں کس دل سوزی سے لعنت بھیج رہے ہیں۔ پھر انبیاء کی قبور کا جب یہ معاملہ ہو تو ان لوگوں پر کس قدر لعنت برسے گی جو انبیاء سے بہت کم درجہ بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنائے ہوئے ہیں۔؟[له]

اس مرض عام اور وبا پر گرفت کرتے ہوئے کم وبیش آٹھ سو صدی پیشتر شیخ التفسیر امام زماں علامہ فخر الدین رازیؒ نے کھل کر تنقید فرمائی ہے اور لکھا ہے:

"انهم وضعوا هذه الاصنام والاوثان على صور انبيائهم واكابرهم وزعموا انهم متى اشتغلوا بعبادة هذه التماثيل فان اولئك الاكابر تكون شفعاءهم عند الله تعالى ونظيره فى هذا الزمان اشتغال

یعنی جو بت پرست اصنام واوثان اپنے انبیا واکابر کی صورتوں پر تراشتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہوں گے تو اکابر اللہ تعالیٰ کے پاس ہماری شفاعت کریں گے۔ اس کی نظیر اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں سے مشغولیت ہے اس

له　تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "بدعت کیا ہے؟" ص ۲۴۹ تا ۵۰۔

کثیر من الخلق بتعظیم قبور الاکابر علی	اعتقاد ہے کہ اگر ہم ان قبروں کی تعظیم کریں گے
اعتقاد انھم اذا عظموا قبورھم	تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے شفیع ہوں گے۔
فانھم یکونون شفعاء ھم عند اللہ تعالیٰ"	

٭ ٭ ٭

امام رازیؒ نے آج سے صدیوں قبل جو تصویر اور منظر کشی کی ہے، کیا یہ واقعہ کے عین مطابق نہیں ہے ؟؟

آخری بات | مسلمانو! خوب سوچ لو، سمجھ لو، موت تو انسان کی بے خبر ساتھی ہے اس لیے خواب غفلت سے بیدار ہو جاؤ! منکرات اور محرماتِ شرعیہ کا مرتکب مسلمان تو ممکن ہے کسی بھی وقت اپنے افعال شنیعہ پر شرمندہ ہو کر توبہ و استغفار کرلے کیونکہ وہ بہر حال ایک گناہ کو گناہ سمجھ کر کر رہا ہے۔ عمل میں کوتاہی اور خامی ضرور ہے لیکن عقیدہ خالص اور فائینل (Genuine) ہے۔ مگر "بدعتی" کے لیے توبہ کا امکان بھی بہت کم ہے کیوں کہ وہ "بدعت" کو دین کی ایک اہم ضرورت سمجھ کر خالص ثواب اور اجر کی نیت سے انجام دیتا ہے پھر ایسی صورت میں اسے توبہ کی توفیق ہی کہاں ہوگی ؟ الا ماشاء اللہ!

"اللّٰھم حفظنا والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ"

تبصرے

افادات آزاد: از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری۔
تقطیع متوسط، ضخامت ۱۸۰ صفحات، کتابت و طباعت کاغذ اور گٹ اپ بہتر
قیمت -/25۔ پتہ: مکتبہ شاہد علی گڑھ کالونی، کراچی ۱۴

اللہ تعالیٰ ارباب علم و ادب کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری کو کہ پاکستان میں رہ کر مولانا ابوالکلام آزاد پر ایسا مفید اور اہم کام مسلسل کر رہے ہیں جس کی توفیق ہمارے ملک میں آج تک کسی کو نہیں ہوئی، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مولانا کا یا مولانا پر کسی لکھنے والے کا ایک ایک لفظ فراہم کر رہے اور اپنے فاضلانہ مقدمہ، تبصرہ اور حواشی کے ساتھ بکمال اہتمام شائع کر رہے ہیں، چنانچہ اب تک وہ مولانا پر متعدد بڑی مفید اور معلومات افزا کتابیں منظر عام پر لا چکے ہیں، زیر تبصرہ کتاب بھی اسی زنجیر طلائی کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں بڑی محنت اور تلاش و جستجو کے بعد فاضل مرتب نے مولانا کے ان ارشادات کو یکجا کر دیا ہے جو آپ نے مختلف حضرات کے دینی، علمی اور ادبی استفسارات کے جوابات میں فرمائے تھے اور ان کو خود آپ نے تحریر کیا تھا یا آپ کی جانب سے محمد اجمل خاں صاحب نے لکھا تھا۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے، ایک دینی اور دوسرا ادبی، حصہ اول میں ایمان، دعا، تدعوبالآیات قرآن و حدیث اور متعدد مسائل وہ فقہیہ مثلاً نکاح و طلاق اور چند جدید مسائل مثلاً زندگی کا بیمہ سود، پروویڈنٹ فنڈ، رویت ہلال کی خبر بذریعہ ریڈیو یا ٹیلی فون یا ٹیلیگرام وغیرہ اور فوٹو اور اسٹیچو ان مسائل کے علاوہ بعض مسائل تصوف، تعلیم و اصلاح اور رسوم مثلاً فاتحہ نذر و نیاز، یوم میلاد النبی اور سلام و قیام فی المیلاد ان سب کے متعلق مولانا نے اظہار خیال فرمایا ہے جو بہت بصیرت افروز اور تشفی بخش ہے۔ دوسرا حصہ جو ادبی ہے

اس میں مولانا نے ایک سو نواسی (۱۸۹) استفسارات کے جوابات دیے ہیں جو مولانا کی وسعت علم اور ذوق ادبی پر دال ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اس ایک کتاب کے مطالعے سے مولانا کے مذہبی عقائد و افکار اور ان کی ادبی معلومات اور علمی وسعت نظر کے متعلق جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ مولانا کے حالات و سوانح پر بڑی بڑی ضخیم کتابوں سے حاصل نہیں ہوتی اور ان جوابات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وسعت علم و نظر کے ساتھ ساتھ مولانا کا علم　تھا اس لیے بڑے سے بڑے علمی اور پیچیدہ سوال کا جواب وہ برجستہ اور فوراً دے دیا کرتے تھے۔ شروع میں فاضل مرتب کے قلم سے دیباچہ ہے اس مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں کس درجہ محنت شاقہ برداشت کی ہے اس کے بعد مولانا کے پرائیوٹ سکریٹری محمد اجمل خاں مرحوم کا نوشتہ ایک مقدمہ ہے امید ہے ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔ (س)

سنہ ۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔ تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس [illegible] کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء — حضرت عمر کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب و [illegible]

سنہ ۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو [illegible] حضرت ابوبکر صدیق کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ، عروج و زوال کا الٰہی نظام

سنہ ۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، عرب و نیل
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

سنہ ۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم ، تاریخ ردۂ سرکشی ضلع بجنور ، علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمان کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ،
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر ، ایشیا میں آخری نو آبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ، مرد عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

سنہ ۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، تین تذکرے ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ، خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ، انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

No. D. (DN) 231 PHONE : 262815 AUGUST 1984

. 965—57 Subs. 40- Per Copy Rs. 3-50

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

عبدالرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

ٹائیٹل جلال پریس جامع مسجد دہلی ۶

ستمبر ۱۹۸۴ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

قیمت سالانہ: چالیس روپے

مرتب
سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنّفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوّف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ" تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

سالانہ چندہ
چالیس روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۳	ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ مطابق ستمبر ۱۹۸۴ء	شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

تأثرات

یہ امر باعثِ مسرت و اطمینان ہے کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی کو جب کبھی موقع ملتا ہے اسلام پر بڑی شاندار، معنی خیز اور دقیق و توجہ طلب تقریر کرتی ہیں، چنانچہ دسمبر ۱۹۸۰ء میں نئی دہلی میں اسلام کی پندرہویں صدی تقریبات کے سلسلہ میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے جو خطبہ انگریزی میں اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ (مارچ ۱۹۸۱ء) کے موقع پر جو خطبۂ افتتاحیہ اردو میں پڑھا تھا، یہ دونوں خطبے اس درجہ شاندار تھے کہ عالمِ اسلام میں ان کی دھوم مچ گئی تھی اور اسلامی پریس نے مدح وستائش کے عنوانات سے اس کی اشاعت نمایاں طریقہ پر کی تھی۔

وزیر اعظم کو ایسا ہی ایک موقع پھر اس وقت ملا جب کہ ۲۴ اگست ۱۹۸۴ء کو نئی دہلی میں انھوں نے پندرہ کروڑ روپے کی لاگت سے تعمیر ہونے والے ایک ہندوستانی اسلامی ثقافتی مرکز کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر وزیر اعظم اندرا گاندھی نے حسب معمول ایک بلیغ تقریر کی اور اس میں پہلے اکھنڈ بھارت کے ان علم برداروں کی تردید کرتے ہوئے جو کہتے ہیں کہ اسلام ہندوستان کا مذہب نہیں ہے اور مسلمان اس ملک کے شہری نہیں ہیں، وزیر اعظم نے بڑی قوت سے کہا کہ "اسلام ایک ہزار برس سے ہندوستان کی تاریخ کا ایک جزء لاینفک ہے اور دونوں کا رشتہ اٹوٹ ہے،

اس کے بعد وزیر اعظم نے اس لین دین کا ذکر کیا ہے جو ان کے بقول اسلام اور ہندوستان کے درمیان ہوا ہے، اگرچہ محترمہ نے اس مفروضہ کی زیادہ وضاحت نہیں کی اور اس موقع پر اس کی ضرورت تھی بھی نہیں، تاہم اس سے اشارہ اس تاریخی حقیقت کی طرف تھا کہ اسلام نے جین پراکرت کے اس ملک کو معنوی اور صوری، روحانی اور مادی طور پر بنانے، سنوارنے اور متحد و مستحکم کرنے میں جو نہایت اہم رول ادا کیا ہے وہ تاریخ کے ایسے تابندہ و روشن نقوش ہیں جن کا اعتراف ناگزیر ہے، اسلام نے اس ملک کی پرانی تہذیب اور سماجی قدروں کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس پوری مدت میں سماج اور مذہب میں اصلاح کی غرض سے جو تحریکیں پیدا ہوئی ہیں ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ ان پر اسلامی تعلیمات کا اثر ہے اور خود ڈاکٹر تاراچند جنھوں نے

Infuance of Islam on Indian Culture

جیسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی ہے اور ان جیسے دوسرے روشن خیال ہندو مؤرخین نے کھلے دل سے اس کا اعتراف کیا ہے، اسلام نے اس ملک کو ہزاروں صوفیاء اور مشائخ دئے جن کی خانقاہیں دردمند اور مصیبت زدہ انسانوں کے لئے داروئے تسکین و تسلی مہیا کرتی تھیں اور جن کے انفاس قدسیہ دلوں میں خدا کی یاد اور خلق خدا پر شفقت و رحمت کے جذبہ کی لہر رواں دواں کردیتے تھے، اور ہزاروں دانشور اور اصحاب کمال و فن دئے جن کی صنعت گری اور ہنرمندی کا نمونہ تاج محل اور وہ عمارتیں ہیں جو ملک میں پھیلی ہوئی ہیں اور زبان حال سے گویا ہیں:

تلك آثارنا تدل علينا
فانظروا بعدنا الى الآثار

پھر مسلمانوں نے اس ملک کو گل و گلزار کس طرح بنایا اس کی داستان خود جہانگیر کی زبانی تزک جہانگیری میں سنئے، یہ داستان دلچسپ بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی۔

یہ ان احسانات کا تذکرہ تھا جو اسلام نے ہندوستان پر کیے ہیں۔ اب رہی وہ چیزیں جو ہندوستان نے اسلام (صحیح: مسلمانوں) کو دی ہیں، وزیر اعظم نے ان سب کے مجموعہ کا نام "ہندوستانیت" رکھا ہے، مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں اجنبی کی حیثیت میں آئے لیکن یہاں کی آب و ہوا، فضا اور ماحول اس درجہ مرغوب اور پسندیدہ خاطر ہوئے کہ مسلمان یہیں رہ پڑے اور اس ملک کی بود و باش اس طرح اختیار کر لی کہ جن ملکوں سے آئے تھے ان سے ان لوگوں کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور وہ زبان، کلچر، اور عادات و رسوم کے اعتبار سے "ہندوستانی" ہو گئے، یہ "ہندوستانیت" کسی ایک خاص قوم یا ملت کا ورثہ نہیں ہے، بلکہ ہندوستان میں رہنے والے تمام ارباب مذاہب و ملل کا ایک مشترک سرمایہ اور اثاثہ ہے اور اس بنا پر اس ملک کے لوگوں میں رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے اختلافات کے باوجود unity in diversity پیدا ہوئی جو اس ملک کا نشان امتیاز ہے اور جس کی قدر ہم سب کو کرنی چاہئے۔"

وزیر اعظم نے یہ جو کچھ فرمایا اس کی صداقت میں کیا کلام ہو سکتا ہے، لیکن آخر میں انھوں نے اس بات پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں میں آخر کار "بنیاد پرستی" پیدا ہوئی اور اس نے اس ملک کے مشترکہ سرمایہ (unity) کو برباد کر دیا۔ اگرچہ وزیر اعظم کے نزدیک اس جرم کے مرتکب تنہا مسلمان نہیں،

بلکہ اور لوگ بھی ہیں، تاہم اس سلسلہ میں ہم دو باتیں گذارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:
(۱) اولاً یہ کہ لفظ "بنیاد پرستی" اگر fundamentalism کا ترجمہ ہے تو یہ درست نہیں، اگرچہ اب عام طور پر اس لفظ کا استعمال اس معنی میں کیا جارہا ہے، ہماری رائے میں اس لفظ کا صحیح ترجمہ ہوگا "اصول کی سخت پابندی" یا "مذہبی کٹرپن" اور اس معنی کے اعتبار سے fundamentalism مذموم اور ناپسندیدہ صفت نہیں بلکہ محمود اور مطلوب ہے، کیونکہ کسی شخص کے مذہبی ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں، اگر وہ اپنے مذہب کے اصول وضوابط پر سختی سے کاربند نہیں ہے۔

---

(۲) ثانیاً یہ کہ جی ہاں! اس ملک کا سرمایۂ وحدت قومی برباد ہوا، لیکن fundamentalism کے ہاتھوں نہیں، بلکہ جیسا کہ ڈاکٹر سید محمود مرحوم نے اپنی انگریزی کتاب (Hindu Muslim Unity) میں بڑی وضاحت سے اور مدلل بیان کیا ہے: اس بربادی کی ذمہ دار وہ تحریک احیائیت (Ravivalism) ہے جو انگریزوں کے زیر اثر برادران وطن میں پیدا ہوئی۔ اگر اس تحریک کا مقصد مذہب کا احیاء اور اس کی تجدید و اصلاح ہوتا تو یہ تحریک بہت مفید ہوتی، لیکن اس تحریک کی غرض وغایت خالص سیاسی تھی اور مذہب کو اس کے لئے آلۂ کار بنایا گیا تھا۔ اس کا ردعمل مسلمانوں پر ہوا۔ سرسید احمد خاں نے اپنی سیاست کا رخ بدل دیا اور مسلمانوں میں ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جن کا مقصد سیاسی تھا لیکن یہاں بھی مذہب کو بحیثیت ایک حربہ کے استعمال کیا گیا تھا۔ آج ملک میں جو صورت حال ہے وہ ہندو اور مسلمانوں کی اسی قدیم فرقہ وارانہ سیاست

کا نتیجہ ہے، مذہب کا ہرگز اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اگر اس کا تعلق مذہب سے ہوتا تو آج حکومت ہند کے تعلقات عرب اور دوسری مسلم حکومتوں سے دوستانہ اور خوشگوار نہ ہوتے، یہ وہ نکتہ ہے کہ اگر حکومت اور برادران وطن کے ذہن نشین ہوجائے تو ملک کو بہت سی مصیبتوں سے نجات مل جائے۔

افسوس ہے مدیر برہان کی علالت و ناسازئ طبع کے باعث "مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی" کی دوسری قسط اس مرتبہ شریکِ اشاعت نہ ہوسکی۔

تصحیح

گذشتہ ماہ کے شمارہ میں صفحہ اول پر جلد ۹۴ اور شمارہ ۱۶ درج ہوگیا ہے اور انگریزی مہینہ کا اندراج ہونے سے رہ گیا ہے۔ صحیح اس طرح ہے:

جلد ۹۳ شمارہ ۲ اور اگست ۱۹۸۴ء

براہ کرم اس کی تصحیح کرلیں۔

عبید الرحمٰن عثمانی

مینیجر برہان

درر نظامی کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت

پروفیسر محمد اسلم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(۱)

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کے مریدوں میں سے امیر حسن علاء سنجری، علی بن محمود جاندار، خواجہ محمد بن مولانا بدر الدین اسحاق اور خواجہ عزیز الدین صوفی نے بالترتیب فوائد الفؤاد، درر نظامی، انوار المجالس اور تحفۃ الابرار و کرامۃ الاخیار کے عنوانات سے اپنے مرشد گرامی کے ملفوظات جمع کیے تھے۔ مؤخر الذکر دونوں بزرگوں کی کاوشیں اب ناپید ہیں۔ امیر حسن علاء سنجری کی تالیف فوائد الفؤاد کو شہرتِ دوام ملی ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے علی بن محمود جاندار کے جمع کردہ ملفوظات کے دو مخطوطے دریافت ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک مخطوطہ سر سالار جنگ میوزیم حیدر آباد دکن میں محفوظ ہے[1] اور دوسرا نسخہ بوہار کلکشن کلکتہ میں موجود ہے[2]۔ راقم السطور کو بھارت کے آخری سفر کے دوران میں ان

---

[1] مخطوطہ نمبر ۲۶۰/۵۹۹/۶۱۔ مخزونہ سر سالار جنگ میوزیم حیدر آباد، دکن۔

[2] اوٹوگراف نمبر ۲۶۴، سیمینار لائبریری شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

دونوں مخطوطوں سے استفادہ کرنے کی سعادت ملی ہے۔

جامع ملفوظات

درر نظامی میں علی بن محمود جاندار نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ سے بیعت ہونے کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے قاضی محی الدین کاشانی کے توسط سے بیعت کی درخواست پیش کی جو منظور ہوئی۔ ان کی دوسری درخواست پر سلطان المشائخ نے انھیں محلوق ہونے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ جامع ملفوظات نے قاضی صاحب کے توسط سے یہ بھی حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ مقروض ہیں اس لئے نوکری ترک نہیں کر سکتے۔ ان کی یہ درخواست بھی منظور ہوئی[۳]

بیعت کے بعد علی بن محمود نے سلطان المشائخ سے قرآن پاک حفظ کرنے کی اجازت مانگی۔ حضرت نے اجازت دیتے ہوئے انھیں یہ نصیحت فرمائی کہ وہ قرآن حکیم کسی اچھے قاری سے ابو عمر عاصم رحمہ اللہ کی روایت سے پڑھنا سیکھیں[۴]

درر نظامی کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جامع ملفوظات ۱۳ رمضان المبارک ۷۰۸ھ (۱۳۰۸ء) کو حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کے حلقۂ مریدی میں داخل ہوا تھا[۵]

علی بن محمود لکھتے ہیں کہ وہ اور مولانا الشیبانی ہر ہفتے حضرت نظام الدین اولیاء،

---

[۳] درر نظامی، مخطوطہ سر سالار جنگ میوزیم، ورق ۳۱ ب۔

[۴] ایضاً، ورق ۳۰ ب۔

[۵] ایضاً، ورق ۳۹ ب۔

کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور وہاں جو باتیں سنتے تھے، انھیں نقل کر لیتے تھے[۶]۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس مجموعۂ ملفوظات کا نام "درر نظامیہ" تحریر فرمایا ہے[۷] لیکن مذکورہ بالا دونوں مخطوطوں میں متن میں اس کا نام درر نظامی لکھا ہے[۸]، اس لئے میں اسے ہی صحیح سمجھتا ہوں۔

جامع ملفوظات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رح نے ان کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ موصوف سلطان المشائخ کے مرید تھے اور انھوں نے خلاصۃ اللطائف کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ شیخ محدث نے اس کتاب سے ایک مختصر سی عربی عبارت بھی نقل کی ہے[۹]۔

درر نظامی کے ایک اندراج سے یہ معلوم ہوا کہ علی بن محمود کا ایک بیٹا مسمی ابوالقاسم تھا جو بچپن میں فوت ہو گیا تھا[۱۰]۔

درر نظامی کا زمانۂ تالیف

امیر حسن علاء سنجری نے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ کی ایک مجلس کے

۶۔ ایضاً، ورق ۲ ب۔

۷۔ خلیق احمد نظامی، "ملفوظات کی اہمیت"، مقالہ مشمولہ نذر عرشی، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء، ص ۴۳۶۔

۸۔ درر نظامی، ورق ۲ الف ــــ "این رسالہ را درر نظامی نام کردہ شد۔"

۹۔ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۹۴-۹۵۔

۱۰۔ درر نظامی، ورق ۵ ب۔

ملفوظات ۱۳ صفر ۷۱۹ھ کی تاریخ کے تحت درج کیے ہیں۔ یہ مجلس فوائد الفواد کے آخر میں ہے اور درر نظامی کی ابتدا میں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ جس زمانے میں فوائد الفواد قریب الاختتام تھی ان دنوں علی بن محمود درر نظامی کا آغاز کر رہے تھے۔ اس حساب سے اس تصنیفِ دلپذیر میں زیادہ تر مواد فوائد الفواد کی تکمیل کے بعد کا ہونا چاہیے۔

درر نظامی کے مندرجات

درر نظامی میں امام غزالی، جار اللہ زمخشری اور عین القضاۃ کے حوالے ملتے ہیں۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی تصانیف سلطان المشائخ کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ حضرت کو حدیث پر عبور تھا۔ موصوف علمی مباحث میں حدیث سے استدلال کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود ملفوظات میں کئی موضوع حدیثیں بھی آگئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شب معراج میں آنحضرتؐ کو بارگاہ ایزدی سے خرقہ ملا تھا۔[۱۱]

بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

درر نظامی میں بابا فرید کے بارے میں بڑا مواد موجود ہے۔ یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس سے استفادہ نہیں کیا۔ شاید اس کی وجہ درر نظامی کی کمیابی ہو۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ابتدا میں بابا فریدؒ ہانسی میں رہتے تھے۔ جب وہاں ان کی شہرت کا آوازہ بلند ہوا تو انھوں نے نقل مکانی میں ہی عافیت جانی۔ موصوف ہانسی سے اپنے آبائی وطن کوٹھے وال

---

[۱۱] ایضاً، ورق ۴۹ ب۔

تشریف لے گئے[۱۲] یہ مجہول سی جگہ تھی اس لئے وہاں معاش کم تھی۔ ملتان نزدیک ہونے کی وجہ سے بابا صاحب وہاں بھی مستور نہ رہ سکے اس لئے موصوف لاہور چلے گئے۔ یہ ایک بڑا شہر تھا جو آبِ روال (راوی) کے کنارے آباد تھا۔ اس لئے وہاں ان کا جی نہ لگا۔ اس زمانے میں اجودھن ایک مجہول سا گاؤں تھا اس لئے حضرت وہاں تشریف لے گئے اور اپنی زندگی کے آخری ۲۴ سال وہیں گذارے[۱۳]

اس ملفوظ سے بابا فریدؒ کا لاہور میں قیام ثابت ہے۔ جس جگہ ان دنوں ضلع کے دفاتر ہیں، وہاں ان کی رہائش گاہ موجود ہے[۱۴]

حضرت نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ بابا فریدؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ پیر مرید کے لئے مشاطہ کا حکم رکھتا ہے۔ بابا صاحب اپنے مریدوں کو کسی شخص کی امانت اپنے پاس رکھنے سے منع کرتے تھے[۱۵] ایک روز سلطان المشائخ نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ بابا فرید الدینؒ نہ ہی کسی سے اُدھار لیتے اور نہ ہی مال جمع کرتے تھے۔ اُن کے پاس جو کچھ آتا اسے خرچ کر ڈالتے اور اگر کچھ نہ آتا تو صبر کرتے تھے۔ بابا فریدؒ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے کہ فقیر کو اُدھار نہیں لینا چاہیئے[۱۶]

---

[۱۲] کوٹھے وال پر ملاحظہ کیجئے راقم الحروف کا مضمون، ماہنامہ المعارف لاہور، بابت ماہ جولائی ۱۹۸۳ء۔

[۱۳] درر نظامی، ورق ۹۲ ب۔

[۱۴] نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۲۔

[۱۵] درر نظامی، ورق ۴۹ ب۔

[۱۶] ایضاً، ورق ۵۹ ب۔

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ ایک روز بابا فریدؒ نے سماع سننے کی خواہش ظاہر کی۔ اتفاق سے اس روز کوئی قوال وہاں موجود نہ تھا۔ بابا صاحب نے حضرت بدرالدین اسحاقؒ کو بلاکر کہا کہ وہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ کا خط لائیں۔ موصوف "خریطۂ مکتوبات" اٹھا لائے اور اس میں سے قاضی صاحب کا خط تلاش کرلیا۔ بابا فریدؒ نے انھیں حکم دیا کہ وہ کھڑے ہوکر خط پڑھیں۔ جب انھوں نے یہ رباعی پڑھی :

آں عقل کجا کہ در کمالِ تو رسد   آں روح کجا کہ در جلالِ تو رسد
گیرم کہ تو پردہ برگرفتی زجمال   آں دیدہ کجا کہ در جمالِ تو رسد

تو بابا صاحب پر ایسی کیفیت طاری ہوگئی جو تحریر و تقریر میں نہیں آسکتی [۱۸]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ ایک بار انھوں نے حجرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس وقت بابا فریدؒ ننگے سر تھے اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا۔ موصوف بار بار یہ رباعی پڑھ رہے تھے :

خواہم کہ ہمیشہ در وفای تو زیم   خاکی شوم و بزیر پای تو زیم
مقصود من خستہ زکونین توئی   از بہر تو میرم و برای تو زیم

بابا صاحب یہ رباعی پڑھ کر سجدہ ریز ہوجاتے اور کچھ دیر بعد کھڑے ہوکر رقص کرنے لگتے۔

سلطان المشائخ بڑی دیر تک یہ منظر دیکھتے رہے اور پھر ہمت کرکے حجرے میں داخل ہوگئے۔ انھوں نے اپنا سر بابا صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ بابا صاحب خدا جانے اس وقت کس عالم میں تھے۔ انھوں نے سلطان جی کو مخاطب

---

۱۸ ایضاً، ورق ۱۰۲ ب۔

کرکے فرمایا "بخواہ چہ میخواہی"۔ انھوں نے فوراً عرض کیا "من چیزی از نعمت دینی خواستم" بابا صاحب نے فرمایا: وہ نعمتیں انھیں دی جاتی ہیں۔ سلطان جی فرماتے ہیں کہ عمر بھر ان کے دل میں یہ ملال رہا کہ اس وقت انھوں نے کیوں نہ اس بات کی التجا کی کہ ان کا انتقال سماع کے دوران ہو۔[۱۸]

حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ بابا فریدؒ اپنی مجالس میں عوارف المعارف کے حقائق بیان کرتے تھے۔[۱۹]

قرون وسطیٰ میں سلسلۂ چشتیہ کی خانقاہوں میں عوارف المعارف کا درس معمولات میں شامل ہوگیا تھا۔ اس سے اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بابا فریدؒ کا تو یہ حال تھا کہ اگر کبھی ان کی طبیعت سماع کی طرف مائل ہوتی اور قوال میسر نہ آتا تو موصوف اپنے کسی مرید سے عوارف المعارف کی چند سطریں پڑھوا کر سنتے اور ان پر وجد طاری ہو جاتا۔

بابا صاحب نے عوارف المعارف کے چند باب سبقاً سبقاً سلطان المشائخ کو پڑھائے تھے۔ جن دنوں ان کے ہاں عوارف المعارف کا درس ہو رہا تھا، بابا صاحب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ انھوں نے صاحبِ عوارف المعارف کے نام کی مناسبت سے اس کا نام شہاب الدین رکھا۔[۲۰]

جامع ملفوظات نے ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء سے یہ سنا کہ بابا فریدؒ کبھی کبھی "ڈولہ" میں سوار ہوا کرتے تھے۔[۲۱] درر نظامی میں ایک موقع پر "کھپڑی" کا

---

[۱۸] ایضاً، ورق ۹۹ الف ——— "چرا نخواستم کہ در سماع بمیرم"۔
[۱۹] ایضاً، ورق ۹۴ الف۔
[۲۰] حسن علاء سنجزی، فوائد الفواد (اردو ترجمہ)، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳، ص ۱۷۴۔
[۲۱] درر نظامی، ورق ۹۴ الف۔

ذکر بھی آیا ہے۲۲؎۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فارسی بول چال میں ہندی الفاظ بلا تکلف بولے جاتے تھے۔

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص بابا فریدؒ کا مرید ہونے کی خواہش کا اظہار کرتا تو بابا صاحب اُسے فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھنے کو کہتے۔ اس کے بعد اس سے 'امن الرسول بما انزل الیہ من ربہ...... الخ پڑھواتے اور پھر اس سے شہد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو اور ان الدین عند اللہ الاسلام کا اقرار کرواتے۔ پھر اس سے کہتے بیعت کرو مجھ ضعیف سے، مجھ ضعیف کے خواجہ سے اور خواجہ کے خواجہ سے اور اقرار کرو کہ میں اپنے ہاتھ کو روکوں گا بُرے کام سے اور قدم کو روکوں گا بُری جگہ جانے سے اور نگاہ کو قابو میں رکھوں گا نہ دیکھنے والی چیز سے۔" جب مرید اس کا اقرار کرتا تو اس سے یہ بھی عہد لیتے کہ وہ شریعت پر عمل کرے گا۔ پھر اس سے اِن شاء اللہ کہلواتے۲۳؎

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ نے بابا فریدؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خدمت میں فقط ایک بار جرأت کا مظاہرہ کیا اور ان سے چلہ کاٹنے کی اجازت مانگی۔ خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ایسی باتوں سے درویش کی شہرت ہوتی ہے۔ نیز یہ اُن کے پیروں کا طریقہ نہیں ہے۲۴؎ حضرت نظام الدینؒ کے جانشین حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی ایک مجلس میں چلہ کشی

۲۲؎ ایضاً، ورق ۸۶ الف۔

۲۳؎ ایضاً، ورق ۳۸ ب۔

۲۴؎ ایضاً، ورق ۲۸ الف۔

کا ذکر آیا تو موصوف نے حاضرین کو بتایا:

"خواجگان ما در اربعین نہ نشستہ اند"[۲۵]

ان واضح بیانات کی روشنی میں پتہ نہیں چشتیہ سلسلہ میں چلہ کشی کیسے داخل ہو گئی۔ بابا فریدؒ کو اُن کے مرشد نے چلہ کشی سے منع کیا تھا، پھر بھی ان کے سوانح نگاروں نے ان کی طرف ایک چلہ منسوب کر دیا ہے جو انھوں نے اُچھ کی ایک مسجد کے کنوئیں میں الٹا لٹک کر کیا تھا۔[۲۶] مجاورین نے سادہ لوح عقیدت مندوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے صرف لاہور شہر میں خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دو چلہ گاہیں کھڑی کر دی ہیں۔ بابا فریدؒ اور خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے بیانات کی روشنی میں ان کی بھلا کیا حقیقت ہے؟

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ بابا فریدؒ اور ان کے داماد حضرت بدرالدین اسحاقؒ بیٹھ کر اپنے گھٹنے کھڑے رکھتے اور گھٹنوں پر سر رکھ کر مراقبہ کیا کرتے تھے۔[۲۷]

حضرت نظام الدینؒ سے روایت ہے کہ پہلے بخارا میں شیخ سیف الدین باخرزیؒ کا انتقال ہوا اور اس سانحہ کے تین سال بعد شیخ بہاء الدین زکریاؒ داصل بحق ہوئے۔ حضرت زکریا کی رحلت کے تین سال بعد بابا فریدؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔[۲۸]

۲۵؎ محمد اکبر حسینی، جوامع الکلم، مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ، ص ۲۲۱۔

۲۶؎ عبدالحق محدث، اخبار الاخیار، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۲ھ، ص ۵۳۔

— درچاہ مسجد جامع حاج کہ در مقام اُچہ است چلۂ معکوس کشید تا چہل روز

۲۷؎ درر نظامی، ورق ۵ ب۔

۲۸؎ ایضاً، ورق ۱۱۶ الف۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ

درر نظامی میں حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں بڑا اہم مواد موجود ہے۔ اس کے باوجود یہ تصنیف ان کے سوانح نگاروں کی نظروں سے اوجھل رہی

جامع ملفوظات سلطان المشائخ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ان کے ابتدائی زمانے میں ایک روز شیخ نجیب الدین متوکلؒ ان کے ہاں تشریف لائے۔ سلطان جی نے اپنی والدہ ماجدہ سے کہا کہ ان کے لئے کھانا لائیں۔ انھوں نے فرمایا کہ ان کے ہاں کھانا کہاں سے آیا؟[۲۹]

حضرت نظام الدینؒ نے ابتدائی زمانے میں عُسرت کا ایسا دور دیکھا تھا کہ جب اپنے بڑھاپے میں ان کا ذکر کرتے تو ان کا دل بھر آتا تھا۔ موصوف فرماتے ہیں کہ غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) میں دہلی میں خربوزے اتنے سستے تھے کہ دو جیتل کے ایک من آتے تھے۔ اس کے باوجود فصل کا موسم گذر جاتا تھا اور خربوزے چکھنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ انھوں نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ نہ ہی تو خربوزے خریدنے کی ہمت ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی شخص بطور تحفہ لاکر دیتا تھا۔ یہ واقعہ بیان کرکے موصوف نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ اللہ کے فضل سے ان کے دل میں خربوزوں کی طلب بھی پیدا نہ ہوتی تھی[۳۰]

عسرت کے اسی دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ ان کے ہاں جس روز فاقہ ہوتا تو ان کی والدہ محترمہ انھیں مخاطب کرکے فرماتیں "آج ہم اللہ کے مہمان ہیں" سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ موصوف اپنی والدہ محترمہ سے

---

[۲۹] ایضاً، ورق ۶ الف۔

[۳۰] ایضاً، ورق ۶۱ الف۔

یہ بات سن کر ہمیشہ ذوق حاصل کرتے اور اس وقت کے منتظر رہتے کہ دیکھئے دوبارہ کب موصوف یہ بات فرماتی ہیں۔ حضرت نے حاضرین کو بتایا کہ اس انتظار سے ان کے دل میں ذوق پیدا ہوتا اور انھیں راحت ملتی[۳۱]

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ درویش کے گھر میں شبِ فاقہ شبِ معراج ہوتی ہے[۳۲]

ایک روز سلطان جی نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ نوجوانی کے عالم میں موصوف دہلی کی مسجد غیاثی میں جایا کرتے تھے اور ان دنوں وہاں امیر عالم والوالجی وعظ کیا کرتا تھا[۳۳]

جس دن حضرت نظام الدین اولیاء، بابا فریدؒ سے بیعت ہوئے اس روز انھوں نے بابا صاحب سے پوچھا کہ اب وہ تعلّم اختیار کریں یا نوافل میں مشغول ہو جائیں؟ بابا صاحب نے فرمایا کہ وہ انھیں تعلّم سے منع نہیں کرتے لیکن وہ دونوں کام کریں۔ سلطان جی فرمایا کرتے تھے کہ درویش کو ضروری علم آنا چاہیئے[۳۴]۔ پنجاب کے مشہور صوفی شاعر سلطان باہو کا قول ہے کہ بے علم فقیر آخر کافر ہو کر مرتا ہے۔

جامع ملفوظات رقمطراز ہیں کہ ایک روز جب وہ سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت موصوف ۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔

---

[۳۱] ایضاً، ورق ۶۲ ب۔

[۳۲] ایضاً ورق ۶۲ الف۔

[۳۳] ایضاً، ورق ۶۵ ب۔

[۳۴] ایضاً، ورق ۷ ب۔

کی تفسیر بیان فرما رہے تھے اور دوران گفتگو ابن عباسؓ کے حوالے بھی دیتے جاتے تھے۔[۳۵]

علی بن محمود جاندار لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ کسی مرید کی تعظیم کے لئے نہ اٹھتے تھے لیکن جب کبھی قاضی محی الدین کاشانی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حضرت ان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ آخر عمر میں جب ان کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تو انھوں نے قاضی صاحب سے معذرت کر لی۔[۳۶] اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے دل میں علماء کی بڑی قدر تھی اور موصوف اپنے عالم مریدوں کا کھڑے ہو کر استقبال کیا کرتے تھے۔

حضرت بہاء الدین زکریاؒ

چشتی بزرگوں کے ملفوظات میں حضرت بہاء الدین زکریاؒ اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ کا بار بار ذکر آتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں بزرگ چشتی حلقوں میں بڑے مقبول تھے۔

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت زکریاؒ صرف سترہ روز شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی رحمۃ اللہ کی خدمت میں رہے اور اس مختصر سی مدت میں انھوں نے جو فیض اپنے مرشد سے پایا وہ دوسروں نے سالہا سال میں بھی حاصل نہیں کیا۔ جب شیخ الشیوخ نے انھیں خلافت سے نوازا تو شیخ کے پرانے مرید رنجیدہ ہوئے کہ وہ مدتوں سے یہاں پڑے ہیں اور یہ نو وارد چند ہی روز میں اتنی بڑی نعمت لے کر جا رہا ہے۔ اس پر شیخ الشیوخ نے

---

[۳۵] ایضاً، ورق ۱۰ ب۔

[۳۶] ایضاً، ورق ۲ ب۔

فرمایا کہ وہ گیلا ایندھن لے کر ان کی خدمت میں آئے ہیں اور زکریا چوبِ خشک لے کر آیا تھا جیسے ایک ہی پھونک میں آگ لگ گئی [۳۷]

حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ جوانی کے عالم میں حضرت زکریا اپنے چچا کے سامان کی تجارت کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھیں تجارت میں خسارہ ہوا تو چچا نے انھیں طعنہ دیا جس نے تازیانے کا کام دیا۔ حضرت زکریا تجارت کا شغل چھوڑ کر تحصیل علم کے لئے بخارا تشریف لے گئے اور حصولِ علم کے بعد بغداد میں شیخ الشیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ [۳۸]

حضرت نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ ناصرالدین قُباچہ کے عہد میں منگولوں نے ملتان کا محاصرہ کیا۔ حضرت زکریا نے اسے ایک تیر دے کر کہا کہ رات کے وقت اسے منگولوں کی طرف چلا دیں۔ خدا کا کرنا کہ اسی رات منگول محاصرہ اٹھا کر واپس چلے گئے [۳۹]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت بہاءالدین زکریا کے مرید خاص حسن افغان بڑے اونچے پایہ کے بزرگ تھے اور انھیں کشف القلوب ہوتا تھا۔ حضرت زکریا ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لائے ہیں تو موصوف حسن افغان کو بارگاہِ خداوندی میں پیش کر دیں گے [۴۰] امیر حسن علاء سنجری نے فوائد الفؤاد میں یہ واقعہ

---

[۳۷] ایضاً، ورق ۴۶ ب۔

[۳۸] ایضاً، ورق ۸۳ الف۔

[۳۹] ایضاً، ورق ۸۲ ب۔

[۴۰] ایضاً، ورق ۲۳ الف۔

۲۶ر شوال ۷۰۷ھ کو منعقد ہونے والی مجلس کے ضمن میں درج کیا ہے۔

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت بہاء الدین زکریا نفلی روزے کم رکھا کرتے تھے لیکن عبادت بکثرت کرتے تھے۔ جب کوئی نفلی روزوں کے بارے میں سوال کرتا تو موصوف یہ آیت پڑھ کر اُسے خاموش کر دیتے:

كُلُوا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا [۴۱]

(المومنون : ۵۱)

سلطان المشائخ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ ملتان میں ناصر الدین قباچہ نے مدرسہ قائم کیا تھا۔ قاضی قطب الدین کاشانی وہیں رہتے تھے اور مدرسہ کی مسجد میں امامت بھی فرماتے تھے۔ حضرت زکریا کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز ان کی اقتدار میں ادا فرماتے۔ ایک روز قاضی صاحب نے ان سے کہا کہ موصوف اتنی دور سے وہاں آنے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہیں؟ حضرت زکریا نے فرمایا کہ وہ اس پر عمل کرتے ہیں:

من صلی خلف عالم تقی فکانما صلی خلف نبی	جس نے متقی عالم کے پیچھے نماز ادا کی اس نے گویا نبی کے پیچھے نماز ادا کی۔ [۴۲]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ حضرت زکریا بیمار ہوئے تو ایک اجنبی نے ایک خط لاکر حضرت صدر الدین عارف کو دیا اور ان سے التماس کی کہ اُسے

---

[۴۱] ایضاً، ورق ۲۷ ب۔

[۴۲] ایضاً، ورق ۲۲ الف۔

حضرت زکریا کی خدمت میں پیش کر دیں۔ حضرت زکریا نے وہ خط پڑھ کر حاضرین سے کہا "دوستو! ہمارا وقت سفر آگیا ہے"۔ حاضرین ان کی بات سن کر رونے لگے۔ اگلی شب حضرت زکریا بام سے گرے اور اسی [illegible] ان کا انتقال ہوا۔[۴۳]

حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص [illegible] سیاہ لباس پہن کر حضرت زکریا کے سامنے آتا تو موصوف اسے دیکھ کر فرماتے "یہ کیا شیطان کا لباس پہن کر آگئے ہو"۔[۴۴]

حضرت جلال الدین تبریزیؒ

حضرت نظام الدین اور دوسرے چشتی مشائخ کے ملفوظات میں حضرت جلال الدین تبریزی کا بار بار ذکر آتا ہے۔ ایک دن سلطان المشائخؒ نے حاضرین مجلس کو بتایا کہ حضرت جلال الدین تبریزی نے جتنی خدمت اپنے مرشد کی کی ہے اتنی کسی مرید نے نہیں کی۔ شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردیؒ ہر سال حج کو جایا کرتے تھے۔ ان کا معدہ کمزور تھا اس لئے سرد کھانے سے پرہیز فرما[illegible] تھے۔ حضرت جلال الدین تبریزی اپنے سر پر انگیٹھی رکھ کر شیخ کے ساتھ چلتے کہ پتہ نہیں موصوف کس وقت کھانا طلب فرمالیں۔[۴۵] ایک روایت ہے کہ کوموں کی گرمی سے ان کے سر پر بال اگنے بند ہو گئے تھے۔

۴۳؎ ایضاً، ورق ۱۱۶ الف۔

شیخ الاسلام بہاء الدین از بام بیفتاد۔
ہمدران شب برحمت حق پیوست۔

۴۴؎ ایضاً، ورق ۸۷ الف۔ این لباسِ شیطان است۔

۴۵؎ ایضاً، ورق ۲۹ الف۔

حضرت امیر خسروؒ

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ امیر خسرو دن بھر کے واقعات اور حالات حاضرہ رات کے وقت حضرت نظام الدین کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے اور موصوف یہ واقعات سن کر آبدیدہ ہوجایا کرتے تھے۔[۴۶]

علی بن محمود جاندار امیر خسرو کے برادر طریقت تھے اس لئے وہ ان کی عادات سے خوب واقف تھے۔ موصوف امیر خسرو کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ شطرنج کے خوب ماہر تھے۔[۴۷]

شیخ سنائیؒ

حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں کہ شیخ سنائی کے والد آدم اور سلطان محمود غزنوی کے استاد شیخ شیبہ ہمسائے تھے۔ ایک رات شیخ شیبہ نے خواب میں دیکھا کہ آدم کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جو بہت بڑا عالم اور شاعر ہے۔ اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور آدم کا بیٹا اللہ تعالیٰ کے حضور میں توحید پر مبنی اشعار پڑھ رہا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان اشعار کے طفیل غزنی کے تمام باشندوں کو بخش دیا۔ اگلی صبح شیخ شیبہ نے یہ ماجرا شیخ آدم سے بیان کیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ موصوف فوت ہوگئے اور ان کی وفات کے بعد سنائی پیدا ہوئے۔ حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ سنائی ابتدا میں اُمی محض تھے۔[۴۸]

---

[۴۶] ایضاً، ورق ۴۶ الف۔

[۴۷] ایضاً،

[۴۸] ایضاً، ورق ۴۶ ب، ۴۷ الف۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ اور خواب کی تعبیر

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ کسی خلیفے نے خواب میں حضرت عزرائیل کو دیکھا اور اس سے سوال کیا کہ اس کی عمر کتنی باقی ہے؟ اس نے پانچ انگلیاں دکھائیں۔ اس سے پانچ دن بھی مراد لئے جا سکتے تھے اور پانچ سال بھی۔ خلیفہ کو اس بارے میں بڑا تردد تھا۔ اس نے حضرت ابو حنیفہؒ سے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ ملک الموت نے یہ نہیں کہا کہ وہ پانچ دن یا پانچ سال اور جیئے گا، بلکہ اس نے اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچ چیزوں کا علم کسی کو نہیں دیا:

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ
وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا
تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ
إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (لقمان: ۳۴)

خلیفہ یہ تعبیر سن کر خوش ہوا اور امام صاحب کو خلعت دے کر رخصت کیا۔[۴۹]

حضرت نظام الدین کے زمانے میں اس قصے کی نسبت امام ابو حنیفہؒ کی طرف ہو گئی تھی، ورنہ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ امام مالکؒ کو خواب میں حضور نبی کریمؐ نے ایسا اشارہ کیا تھا اور انھوں نے امام ابن سیرینؒ سے اس کی تعبیر پوچھی تھی اور انھوں نے وہ جواب دیا تھا جو مذکورہ بالا روایت میں امام اعظم کی طرف منسوب ہے۔

امام ناصرؒ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ امام ناصر الدین کو سکتہ ہوا تو لوگوں نے انھیں مردہ

---

[۴۹] ایضاً، ورق ۱۰۸ الف۔

سمجھ کر دفن کر دیا۔ رات کے وقت قبر میں انھیں ہوش آیا تو انھوں نے سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کر دی۔ اتفاق سے اسی وقت ایک کفن چور نے ان کی قبر کھودنی شروع کر دی۔ امام صاحب کو جب محسوس ہوا کہ کوئی شخص ان کی قبر کھود رہا ہے تو انھوں نے آواز ہلکی کر دی۔ کفن چور نے جب کفن اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو امام صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آئے۔ کفن چور کا مارے دہشت کے پتہ پھٹ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ امام صاحب کو اس کی موت پر بڑا رنج ہوا۔

امام صاحب رات کے اندھیرے میں اپنے گھر کی طرف چلے اور راستے میں موصوف اپنے دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ لوگ کہیں ان کو دیکھ کر ڈر نہ جائیں۔ اس لئے موصوف آہستہ آہستہ چھپتے چھپاتے اپنے گھر پہنچے اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ وہ فلاں شخص ہیں، انھیں سکتہ ہو گیا تھا اور لوگ انھیں مُردہ سمجھ کر دفن کر آئے تھے حالانکہ وہ زندہ تھے۔ یوں انھوں نے لوگوں کا خوف دور کر دیا۔[۵۰]

جامع فوائد الفواد نے یہی واقعہ سات ذی القعدہ ۷۱۰ھ کی مجلس کے ضمن میں درج کیا ہے۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ امام ناصر نے اس واقعہ کے بعد تفسیر ناصری لکھی تھی۔[۵۱]

شیخ فریدالدین عطارؒ

درر نظامی میں مرقوم ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء ایک ایسے شخص سے ملے جس نے شیخ فریدالدین عطار کو دیکھا تھا۔ اس شخص نے سلطان جی کو

---

۵۰ ایضاً، ورق ۲۰ ب۔

۵۱ امیر حسن علاء سنجری، فوائد الفواد، (اردو ترجمہ) مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء، ص ۱۶۱۔

بتایا کہ جب چنگیز خان کا لشکر نیشاپور پہنچا تو شیخ عطار اپنی خانقاہ میں ستّرہ مریدوں کے ساتھ قبلہ رُو ہو کر بیٹھ گئے۔ جب منگول وہاں پہنچ کر قتل عام کرنے لگے تو موصوف نے فرمایا "این چہ تیغ قہار لیست و این چہ تیغ جبار لیست۔" جب شیخ عطار کے قتل کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا "این چہ کرم است و این چہ احسانست۔"

یہ واقعہ بیان کر کے سلطان المشائخ نے فرمایا کہ سالک کو چاہیئے کہ وہ تمام کام خدا پر چھوڑ دے اور اس کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ موصوف نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ جب منگولوں کا لشکر چنگیز خان کی قیادت میں نیشاپور پہنچا تو حاکمِ خراسان نے شیخ عطار سے کہا کہ موصوف دعا فرمائیں کہ یہ لشکر واپس چلا جائے۔ شیخ موصوف نے فرمایا کہ اب دعا کا وقت نہیں رہا، اب تسلیم و رضا کا وقت ہے۔

حضرت نظام الدین نے یہ روایت بیان کر کے فرمایا کہ موصوف اس بات کے قائل ہیں کہ نزولِ بلا کے وقت بھی دعا کی جائے تاکہ اس سے کم سے کم نقصان پہنچے۔[۵۲]

نجم الدین صغریٰ

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ ایک بار خواجہ معین الدین اجمیریؒ نجم الدین صغریٰ سے ملنے گئے۔ وہ اس زمانے میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھا۔ اس نے خواجہ بزرگ کو دیکھ کر رُخ پھیر لیا۔ انھوں نے اس بے رُخی کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ

۵۲ہ دررِ نظامی، ورق ۷۰ الف۔

سے نالاں ہے۔ دراصل وہ ان کی مقبولیت پر حسد کرتا تھا۔

خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو موصوف انھیں اپنے ساتھ اجمیر لے جاتے ہیں۔ خواجہ بزرگ نے خواجہ قطب الدین سے فرمایا "بابا قطب الدین! تم میرے ساتھ اجمیر چلو۔ تم مسند پر بیٹھنا اور میں تمھارے سامنے کھڑا رہوں گا" ۔۔۔ خواجہ قطب الدین نے عرض کیا "اللہ اللہ! میری کیا مجال ہے کہ میں آپ کے سامنے بیٹھوں۔" خواجہ بزرگ نے فرمایا "اچھا تو پھر تم جانو۔" خواجہ صاحب اجمیر روانہ ہوگئے اور اُدھر دہلی میں خواجہ قطب الدین کا انتقال ہوگیا۔[۵۳]

(باقی آئندہ)

---

۵۳ ایضاً، ورق ۸۴ ب۔

سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام

سید کاظم نقوی، ریڈر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۱)

دنیا کا سب سے اہم مسئلہ جو ہر دماغ پر چھایا ہوا ہے دنیائے انسانیت کے لیے کسی ایسے معاشی نظام کا معیّن کرنا ہے جو اس کے تمام امتیازی خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے مناسب اور مفید ہو، جسے مستقل طور پر لائحۂ عمل بنانے سے انسان کی معاشی زندگی کا ہر رُخ اجاگر ہو جائے۔ اس مسئلے کی بابت نہایت متانتؔ سنجیدگی، اخلاص اور وسعت نظر کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس گتھی کا الجھا رہنا اور اس کے سلجھانے میں دماغوں کا مختلف سمتوں میں چلا جانا پوری انسانیت کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ قانون اور نظام پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے۔ انسان کے سماجی وجود کی پوری عمارت قانون اور نظام کی بنیادوں پر قائم ہے۔

یہ مسئلہ انسان کے سامنے پہلی مرتبہ نہیں آیا ہے۔ اس کی جڑیں تاریخ انسانیت کے میدانوں میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جب سے انسان نے معاشی، معاشرتی اور سماجی زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے اس کی تمام ذہنی توانائیاں اس مسئلے کو

حل کرنے میں صرف ہوتی رہی ہیں۔

مل جل زندگی بسر کرنے والے افراد کے درمیان کچھ مشترک باہمی روابط اور تعلقات کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ ان تعلقات کی پیدائش انسان کی فطری ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر ہوئی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان باہمی روابط کو ایک صحیح نظام اور قانون کی احتیاج ہے۔ یہ نظام جتنا انسانی فطرت کی حقیقی خصوصیات سے سازگار ہوگا اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان امن وامان اور خوش حالی کی فراوانی ہوگی۔

صحیح نظام معاش وتمدن کی کھوج میں انسانیت نے فکر ونظر کے بڑے لق ودق بیابانوں کی خاک چھانی ہے۔ انسان کو اس سلسلے میں لگاتار، تابڑ توڑ کوششیں کرنا پڑی ہیں۔ اس نے کامیابی اور ناکامی کے نہ جانے کتنے الٹے پلٹے کھائے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں انسانی دماغوں کے تیار کیے ہوئے متعدد اور مختلف اقتصادی اور معاشرتی نظام ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان سب کا مقصد تمدنی عمارت کا نقشہ بنانا اور اس کی بنیادیں قائم کرنا ہے۔ انسان کی یہ پرخلوص کدوکاوش طرح طرح کے مصائب اور شدائد کی آماجگاہ رہی ہے۔ اگر اس کے ہونٹوں پہ دل آویز مسکراہٹیں آئی ہیں تو اس کی آنکھوں میں غم انگیز آنسو بھی ڈبڈبائے ہیں۔ اگر کبھی اتفاق سے امن واطمینان اسے نصیب ہوا تو اسی کے پہلو میں بدبختی نے اپنے پرے جمائے ہیں۔

ان طولانی اور طاقت فرسا مصیبتوں اور بدبختیوں کا سبب صرف اور صرف ایک تھا۔ وہ یہ کہ انسان اپنے محدود علم و اطلاع کی وجہ سے اپنی تمام فطری خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی مکمل نظام زندگی نہیں مرتب کرسکا۔ اس نے منزل تک پہونچنے کے لیے جتنے خطوط کھینچے وہ سب صحیح نقطہ سے ہٹے ہوئے تھے۔ دنیا نہیں مانتی نہ مانے، انکار کردینے سے حقیقتیں نہیں بدل سکتیں۔ واقعہ یہی ہے کہ اگر کسی ہدایت کے سورج کی تیز کرنیں کبھی کبھی اس بدبخت انسان تک نہ پہونچتی رہتیں تو وہ ہمیشہ تاریکیوں کی

طوفانی موجوں میں ہاتھ پیر مارتا رہتا۔

ہم اس وقت یہ نہیں چاہتے کہ معاشرتی اور اقتصادی میدانوں میں انسان کی مسلسل دوا دوش کو پیش کریں۔ غم نصیب اور ستم رسیدہ انسانیت کی تاریخ لکھنا اور یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ وہ سالہا سال کن ہولناک فضاؤں میں سرگرداں رہی۔ ہمیں فی الحال ان نظریات کا جائزہ لینا ہے جو ایک سماجی اور اقتصادی نظام کے طور پر اس وقت انسان کے سامنے ہیں، ایسے سماجی اور اقتصادی نظام جو اس کے طولانی اور گہرے سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ اس نے سیکڑوں سمتوں اور جہتوں کی خاک چھانی، طاقت فرسا کاوشیں اور جانفشانیاں کیں۔ مصائب و آلام کے سربفلک پہاڑوں سے ٹکر لی۔ اس عظیم دوا دوش کے بعد کیا خیر و سلامتی، فلاح و بہبودی، امن و آشتی اسی میں ہے کہ ان موجودہ نظریات کو ساحل مراد سمجھ کر اپنے سفینۂ جد و جہد کا لنگر ڈال دیا جائے؟ کسی قسم کی مزید کوشش نہ کی جائے؟ اطمینان اور پورے اطمینان سے ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جایا جائے یا اب بھی کوشش کو جاری رہنا چاہیئے؟

یہ وہ اہم سوال ہے جو اپنے جواب کا پوری شدت سے مطالبہ کر رہا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے چار قسم کے اقتصادی اور معاشرتی نظام ہیں۔ ان میں سے پہلے تین عقل انسانی کے ساختہ پرداختہ، اس کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ آخری چوتھا نظام مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق عقل انسانی کے خالق کا بنایا ہوا ہے۔ انہی چاروں نظریات کی طرف عام ذہنیت مڑی ہوئی ہے۔ یہی علمی اور سیاسی مختلف رنگوں میں باہم مصروف پیکار ہیں۔ قدم قدم پر ان کے درمیان طرح طرح کے اختلافات چھڑے ہوئے ہیں۔

(۱) نظام سرمایہ داری
(۲) نظام اشتراکی

(۳) نظام مارکسی

(۴) نظام اسلامی

عملی طور پر مذکورۂ بالا نظاموں میں سے صرف دو نظاموں کو تسلط حاصل ہے۔ دنیا کے ایک بڑے حصہ میں نظام سرمایہ داری پر حکومت کی بنیاد ہے اور دوسرے بڑے حصہ میں نظام اشتراکی راجدھانی ہے۔ ان دونوں نظاموں کا سیاسی موقف بڑا نازک اور اہم ہے۔ اسی نزاکت اور اہمیت میں ان کی بقا کا راز مضمر ہے۔ ان میں سے ہر ایک سارے عالم کی سیاسی قیادت کے لیے کوشاں اور اس بات کا متمنی ہے کہ دنیا میں یکساں معاشرتی نظام رائج ہو جائے۔ نظام مارکسی اور نظام اسلامی کو اس وقت مکمل طور سے دنیا کے کسی حصے پر عملی تسلط حاصل نہیں ہے۔ ان کا وجود فکر و تصور کی حدوں سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ بے شک گذشتہ دور میں دنیا کو اسلامی نظام کا ایک نہایت کامیاب تجربہ ہوا مگر افسوس اس کی عمر بہت مختصر تھی۔ مسلمانوں کی قیادت اپنے صحیح مرکز سے ہٹ کر ایسے لوگوں کے پاس پہونچ گئی جن کے دلوں میں اسلام کا پودا اچھی طرح جما نہ تھا۔ اصول اسلامی کے اصلی خدوخال سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ اس غلط قیادت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام اسلامی اس ابتدائی مختصر مظاہرے کے بعد پھر بروئے کار نہ آسکا۔ اس کا وجود فلاسفہ کے ذہنوں میں فکر اور مسلمانوں کے دلوں میں عقیدہ بن کر رہ گیا۔ اب وہ ایک خوبصورت آرزو ہے جس کے بر لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ رہ گیا مارکسی نظام اس کا مکمل تجربہ اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ وہ محض ایک فلسفی نظریے کی شان رکھتا ہے۔ کمیونزم کے حامی اب تک اس کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ اس کے اجرا کے لیے زمین ہموار اور فضا تیار کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ عنانِ حکومت اور زمامِ اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد وہ قانون مارکسیت کو سو فیصدی نافذ نہیں کر سکے۔ انھوں نے اپنی حکومت کا دستور نظام اشتراکی قرار دیا ہے۔

ہاں اس کے ساتھ وہ یہ برابر اعلان کرتے رہے ہیں کہ اشتراکیت مارکسیت تک پہونچنے کا زینہ ہے۔

سوچنے کے قابل بات یہ ہے کہ ان نظاموں کے درمیان اسلامی نظام کا درجہ کیا ہے؟

وہ صحیح مقصد کیا ہے جس کے ساحل تک ہمیں اپنی کشتی کھیکر پہونچانا ہے؟

۱۔ نظام سرمایہ داری

یہ بالکل غلط خیال ہے کہ اس نظام میں نری خرابیاں ہی خرابیاں ہیں۔ اس نے اقتصادی، سیاسی، علمی اور فکری شعبوں میں بہت سی اصلاحیں کی ہیں۔ کسی نظام سے بنیادی اختلاف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کی اچھائی کا اقرار نہ کیا جائے۔

نظام سرمایہ داری میں فرد اور اس کے شخصی فائدے کو مقصود اصلی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ قوم کے مفاد کی عمارت مفاد اشخاص کی بنیاد پر بلند ہوتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں شخصی مفاد کے تحفظ پر جماعتی مفاد کے تحفظ کا دارومدار ہے۔ وہاں ہمیشہ حکومت کے پیش نظر افراد کا مفاد رہتا ہے۔ قوم انہی افراد کا مجموعہ ہے، لہٰذا سرمایہ داری انہی اشخاص کے منافع کی اجتماعی کیفیت کا نام ہے۔ قوم کی خوش حالی انہی افراد کی فارغ البالی کا دوسرا روپ ہے۔ نظام سرمایہ داری نے اپنی اسی فرد پرستی کی بنا پر ہر شخص کو چار قسم کی آزادی دی ہے۔

سیاسی[۱] آزادی، اقتصادی[۲] آزادی، مذہبی[۳] آزادی، علمی اور[۴] فکری آزادی۔

یوں سمجھنا چاہیئے کہ نظام سرمایہ داری انہی چار آزادیوں کو کہتے ہیں۔

سیاسی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو رائے دینے کا حق ہے، اس کی بات سنی جائے گی۔ اس کی رائے کا احترام کیا جائے گا۔ زندگی کے ہر شعبہ کے لیے قوانین بنانا، ان کے جاری اور نافذ کرنے والے طبقہ کا انتخاب کرنا لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر معاشرتی نظام اور اس کی چلانے والی مشینری کا تعلق براہ راست افراد ملک سے ہوتا ہے۔ تمام قوانین انہی پر لاگو ہوتے ہیں۔ طبقۂ حاکم سے انہی کو نباہ کرنا پڑتا ہے۔ قوانین کے نقص اور حکام کی نالائقی کا اثر چونکہ ملک کے باشندوں پر پڑتا ہے لہٰذا ان کی رائے کو اہمیت دینا ضروری ہے۔ ان کی مستقل بدبختی اور خوش قسمتی کا تعلق انہی قوانین اور حکام سے ہے۔ قوم کی حیات اور موت انہی دونوں سے وابستہ ہے۔ قانون سازی اور حکام کے انتخاب کو کسی خاص فرد اور معین جماعت کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ تمام اہل ملک کو سیاسی حقوق میں برابر ہونا چاہیے۔ رائے دہندگی اور حق انتخاب کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے۔ قوانین بنانے اور حکام معین کرنے کا مرحلہ باشندگان ملک کی اکثریت سے طے پائے گا۔

اقتصادی آزادی کا مفہوم یہ ہے کہ ملک کے ہر فرد کے سامنے ہر قسم کے کاروبار کے دروازے کھلے ہوئے ہیں بلکہ حکومت خود اس بارے میں ہر مدد کے لیے تیار ہے۔ نظام سرمایہ داری نے ہر طرح کی چیزوں کے کھپانے اور فراہم کرنے کا مکمل حق باشندگان ملک کے سپرد کر دیا ہے۔ اس غیر محدود اقتصادی آزادی نے دنیا میں سرمایہ کو جنم دیا ہے۔ ہر شخص اپنے خصوصی فائدوں کی روشنی میں آزاد ہے کہ جتنی دولت چاہے اکٹھا کر لے۔ اس کے لئے جو راستہ مناسب ہو اختیار کرے۔ قانون کہیں پر بھی سد راہ نہیں ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر شخص کے پیش نظر صرف اپنا انفرادی فائدہ ہوگا اور دوسرے کے مفاد سے بالکل آنکھیں بند ہوں گی تو تجارتی معاہدات اور دوسرے معاملات میں انصاف، باہمی اعتماد اور دیانتداری کی ضمانت کیا ہے؟

اس کے جواب میں نظام سرمایہ داری کے حامیوں کا کہنا ہے کہ تفوق طلبی اور دوسروں سے بڑھنے کا جذبہ انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ اس کے پیدا کرنے

کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے قانوناً ملک کے تمام باشندوں کو کاروباری حقوق میں مساوی قرار دیا ہے۔ ہر شخص کو ہماری طرف سے اقتصادی آزادی حاصل ہے۔ ایسی صورت میں ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی بس یہی تدبیر ہے کہ لوگوں کی نظر میں زیادہ سے زیادہ اپنے کو دیانتدار ثابت کیا جائے تاکہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اس پر زیادہ بھروسہ کریں۔ یہی مقابلے اور فوقیت کا جذبہ کارخانوں اور فیکٹریوں کے مالکوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بہتر سے بہتر چیزیں تیار کریں۔ یہی جذبہ اشیا کی قیمتوں کو بھی محدود اور معتدل رکھتا، کارخانے کے مزدوروں اور دوسرے عملہ کی اجرتوں میں ظلم اور زیادتی سے بچاتا ہے۔ ہر دو کاندار اور کارخانہ دار ڈرتا ہے کہ اگر ہم نے چیزوں کی قیمت بڑھا دی اور مزدوری کی اجرت کم کر دی تو ہم بدنام ہو کر پیچھے رہ جائیں گے اور ہمارے دوسرے ہم پیشہ آگے بڑھ جائیں گے۔ اس کے علاوہ اشیاء کی قیمت کے اعتدال اور توازن کے لیے کسی مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اقتصادیات کے فطری اصول اس کا بندوبست کر لیں گے۔ یہ طبعی اور فطری اصول ہے کہ قیمت کے چڑھنے سے مانگ کم ہو جاتی اور مانگ کے کم ہو جانے کی شکل میں قیمت گر جاتی ہے۔ اس فطری اصول کا نتیجہ صاف ہے کہ جب بھی اشیا کی قیمت اپنے معتدل، صحیح حدود سے آگے بڑھے گی تو عموماً لوگ ان چیزوں کا خریدنا چھوڑ دیں گے۔ ادھر ان اشیا کی مانگ کم ہو گی فوراً ان کی قیمتیں دوبارہ اپنی معتدل، فطری منزل پر پلٹ آئیں گی۔

مذہبی اور ذہنی آزادی کے الفاظ اگرچہ الگ الگ ہیں ورنہ مذہبی آزادی اسی ذہنی آزادی کی ایک شاخ ہے۔ ان دونوں کے معنی بالکل صاف ہیں، یعنی ہر شخص اپنے عقائد اور افکار کے بارے میں آزاد ہے۔ جس مسئلے کی بابت چاہے سوچے اور جس نظریے کو پسند کرے اپنا عقیدہ قرار دے۔ قانون کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ کسی شخص سے اس کے خیال اور عقیدے کی آزادی کو چھینتا نہیں ہے۔ تمام

باشندگان ملک کو حکومت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنے افکار اور نظریات کی تبلیغ کریں۔ ان عقائد پر جو اعتراضات کیے جائیں پوری طاقت سے ان کا جواب دیں۔

نظام سرمایہ داری کی اس تشریح اور تفصیل سے یہ بات پورے طور پر واضح ہو گئی کہ اس کے نزدیک قوم کا مفاد افراد اور اشخاص کے مفاد سے وابستہ ہے۔ سماجی نظام کی دیواریں بلند کرنے میں لوگوں کے شخصی مفاد کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ صحت مند اور فائدہ بخش حکومت وہ ہے جو افراد قوم کی خدمت اور ان کے مفادات کی حفاظت کرے۔

نظام سرمایہ داری کی یہی وہ بنیادی اینٹیں ہیں جن کے لیے بڑی بڑی خون ریز بغاوتیں ہوئیں۔ نہ جانے کتنی قوموں نے اسی راہ میں قابل قدر جہاد کیے۔ ان بغاوتوں کے گروہوں کے سربراہوں کا کہنا تھا کہ ہم ایک ایسے نظام کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہے ہیں جس کی گود میں بہشت کی خوش حالی اور فارغ البالی مسکرا رہی ہے۔ وہ نظام اپنے دامن میں اطمینان اور امن و امان کا سایہ لیے ہوئے ہے۔ اس میں فقر و فاقہ اور افلاس و غربت کا نام و نشان تک نہیں ہے۔

(باقی آئندہ)

لفظ "ادب" کی تاریخ

بسمل نسیم احمد، لکچرر شعبۂ عربی اسلامیہ کالج برائے طالبات سوپور کشمیر

لفظِ "ادب" کی تاریخ لفظ "علم" اور لفظ "مذہب" کی طرح ارتقائی منازل طے کرتے کرتے ہم تک پہنچتی ہے، چنانچہ زمانہ جاہلیت سے بہت پہلے کی ادراب کی ادبی تاریخ سے یہی پتہ چلتا ہے۔ لفظ 'ادب' کے قدیم ترین معنی وہی تھے جو لفظ "سنّت" کے ہیں یعنی عادت طرزِ عمل یا وہ طریقہ جو آدمی وراثت میں پائے، جس طرح اسلام میں سنت کے معنی اُس طرزِ عمل کے ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کو وراثت میں ملا ہے۔ یہی معنی والرز اور نالینو نے بھی روایت کیے ہیں۔ اِن دونوں کے خیال میں لفظ 'ادب' لفظ 'داب' کا صیغۂ جمع ہے اور دُاب، کے معنی 'عادت' یا 'طرزِ عمل' ہیں اور یہ کہ 'ادب'، 'داب' کی ترقی پذیر شکل ہے بہر حال یہ لفظِ "ادب" کے قدیم ترین معنی ہیں۔

اس لفظ کے معنوی ارتقاء کی وجہ سے عملی اور اخلاقی پہلوؤں میں اس کے معنی آسان اور نمایاں تر ہوتے گئے۔ مثال کے طور پر اس کے معنوی دائرے میں یہ چیزیں آتی رہیں: "عمدہ صوفیانہ عادات، عمدہ تربیت، اچھے اخلاق، وغیرہ۔ ظاہر بات ہے اس ارتقاء میں اُس تہذیب و تمدن کا بھی اثر تھا جو اسلامی انقلاب اور پہلی و دوسری صدی ہجری میں اسلام اور غیر ملکی روحانی اختلاط کا نتیجہ تھا۔ اس اعتبار سے عباسی دور کے اوائل میں لفظ ادب لاطینی لفظ "اوربینتاس" کا ہم معنی تھا اور "اوربینتاس" کے معنی تھے: شہری زندگی کی عمدگی، عشرت پسندی اور اخلاقِ حسنہ۔ اسلامی تہذیب کے پورے وسطی دور کے دوران لفظ آدب"

کے یہی معنی سمجھے جاتے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پہلی صدی ہجری کے زمانے سے ہی مذکورہ معنی کے ساتھ ساتھ یہ لفظ ایک اور معلمانہ اور متعلمانہ معنی پر دلالت کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس معنی پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

غیر ملکی تہذیبوں کے ساتھ مل جانے کے بعد اس لفظ کے معنی میں کافی وسعت پیدا ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لفظ عربی ادب کے علاوہ ہندی، ایرانی اور رومی آداب پر بھی دلالت کرنے لگا۔ مثال کے طور پر تیسری صدی ہجری کا ادیب ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ نہ صرف عربی شعر و نثر اور ایام و اخبارِ عرب کا عالم تھا بلکہ وہ غیر اسلامی اور غیر عربی روایات و علوم میں بھی ماہر تھا۔ اس کا مبلغ علم ایران کے مدح و تعریف، قدیم ہندوستانی داستانوں اور یونانی فلسفوں، اخلاقیات، اقتصادیات اور مذاہب تک مشتمل تھا۔ اس لفظ کی ارتقائی تاریخ کی ترقی میں ابن مقفع کا بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے غیر ملکی ادبی اور تاریخی سرمایہ کے تحریری مواد کو عربی شکل دے دی۔ انھوں نے اس ضمن میں "ادب الصغیر" اور "ادب الکبیر" تصنیف کیں۔ یہی ادبی تصانیف عباسی دور کی تہذیبی اور تمدنی ترقی کا سبب ہیں۔

ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو اسی زمانے میں اس لفظ نے "عمدگی" کے وسیع معنی سے آزادی بھی حاصل کی۔ اب اس کے معنی میں چنداں فرق دکھائی دینے لگا۔ مثلاً "ادب الکاتب" اُس ادب کو کہا گیا جس کا علم کسی سکریٹری کے لیے ضروری تھا، اسی طرح سے "ادب الوزراء" اُس ادب کا نام پڑ گیا جس کا جاننا وزیروں کے لیے ضروری تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ "عمدگی"، "شرافت" انسانی اخلاق اور دوسری اِس قسم کی چیزیں جو خلافت راشدہ کے زمانے میں اس کے معنی میں شامل تھیں اس سے یک دم منقطع ہو گئیں اور اس کے معنی ایک محدود دائرۂ علم یعنی انشاء پر دلالت کرنے لگے یا ذرا وسعت کے ساتھ کہا جائے تو شاعری، ذومعنی الفاظ، حکایات اور دوسری فنی تحریریں اس کے دائرۂ معنی میں داخل ہو گئیں۔ قریب قریب دورِ جدید کی نشأۃِ ادب تک اس کے معنی اسی طرح کی باتوں پر دلالت کرتے رہے۔

دورِ جدید میں ادب سے مراد ادبیات بھی لیا جاسکتا ہے۔ مثلاً تاریخ الآداب العربیہ سے مراد ہے عربی ادب کی تاریخ اور کلیۃ الآداب سے مراد ہے فن اور ادب کا کالج۔ لیکن طٰہٰ حسین جیسے عالموں کی نظروں میں "ادب" اب بھی قدیم معنوی وسعت کا حامل ہو سکتا ہے۔ مصطفیٰ صادق الرافعی کہتے ہیں " ادبی اعتبار سے یہ لفظ تین ادوار سے گزر چکا ہے اور یہ تینوں ادوار مجموعی زندگی سے متعلق ہیں اور فطری تاریخ کی پیداوار ہیں"۔ بہرکیف اگر فرض کیا جائے کہ لفظ "ادب" جاہلی دور میں بھی مستعمل تھا تو یہ بات عیاں ہے کہ اس کے معنی وہی تھے جو اوپر مذکور ہیں یعنی اچھے عادات اور اچھے اخلاق وغیرہ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس لفظ کے زبانی استعمال میں ایسی تبدیلیاں آتی رہی ہوں جن سے کسی لفظ کے لغوی معنی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چنانچہ اگر کسی کو ضیافت کے لیے بُلانا ہوتا تو یوں بھی کہا جاتا " ادب القوم یؤدبہم ادباً" اور چونکہ ضیافت کی طرف بُلانا ایک ایسا فعل ہے جو اپنے اندر عمدہ اخلاق اور نیکی کا جذبہ لیے ہوئے ہے لہٰذا مطالب کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہے۔ اب یہ بات ثابت ہو چکی کہ متذکرہ زمانے میں لفظ 'ادب' کا اطلاق ہر اس بات پر ہوتا تھا جو اچھے اخلاق وعادات، شرافت، نزاکت اور عمدگی سے متعلق ہوتی۔

دورِ بنی امیہؔ میں یہ لفظ زیادہ واضح معنی کے ساتھ سمجھا جانے لگا۔ اس دور میں اساتذہ کی ایک خاص جماعت " المؤدبون" کہلائی جانے لگی۔ اس جماعت کا تعلق علم وادب سے تھا لہٰذا اِسی تعلق کی روشنی میں ان کو یہ نام دیا گیا۔ یوں لفظِ ادب کے ادبی معنی میں ذراسی وضاحت اور ہمواری آنے لگی۔ اب ادبی تعلیم کے دائرے میں اخبار وانساب عرب، شاعری اور خطوط نگاری کے فنون آتے تھے۔ اور لفظِ ادب فقط انہی چار چیزوں پر دلالت کرتا تھا اور یہ اس لفظ کی تاریخ کا تیسرا دور ہے۔

"عقد الفرید" کے مصنّف نے عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے: " مذہب سے آپ کی واقفیت کا مبلغ آپ کی ناواقفی کے مبلغ سے زیادہ ہونا چاہیے، اسی طرح ادب میں بھی"

اس مقولے سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ کے زمانے میں لفظ "ادب" قرآنی اور مذہبی واسطوں سے وسیع طور پر متعارف تھا اور مستعمل بھی۔ لیکن ابنِ عباسؓ کے اس مقولے کے ہوتے ہوئے بھی مؤرخین اس بات میں اختلاف کرتے ہیں کہ مذکورہ زمانے میں لفظ 'ادب' معنوی اصطلاح کے ساتھ معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ واضح رہے کہ ان کا سنہ وفات ۶۸ یا ۶۷ ہجری ہے۔ بعد کے ادبی مؤرخ تحقیق کیے بغیر ہی مذکورہ مقولے کو نقل کرتے رہے حالانکہ ان کے نزدیک بھی یہ بات مشکوک ہے۔ دراصل حقیقت یہ ہے اور جاحظ نے بھی "البیان والتبیین" میں یہی رائے ظاہر کی ہے کہ متذکرہ مقولہ محمد بن علی بن عبداللہ ابن عباس کا ہے۔ یہ "محمد" عباسی دور کے خلیفۂ اول سفاح کے والد تھے اور ۱۲۵ یا ۱۲۶ ہجری میں وفات پا چکے تھے۔

عمر بن دینار کہتے ہیں "میں نے ابن عباس کی مجلس سے بڑھ کر کوئی اور فلاح کی مجلس نہیں دیکھی ہے۔ اچھے بُرے سے متعلق معاملات، شاعری، تاریخ اور بہادری پر اس مجلس میں مباحثے ہوا کرتے۔" یہاں ایک بات قابلِ غور ہے اگر عمر بن دینار لفظ 'ادب' سے متعارف ہوتے یا یہ لفظ اگر عرفِ عام میں ہوتا تو ابن دینار کو مجلس ابن عباس کے مشتملات کا الگ الگ تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی حالانکہ جن مشتملات کا انھوں نے الگ الگ تذکرہ کیا، اصطلاحاً وہ سب ادب کے معنوی دائرے میں آتے ہیں۔

ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں علم العرب کا اطلاق ان چیزوں پر ہوتا تھا جن پر آج کل ادب العرب کا اطلاق ہوتا ہے۔ جیسا المسعودی نے "مروج الذہب" میں ابن عباسؓ سے روایت کر کے نقل کیا ہے کہ جب صعصاء بن سوہان سے مؤخر الذکر نے اس کی قوم کے بارے میں پوچھا تھا تو ابن عباسؓ نے کہا تھا "اے ابن سوہان! تو علم العرب کا بہترین ماہر ہے" اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں لفظ "ادب" مستعمل نہیں تھا۔ چنانچہ بعد میں علم العرب کی جگہ ادب العرب نے لے لی۔

دوسری صدی ہجری میں جب کہ 'ادب' کے معنوی حدود کی نشان دہی کی جاچکی تھی یہ لفظ لوگوں کے ایک خاص گروہ "مؤدّبون" کے لیے استعمال کیا گیا اور مؤدّبون کے کام کو حرفۃ الادب کہا گیا۔ پہلا شخص جس نے یہ لفظ استعمال کیا خلیل بن احمد تھا جو علم القوافی والعروض کی روشنی میں مشہور تھا اور ۱۷۵ ہجری میں وفات پاچکا تھا اور یہی لفظ بعد میں ثعلبی نے اپنی کتاب 'المضاف والمنسوب' میں یوں استعمال کیا: حرفۃ الادب آفۃ الادباء۔

تیسری صدی ہجری میں جب شاعروں کی باہمی چشمک سیاسی رنگ حاصل کرچکی تھی تو شعراء کو بھی ادباء کا نام دیا جانے لگا۔ اس طرح لفظ 'ادب' نے تمام علمی میدانوں میں مؤثر تعارف حاصل کرلیا۔ یہی رائے مصطفیٰ صادق الرافعی نے بھی اس لفظ کی تاریخ کے بارے میں ظاہر کی ہے۔ ایک اور دورِ جدید کے مؤرخ اور نقاد ڈاکٹر شوقی ضیف لفظ "ادب" کی تاریخ پر یوں رقمطراز ہیں: "لفظ آدب' کی معنوی تاریخ، عرب قومیت کے ارتقاء کے ساتھ مربوط و منسلک ہے۔ اس کے معنی میں عین اسی طرح ترقی ہوتی ہے جس طرح کوئی انسان تمدنی ترقی حاصل کرتا ہے، مختلف ادوار میں اس کے معنی بھی مختلف رہے ہیں۔ آج اس لفظ کا اطلاق اس منظوم یا منثور شاہکار پر ہوتا ہے جو سامعین یا قارئین کے وجدان وعواطف کو بہلائے۔"

مطالعہ کرنے اور غور و خوض کرنے کے بعد ہم جس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں اس پر دوبارہ مجموعی طور پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دورِ جاہلیہ میں یہ لفظ مفقود الخبر ہے۔ صرف یہ لفظ ایک جگہ طرفہ بن العبد، جو صاحبِ معلقہ بھی ہیں، کی شاعری میں ملتا ہے لیکن وہاں اس کے معنی کھانے کے لیے بلانے (الداعی الی الطعام) کے ہیں:

نحن فی المشتاۃ ندعو الجفلی　　لا تری الآداب فینا ینتقر[۵]

۵؎ دیوان طرفہ نظم ۵ رقم شعر ۴۶

طرفہ کے اس شعر کے بغیر یہ لفظ دورِ جاہلیہ کے نظم و نثر میں کہیں اور نہیں ملتا لیکن بعد میں پیغمبر اسلام صلعم نے یہ لفظ اس طرح استعمال کیا:

ادبنی ربی فاحسن تادیبی[1]

بعدازاں ایک مخضرمی شاعر سہم بن حنظلہ الغنوی نے اس لفظ کو یوں استعمال کیا ہے:

لا یمنع الناس منی ما اردت ولا   اعطیھم ما ارادوا حسن ذا ادبا[2]

اور اس دور میں اگر اس لفظ کو کہیں استعمال کیا بھی گیا ہو تو مذکورہ بالا معنی میں ہی حالانکہ اس کے لیے بھی کوئی کھلی شہادت ہمارے پاس موجود نہیں۔ نالینو کے خیال میں اس زمانے میں "داب" کے معنی: عمر رسیدہ ہونا، گردشِ روزگار کے ساتھ بدلنا اور آبا و اجداد کی بہادری تھا۔ اگر 'داب' ثلاثی مجرد مانا جائے تو وہ لوگ آداب کو اس کا صیغۂ جمع سمجھتے ہوں گے۔ جس طرح .... رأیا کی جمع آراء ہے۔ اب اگر عربوں کے نزدیک آداب کے معنی اچھے عادات و اخلاق رہے ہوں تو اچھے آداب و اخلاق کی طرف بلانا یعنی دعوۃ الی المحامد والمکارم زیادہ مناسبت اور قرابت رکھتا ہے نہ کہ کھانے کے لیے بلانا۔[3]

اموی دور میں اس لفظ نے ایک اور علمی معنی پائے تھے یہی وجہ ہے کہ علم کے ساتھ وابستگی رکھنے والوں کی جماعت کو مؤدبون کا نام دیا گیا۔ یہ لوگ اس زمانے کے امیروں اور وزیروں کے بچوں کو عربوں کے تہذیب و تمدن کی ارتقائی تاریخ سکھلاتے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو شاعری، فنِ خطابت اور ایام و انساب عرب کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ سب اس لیے کیا جاتا تھا تاکہ مذکورہ بالا فنون کو علم کے ساتھ شامل کیا جائے چنانچہ اس وقت علم معنوی اعتبار سے مذہب اسلام، فقہ، تفسیر اور قرآنی واقفیت کا نام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی دور میں ابن مقفع نے

[1] النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر لابن اثیر ط القاھرۃ ج ۱ ص ۳۔

[2] الاصمعیات (طبع دار المعارف) رقم ۱۲ بیت ۳

[3] تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لکارلو نالینو طبع دار المعارف ص ۱۴۔

اپنی دو حکمت، سیاست اور اخلاقیات پر مشتمل کتابوں کا نام "ادب الصغیر" اور "ادب الکبیر" رکھا۔ اسی معنی کی روشنی میں ابو تمام، متوفی ۲۳۱ھ نے اپنے دیوان کے تیسرے باب کا نام "باب الادب"، اور امام بخاری، متوفی ۲۵۶ھ نے بھی صحیح بخاری میں "باب الادب" کا عنوان شامل کر دیا۔ ابن معتز متوفی ۲۹۶ھ نے "کتاب الادب"، لکھی اسی زمانے یعنی دوسری اور تیسری صدی ہجری میں عربی شاعری اور اقوال کو "ادب" کا نام دیا گیا۔ کچھ مصنفوں نے انہی موضوعات پر کتابیں لکھیں اور ان کو کتب ادب کا نام ملا۔ مثلاً جاحظ کی کتاب "البیان التبیین" جو مشہور اقوال، اشعار، انساب، خطبات اور دیگر نمونہ ہائے علوم پر مشتمل ہے۔ اسی طرح مبرد، متوفی ۲۸۵ھ کی کتاب "الکامل فی اللغۃ والادب" بھی ہے حالانکہ اس میں "زبان" پر زیادہ بحث کی گئی ہے نہ کہ فصاحت و بلاغت اور تنقید پر جیسا کہ "البیان التبیین" میں ہے۔ مبرد نے اگلے زمانے کے چند نثری نمونے بھی کتاب میں جمع کیے ہیں چنانچہ وہ کتاب کی ابتدا میں لکھتے ہیں "یہ کتاب ہم نے اس لیے لکھی تا کہ نظم و نثر کے چند شاہکار نمونے محفوظ رکھے جا سکیں اور نصائح، جیدہ خطبات اور فصیح و بلیغ رسائل بھی"۔

اسی معنی و فن کی روشنی میں اور کتابیں بھی لکھی گئیں مثلاً ابن قتیبہ، متوفی ۲۷۶ھ، کی "عیون الاخبار" ابن عبد ربہ، متوفی ۳۲۸ھ، کی "عقد الفرید" الحصری، متوفی ۴۵۳ھ کی "زہر الادب"، ابن قتیبہ کی ہی "ادب الکاتب"، کشاجم، متوفی ۳۵۰ھ، کی "ادب الندیم" اور اس کے علاوہ "ادب القاضی"، اور "ادب الوزیر" بھی تصنیف کی گئیں۔ اس کے علاوہ "ادب الحدیث"، "ادب الطعام"، "ادب المعاشرہ"، اور "ادب السفر" بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔

تو جہاں تک اس کے معنوی ارتقا کا تعلق ہے اس نے فرانسیسی لفظ "لٹریچر" جس کا اطلاق ہر اس لفظ پر ہوتا ہے جو زبان کے حدود کے اندر فکر عمیق اور نگاہ حساس کے نتیجے میں تحریر کی جائے، کے معنی پا لیے۔ احمد الشائب نے لفظ "ادب" کی تاریخ کے بارے میں یہ خیال

ظاہر کیا ہے کہ دورِ جاہلیہ میں یہ لفظ قطعاً مفقود ہے لیکن یہ بات تسلیم کرنے میں ذرا تامل ہے کیونکہ دورِ جاہلیہ کی تمام تحریریں ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں کیونکہ بیشتر اس سے پہلے ہی ضائع ہو چکی ہیں اور سماجی، سیاسی اور مذہبی انقلابات کے ایک طویل سلسلے کے بعد ہم تک جو اس زمانے کا علمی مواد پہنچ پایا ہے وہ تحریری ہونے کے بجائے زبانی ہے اور ساتھ ساتھ دورِ جاہلیہ کی ادبیات کی صحت میں شک کی گنجائش بھی موجود رہے اور ایسا کیا بھی گیا ہے۔ طٰہٰ حسین کی کتاب 'فی الادب الجاہلی' اسی تنقیدی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ لفظ خود قرآن مجید میں کہیں نہیں ملتا، حالانکہ قرآن مجید کی زبان سب سے فصیح و بلیغ ہے اور ٹھیٹھ قریشی بول چال کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن اس بنیاد پر کہ لفظ 'ادب' قرآن مجید میں نہیں ہے۔ ہم دورِ جاہلیہ میں اس کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ بجائے خود تمام قریشی بول چال کے ذخیرے کا احاطہ نہیں کرتے، لہٰذا ممکن ہے کہ قرآن مجید میں موجود نہ ہونے کے باوجود یہ لفظ قریشی یا غیر قریشی بول چال میں مستعمل رہا ہو کیونکہ قرآن مجید صرف چھ ہزار عربی الفاظ کی تکرار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ پیارے نبیؐ کی ایک مشہور حدیث میں یہ لفظ موجود ہے "ادّبنی ربّی فاحسن تادیبی"۔

لفظِ 'ادب' کی تاریخ کے بارے میں جدید ناقدین کی رائے جاننے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا یہ لفظ عربی الاصل ہے بھی کہ نہیں۔ تو اس کے عربی الاصل ہونے کے حق میں ہمارے پاس دو ثبوت موجود ہیں:

ایک یہ کہ اس کے تینوں حروف یعنی "ا" "د" اور "ب" عربی زبان میں ابتدا سے موجود تھے مثلاً: بدأ، دأب اور ابدَ۔ اور یہ تینوں الفاظ لفظ 'ادب' سے قریبی علاقہ رکھتے ہیں۔ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ لفظ عربی اور دوسری سامی زبانوں میں سومیری زبان کے ہاں سے داخل ہوا ہے۔ سومیری میں اس کے معنی 'انسان' ہیں اور ممکن ہے کہ عربی میں آکر 'انسان' یعنی آدم، نے 'ادب' کی شکل اختیار کی ہو۔ دوم یہ کہ پیارے نبی صلعم اور کئی نکے

ساتھیوں نے اس لفظ کو مختلف معانی میں ہی سہی لیکن استعمال ضرور کیا ہے۔ یہ مشہور حدیث مختلف طریقوں سے مروی ہے مثلاً حضرت علیؓ نے پیارے نبی صلعم سے پوچھا "اے اللہ کے رسول! ہمارے آباؤ اجداد ایک ہی تو ہیں مگر آپ جو تقریریں مختلف قبیلوں میں فرماتے ہیں وہ ہم نہیں سمجھ پاتے" اس کا جواب پیارے نبی صلعم نے ان الفاظ میں دے دیا۔ "ادّبنی ربّی فأحسن تأدیبی وربّیت فی بنی سعد" اس حدیث میں ادب سے مراد تعلیم ہے۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پیارے نبی صلعم کی ایک اور حدیث مروی ہے: إن هذا القرآن مأدبة الله فی الارض فتعلموا من مأدبته" یہاں مأدبة سے مراد ہے 'خزانہ'، 'ذریعہ' اور 'منبع'، مطلب یہ کہ قرآن اُن تمام دروس کا منبع ہے جو انسان کو اچھے اخلاق و عادات سکھاتا ہے اور قرآن انہی چیزوں کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اس طرح سے ہمارے پاس بیشتر ثبوت اس بات کے حق میں موجود ہیں کہ لفظ 'ادب' دورِ جاہلیہ میں اور اسلام آنے کے بعد مستعمل تھا لیکن اس کے مجموعی معنی اچھے اخلاق اور عمدہ عادات کے سوا کچھ نہ تھے۔ ایک اور ثبوت نعمان بن منذر کا وہ خط ہے جو اس نے کسریٰ کے نام لکھا تھا اور نعمان یوں رقمطراز ہیں: وقد اوفدت ایها الملك رهطاً من العرب لهم فضل فی احسابهم وانسابهم وعقولهم وادابهم" یہ جملہ بھی ہماری بحث میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

دورِ بنی امیہ کی طرف دوبارہ نظر کی جائے تو زیاد بن امیہ بحیثیت امیر اپنی پہلی تقریر میں کہتے ہیں "فادعوا الله باصلاح لأئمتكم فانهم ساستكم المؤدبون لكم" یہاں زیرِ نظر لفظ سے مراد تہذیب ہے جو اچھے اخلاق و عادات سے قریبی علاقہ رکھتا ہے۔ اسی طرح عبدالملک بن مروان نے اپنے بیٹے کے مؤدب سے کہا "اس کو شعر سکھاؤ تا کہ کامیاب اور عظیم بن جائے" یہاں لفظ تادیب سے مراد تہذیب و تمدن ہے۔ چنانچہ یہ بات نمایاں ہے کہ مؤدبون شاعری، انساب و ایامِ عرب، محاورے، بول چال بزرگی، اخلاقیات، خوارق عادات بہادری وغیرہ سکھاتے تھے اور ان کو ادیب کہا جاتا۔ لہٰذا ان تمام متذکرہ چیزوں کا نام ادب تھا۔ ان میں سے میدانِ شعر کے ماہر کو شاعر اور میدانِ نثر کے ماہر کو کاتب کہا جاتا۔

تمام قارئین اور متعلق ادارہ ندوۃ المصنفین، مصنف اور مضمون نگاران وغیرہ وغیرہ اور حضرت محترم مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رح سے عقیدت اور خلوص رکھنے والے ان قابل لوگوں سے درخواست ہے کہ مفتی صاحب رح کے سلسلے میں بہت جلد ان کی زندگی سے متعلق روشنی ڈال کر اور زیادہ قربت رکھنے والے حضرات ان کی سوانح پر بہت جلد مضامین لکھ کر مینیجر رسالہ برہان دہلی کے نام ارسال فرمائیں کیونکہ حضرت مفتی صاحب رح کے سلسلے میں ایک ضخیم شاندار معیاری نمبر ان کے کردار اور عظمت کے مطابق شائع ہونے والا ہے اس لیے آپ کو مطلع کیا گیا کہ اس کی طرف خصوصیت سے توجہ فرمائیں۔

(منیجر)

چوتھی صدی ہجری کا شہرہ آفاق شاعر

ابوالطیّب المتنبّی

مسعود انور علوی

(۴)

سیف الدولہ کی معیت میں

متنبی ابو العشائر کے پاس مقیم تھا کہ ۳۳۷ھ میں خاندان بنی حمدان کا مشہور بادشاہ ابوالحسن علی بن عبداللہ الملقب بہ سیف الدولہ ابو العشائر کے پاس آیا۔ متنبی سے ملاقات ہوئی جس نے اس کی شان میں تین بے مثل قصائد کہے۔ سیف الدولہ اس درجہ اس کا گرویدہ ہوگیا تھا کہ جب اس نے متنبی سے حلب چلنے کو کہا تو اس نے شرائط رکھیں۔ جن کو سیف الدولہ نے مان لیا۔[۱] واشترط المتنبی علی سیف الدولۃ اول اتصالہ بہ انہ اذا انشدہٗ مدیحہ لاینشدہ الا وھو قاعدٌ۔ وانہ لا یکلف تقبیل الارض بین یدیہ فنسب الی الجنون ودخل سیف الدولۃ

---

[۱] الصبح المنبی صـ۱۷ ۔ تاریخ الادب العربی عمر فروخ صفہ ۴۶۰ ذکری ابی الطیب صفہ ۱۰۷۔

تحت هذه الشروط - چنانچہ متنبی جب تک سیف الدولہ کے دربار میں رہا ہمیشہ قصیدہ بیٹھ کر پڑھا اور اس کے روبرو زمین بوسی کبھی نہ کی۔

سیف الدولہ اپنے زمانہ کا بڑا عظیم الشان بادشاہ تھا جس نے ۳۳۳ھ سے ۳۵۶ھ تا وفات حلب کے پورے صوبہ پر کامیابی سے حکومت کی اور بڑی ہوشمندی، تدبر اور عزم مستحکم سے غزوات روم کے چالیس خوں ریز محاربوں میں حصہ لیا۔ وہ بذات خود ایک بلند پایہ نکتہ سنج ادیب و اعلیٰ ناقد تھا۔ ابو الفرج اصفہانی، ابن خالویہ قاضی التنوخی، کشاجم اور ابو فراس حمدانی جس کی قابلیت کا انوری جیسے شاعر نے بایں الفاظ اقرار کیا ہے ؎

شاعری دانی کہ ایں قوم کرد ند آں کہ بود
ابتدا شاں امرؤ القیس انتہا شاں بو فراس

اس کے سایۂ عاطفت میں تھے ان کی شاعری و صلاحیتوں کی دھوم مچی تھی مگر متنبی کے آجانے سے تو ایسا لگا گویا ؎

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آ گئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

یہ امتیاز بھی سیف الدولہ کو حاصل ہے کہ متنبی نے جتنے قصائد اس کی شان میں لکھے کسی بادشاہ کے لیے نہ لکھے صحب ابو الطیب بسیف الدولة ثمانی سنوات نظم فیها ۱۵۱۲ بیتا فی ۳۸ قصیدة و ۳۱ قطعة - ومن هذا اربع عشرة قصیدة فی وقائع الروم واربع فی وقائعه مع القبائل العربیة وخمس عشرة فی المدائح دون وصف الوقائع وخمس فی الرثاء ومن القطع اثنتان فی حوادث الروم وغیرها فی مقاصد مختلفة[1] - وہ سیف الدولہ کے

---

[1] ذکری ابی الطیب بعد الف عام صفحہ ۱۰۷۔

ساتھ ۸ سال رہا جس میں اس نے ۸۳ قصائد اور ۳۱ قطعات میں ۱۵۱۲ اشعار منظوم کیے جن میں ۱۴۲ اہل روم سے معرکہ آرائیوں کے بارے میں ۴ اندرون ملک کے قبائل سے جنگ کے متعلق ۱۵ قصائد محامد سیف الدولہ کے بیان میں جنگوں کے بیان کے علاوہ ۱۵ مراثی میں اور ۲ حوادث کے بارے میں اور بقیہ مختلف مقاصد کے بیان میں ہیں۔

اس نے سیف الدولہ سے ملاقات کے بعد ہی پہلا قصیدہ کہا۔

وفاؤکما کالربع اشجاہُ طاسمہٗ   بان تسعد اوالدمع اشفاہٗ ساجمہٗ

تم دونوں کی وفا میرے رونے میں مددگار ثابت ہونے میں اس منزل محبوبہ کی طرح ہے جیسا ان کھنڈرات نے مجھے رلایا ہے ایسے ہی تمہارے ساتھ رونے نے مجھے شفا دی ہے۔

سیف الدولہ اس سے بہت راضی و خوش رہتا، اس نے اس کو فنون سپہ گری اور شہسواری کی تعلیم بھی دلوائی۔ اس میں شک نہیں کہ متنبی نے اپنے قصائد کے ذریعہ سیف الدولہ کو زندہ و جاوید کر دیا۔ اس کے تمام قصائد اس کے کمال شاعری کے مکمل آئینہ دار ہیں۔ وہ ۸ یا ۹ سال بڑی شان و شوکت کے ساتھ دربار سے وابستہ رہا۔ مگر وائے قسمت کہ ۳۴۶ھ میں وہاں سے بھی مجبوراً روانہ ہونا پڑا۔

متنبی کے آجانے سے تمام درباری شعراء کے بازار سرد پڑ گئے چنانچہ وہ لوگ ہمہ وقت اسے سیف الدولہ کی نظروں سے گرانے کی فکر میں رہتے۔ اور کچھ متنبی کی افتاد طبع، انانیت اور بے باکی بھی اس کو لے ڈوبی۔ وہ اپنے کلام کے ذریعہ برابر دوسروں کی تحقیر و تذلیل اور ان کی شاعری و ذاتیات پر حملے کرتا رہا۔ مثلاً!

وَلِلحُسّادِ عذرٌ ان یشحوا	علی نظری الیہ وان یذوبوا
فانی قد وصلت الی مکان	علیہ تحسد الحدق القلوب

حاسدوں کے لئے یہ بات قابل معافی ہے کہ وہ للچائی ہوئی نظروں سے ممدوح کی مجھ پر کرم گستریوں کو دیکھتے رہیں اور اس غم میں گھلتے رہیں کہ میں ایک ایسے مقام پر پہنچ چکا ہوں جہاں دل آنکھوں پر حسد کرتے ہیں۔

وَدَعْ کُلَّ صوتٍ غیر صوتی فاننی	انا الطائرُ المحکیُّ والآخر الصدی

میری آواز کے علاوہ تمام آوازیں فراموش کردے کیونکہ میں ہی وہ پرندہ ہوں جس کی آواز نقل کی جاتی ہے اور بقیہ کی آواز صدائے بازگشت سے زیادہ نہیں۔

ایک مقام پر شعراء کو للکار رہا ہے ؎

افی کل یوم تحت جنبی شویعر	ضعیف یقاوینی قصیر یطاول
لسانی بنطق صامت عنہ عادل	وقلبی بصمتی ضاحکٌ منہ ھازل

کیا یہ خود ساختہ شاعر جن کو میں چاہوں تو بغل میں دبالوں روزانہ میرا مقابلہ کرتے رہیں گے اور چھوٹے ہونے کے باوجود بلندی میں مقابلہ کریں گے۔ میری زبان باوجود قوت گویائی کے اُن کی ہجو کہنے سے خاموش ہے اور میرا دل باوجود خاموشی کے اس کی حماقت پر ہنسی اڑا رہا ہے۔

حاسدین برابر سیف الدولہ کے اس کے خلاف کان بھرتے رہے اور وہ اپنے قصائد کے ذریعہ اس کا ازالہ کرتا رہا اور ان کو مزید مخالفت پر ابھارتا رہا۔ بالآخر یہ لاوا ایک دن پھوٹ پڑا کہ ابوعبداللہ بن خالویہ اور ابوالطیب لغوی

کے درمیان گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ سیف الدولہ نے جو متنبی کے ساتھ موقعہ واردات پر موجود تھا اور خاموشی سے سن رہا تھا کچھ بولنے کو کہا۔ متنبی جب بولا تو وہ ایسی بات تھی کہ ابن خالویہ کی دلیل کمزور پڑ رہی تھی اور اس کی ہار ہو رہی تھی وہ سیف الدولہ کا استاد تھا اسے بھلا کب گوارا ہوتا متنبی سے الجھ پڑا اور برا بھلا کہنا شروع کیا متنبی نے جواباً زجر کرتے ہوئے کہا۔ اُسکُت ویحك فانك اعجمی واصلك خوزی فمالك وللعربية۔ خاموش رہ تیرا برا ہو تو عجمی ہے جس کی اصل خوزستان سے ہے تیرا اور ایک عربی کا بھلا کیا مقابلہ۔ ابن خالویہ کو طیش آگیا اور کنجی کا گچھا نکال کر اس زور سے متنبی کے منہ پر مارا کہ اس کا تمام چہرہ لہولہان ہو گیا اور سیف الدولہ یہ سب دیکھتا رہا![1] متنبی کو اس بے اعتنائی سے سخت قلبی صدمہ ہوا اور وہ سیف الدولہ سے مایوس ہو گیا اور معرۃ النعمان جانے کے بہانے سے وہاں سے چلا آیا۔ اس طرح اس کا سنہرا دور ختم ہو گیا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا متنبی نے سیف الدولہ کا نام بلند کیا یا سیف الدولہ نے متنبی کا، بہر حال متنبی کی شہرت زمانہ سیف الدولہ کی ملاقات سے پہلے بھی تھی لیکن بہر حال اس کہنے میں حق بجانب ہوں گا کہ متنبی کے قصائد نے سیف الدولہ کو شہرت کی بلندیوں پر پہونچا دیا اور رہتی دنیا تک تاریخ عالم پر اس کے نام و کارناموں کو درخشاں و تابندہ و پائندہ کر دیا۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول گرامی یاد آ رہا ہے جو انہوں نے حضرت کعب رضی ابن زہیر سے فرمایا تھا۔ "وہ قبائیں کیا ہوئیں جو ہرم بن سنان

۱۔ الصبح المنبی عن حیثیة المتنبی صفہ ۸۷۔

نے تمھارے باپ کو بطور عطیات پہنائی تھیں انھوں نے جواب دیا کہ زمانہ ان کو پرانا کر کے اتار چکا۔ فرمایا لیکن تمھارے باپ نے ہرم کو جو قبائیں بصورت قصائد پہنائیں انھیں زمانہ پرانا نہ کر سکا۔

یہ بالکل درست ہے کہ متنبی کی جدائی کے بعد نہ تو سیف الدولہ ہی چمکا اور نہ متنبی کو ہی وہ فروغ حاصل ہوا۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا کیے گئے تھے جب تک یکجا رہے درخشاں و تابندہ رہے اور جب الگ ہوئے تو دونوں کی چمک دمک غائب ہوگئی۔ سیف الدولہ نے اس عرصہ میں متنبی کو تقریباً ۳۵ ہزار دینار انعام دیئے۔

کافور کے پاس

متنبی حلب سے روانہ ہو کر گھومتا پھرتا جمادی الاولیٰ ۳۴۶ھ میں کافور الاخشیدی کے پاس مصر پہونچا اور ساڑھے چار سال کے قریب یعنی ذی الحجہ ۳۵۰ھ تک وہاں رہا۔ کافور علم دوست اور علماء و فضلاء کا قدر دان تھا۔ اس کا وزیر ابن الفرات ایک زبردست عالم اور ادیب تھا۔ ابو جعفر مسلم بن عبید العلوی کا قول ہے ما رأیت اکرم من کافور۔ میں نے کافور سے زیادہ کریم النفس نہیں دیکھا۔

کافور نے مصر پر ۲۲ سال حکومت کر کے ۳۵۶ھ میں انتقال کیا۔ متنبی نے سب سے پہلا قصیدہ ؎

کفی بک داءً ان تری الموت شافیا

وحسب المنایا ان یکن امانیا

پڑھا۔ تیرے لئے یہی بیماری کافی ہے کہ تو موت کو شافی سمجھنے لگے اور موتوں کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ آرزوئیں ہو جائیں۔

اس نے آخری قصیدہ شوال ۳۴۹ھ میں کہا اور باقی ایک سال دو ماہ

میں کوئی قصیدہ نہ کہا۔ ؎

مُنًی کُنَّ لی ان البیاض خضابٌ　　نیخفی تبییض القرون شبابُ

مجھے اس بات کی آرزوئیں تھیں کہ بالوں کی سفیدی بمنزلہ خضاب کے ہو جائے یعنی بسبب سفید ہونے کے رنگ سیاہ بالوں کا چھپ جائے گا۔

اس دور کی شاعری میں جدت وندرت کا پتہ چلتا ہے کافور نے شروع میں اس کی بڑی پذیرائی کی اور اس کو یقین دلایا کہ وہ اس کو کسی صوبہ کا گورنر بنا دے گا جس کی وجہ سے اس نے بڑھ بڑھ اس کی مدح کی مگر جب مطلب برآری نہ ہوئی تو صاف کہنا پڑا۔ ؎

اذا کنت فی شاث من السیف فابله　　فاما تنفیہ و اما تُعِدّہ

وما الصارم الهندی الا کغیرہ　　اذا لم یفارقہ النجاد و غمدہ

اے کافور! اگر تمھیں کسی تلوار کے بارے میں یہ شک ہو کہ آیا وہ کاٹ سکتی ہے یا نہیں تو اسے آزما کر دیکھو اگر وہ ناکارہ ہو تو اسے پھینک دو اور کارآمد ہو تو اسے اپنے بچاؤ کے لئے رکھ لو۔

اگر تلوار اور پرتلہ میان سے جدا نہ ہو یعنی تلوار استعمال نہ کی جائے تو ہندی کاٹنے والی تلوار اور دوسری تلواروں میں کوئی فرق نہیں۔

ایک اور شعر میں کہتا ہے:

وما رغبتی فی عسجد استفیدہ　　ولکنها فی مفخر استجدہ

میرے لئے سونے چاندی میں رغبت نہیں کہ میں اس کو کماؤں بلکہ مجھے تو ایسا عہدہ چاہیے جس پر میں فخر کرسکوں۔

ایک اور مقام پر کافور سے کہتا ہے جس سے اس کی انانیت کا پتہ چلتا ہے۔

وفی الناس من یرضی بمیسور عیشہ | ومرکوبہ رجلاہ والثوب جلدہ
ولکن قلبی بین جنبی مالہ | مدی ینتھی بی فی مراد احدہ
یری جسمہ یکسی شفوفا تربہ | فیختار ان یکسی دروعا تھدہ

لوگوں میں بہت سے ایسے بھی ہیں کہ وہ آسان اور کمتر زندگی پر راضی و خوش ہیں حالانکہ ان کی سواری ان کے دونوں پیر اور ان کی پوشاک ان کی کھال ہے۔

لیکن میرا دل جو میرے پہلوؤں کے بیچ ہے کے لئے کوئی ایسی حد نہیں جہاں تک مجھ کو پہنچائے یعنی اگر میں دل کے لئے کوئی حد مقرر کرتا ہوں تو وہ اس سے بھی آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

وہ دل اپنے جسم کو دیکھتا کہ اسے باریک نرم کپڑے پہنائے جاتے ہیں جو اس کو آرام دیتے ہیں مگر وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کو سخت زرہیں پہنائی جائیں جو جسم کو تکلیف دیں۔ محنت و جفاکشی کی تعریف کر رہا ہے۔

ابا المسک ھل فی الکأس فضل انالہ | فانی اغنی منذ حین وتشرب
وھبت علی مقدار کفی زماننا | ونفسی علی مقدار کفیک تطلب
اذا لم تنط بی ضیعۃ اوولایۃ | فجودک یکسونی وشغلک یسلب

اے ابو المسک (کافور) کیا جام میں کچھ بچا کہ میں اسے پیوں کیوں کہ میں عرصہ سے گا رہا ہوں (تیری تعریف کر رہا ہوں) اور تو جام پر جام چڑھا رہا ہے۔ تو نے زمانہ کے دستور کے مطابق مجھ پر بخشش کی ہے لیکن میرا دل تیرے سخی ہاتھوں کی مقدار پر بخشش و عطا کا

خواہاں ہے۔ جب تک کہ تو مجھے کسی علاقے کی گورنری نہ بخشے گا اسس وقت تک مجھے آرام نہ ملے گا۔ تیری بخشش کبھی مجھے پوشش پہنائے گی اور کبھی تیری بے توجہی مجھ سے اسے چھین لے گی۔

کافور نے ان تمام باتوں پر جواب دیا

انت فی حال الفقر وسوء الحال وعدم المعین سمت نفسك الی النبوة فان اصبت ولایة وصار لك اتباع فمن یطیعك ![1]

تمہاری مفلسی، بدحالی اور بے نوائی کے زمانہ میں تمہارے نفس کی پرواز نبوت تک پہنچی اب اگر تمھیں کہیں کی گورنری حاصل ہو جائے اور تمہارے کچھ پیروکار ہو جائیں تو تم سے مقابلہ کی طاقت کس کو ہو سکتی ہے۔

کافور سے جدائی جب کسی طرح سے مطلب برآری نہ ہو سکی تو ربیع الاول ۳۵۱ھ میں سیاسی قید و بند سے گلو خلاصی حاصل کرکے چھپتا چھپاتا، دشت و صحرا عبور کرتا کوفہ جا پہنچا۔ وہاں پہونچ کر اس نے خوب جی کھول کر کافور کی ہجو کی۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے کافور کی مدح کے مقابلہ میں ہجو زائد تلخ کہی۔ ابو شجاع فاتک کے مرثیہ میں کہہ رہا ہے ؎

ایموت مثل ابی شجاع فاتكٍ	ویعیش حاسده الخفی الاوكع
ابقیت اكذب كاذب ابقیته	واخذت اصدق من یقول ویسمع
وتركت انتن ریحة مذمومةٍ	وسلبت اطیب ریحةٍ تتضوع

ا۔ الصبح المنبی صفحہ ۱۱۲ فی باب وصف کافور

کیا ابوشجاع فاتک جیسا عمدہ شخص مرجائے اور اس کا حاسد خصی احمق کافور زندہ رہے۔ اے زمانہ تو نے بقیہ ماندہ لوگوں میں سب سے بڑے جھوٹے (کافور) کو باقی رکھا اور سب سے اچھے (ابوشجاع) کو لے لیا۔ تو نے اس شخص کو جس کی بدبو بڑی بری ہے چھوڑدیا اور اس شخص کو ہم سے چھین لیا جس کی خوشبو سب جگہ پھیلی تھی۔

مِن اَیَّۃِ الطرق یأتی مثلك الکرم ابن المحاجم یا کافور و الجَلَمُ
سادات کل اُناسٍ من نفوسھم وسادۃ المسلمین الاعبد القزمُ

تیرے جیسے غلام کے پاس کرم اور شرف کس راستے سے آئے ہیں تیرے آلات حجامت اور قینچی کہاں گئی۔ تمام لوگوں کے سردار انھیں میں سے ہوتے ہیں مگر مسلمانوں کے سردار ذلیل و خوار غلام ہوتے ہیں۔

وہ ۳۵۱ھ میں کوفہ پہنچا پھر بغداد گیا اور ایک سال رہ کر کوفہ واپس آگیا یہاں آتے ہی سیف الدولہ کا لڑکا تحائف لے کر پہونچا اور اسے حلب آنے کی دعوت دی۔ متنبی نے اظہار تشکر میں ایک مدحیہ قصیدہ روانہ کردیا۔

لیس الا ک یا علیُّ ھمامٌ سیفُہ دون عرضہ مسلول
نغص البعدُ عنك قرب العطایا مرتعی مخصب وجسمی ھزیل
ان تبوأت غیر دنیای دارا واتانی نیل فانت المنیل

اے علی (سیف الدولہ) تیرے علاوہ کوئی ایسا بادشاہ نہیں جس کی تلوار ہی اس کی آبرو کی محافظ ہو۔

تجھ سے دوری نے عطایا کو بے مزہ کردیا۔ ان عطایا کی وجہ سے میری چراگاہ سرسبز ہے لیکن تیری جدائی کی وجہ سے میرا جسم لاغر ہے۔

اگر میں اس دنیا کے علاوہ کہیں جاکر رہوں اور وہاں میرے پاس بخشش
آئے تو میں یہی سمجھوں گا کہ دینے والا تو ہے۔
۳۵۲ھ میں خود سیف الدولہ نے اسے خط لکھا کہ وہ اس کے پاس چلا آئے
لیکن پھر اس نے جواب میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیج دیا جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ
سیف الدولہ کے دربار میں جانے سے کیوں پہلو تہی کر رہا تھا۔

فہمت الکتاب ابر الکتب — فسمعاً لامر امیر العرب
وما عاقنی غیر خوف الوشاة — وان الوشایات طرق الکذب[1]

میں اس خط کے مضمون کو جو تمام خطوط میں بہتر ہے سمجھ گیا۔ میرا سر تسلیم
امیر عرب کے حکم کے آگے خم ہے۔
مجھ کو اس کی تعمیل ارشاد سے سوا چغل خوروں کے خوف کے کسی چیز
نے نہیں روکا۔ بیشک چغلیاں جھوٹ کی راہیں پیدا کرتی ہیں۔

ابن العمید کے پاس وہ شام و مصر اور بغداد وغیرہ میں رہ چکا تھا اور وہاں کے
لیل و نہار جھیل چکا تھا چنانچہ وہ مشرقی اسلامی ممالک
کی سمت جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ابن العمید سے جو رکن الدولہ کا وزیر تھا
چاہا کہ رابطہ بڑھائے تاکہ اس کے ذریعہ وہ رکن الدولہ تک رسائی حاصل کرے
یا اس کے بیٹے عضد الدولہ کے پاس پہونچ جائے۔ چنانچہ وہ ارجان ابن العمید
کے پاس چلا گیا۔
صفر ۳۵۴ھ میں وہ ابن العمید کے پاس جا پہونچا جہاں اس کا بڑا پرتپاک
خیر مقدم ہوا۔ ابن العمید خود ایک بڑا عظیم انشاء پرداز اور علم دوست تھا جس کے لئے

۱۔ ابوالطیب المتنبی صفحہ ۱۶۶

ثوالبی نے لکھا ہے : بدات الکتابۃ بابن الحمید وختمت بابن العمید کتابت کا آغاز ابن الحمید سے اور اختتام ابن العمید سے ہوا۔ چنانچہ صاحب الصبح المنبی لکھتے ہیں کہ صفر ۳۵۴ھ میں وہ ابن العمید کے پاس آرجان پہونچا اور موقعہ غنیمت جان کر پہلا قصیدہ پڑھا :

بادٍ هواك صبرت اولم تصبرا

وبكاك ان لم يجر دمعك اوجرى

تیری محبت ظاہر ہو کر ہی رہے گی چاہے تو صبر کرے یا نہ کرے اور تیری گریہ وزاری چھپی نہیں رہ سکتی چاہے تیرے آنسو بہیں یا نہ بہیں۔

عضد الدولہ کے پاس وہ اپنے ساتھیوں اور نوکروں چاکروں کے ہمراہ دو ماہ ابن العمید کے پاس رہا پھر عضد الدولہ کے پاس جا پہونچا۔ رخصت ہوتے ہوئے ابن العمید کی شان میں تیسرا قصیدہ کہا :

نسيتُ وما انسى عتاباً على الصدّ

ولا خفراً زادت به حمرة الخدّ

میں سب کچھ بھول گیا مگر محبوبہ کے اس عتاب کو نہ بھول سکوں گا جو باوجود روگردانی کے اس نے مجھ پر کیا تھا نہ میں اس کی شرم وحیا کو بھول سکا جس سے اس کے رخساروں کی سرخی زیادہ ہوگئی۔

۱۔ الصبح المنبی ص ۱۴۷

وہ عضدالدولہ کے پاس ۳۵۴ھ میں شیراز پہونچا اور تین ماہ ٹھہرا۔ اس قلیل عرصہ میں اس نے چھ قصائد اور چند قطعات اس کی مدح میں پیش کیے۔ ایک عضدالدولہ کی پھوپھی کا مرثیہ اور باقی مدحیہ قصائد۔

اس نے پہلا قصیدہ جب پڑھا تو عضدالدولہ نے عود و عنبر و مشک، ریشمی چادریں، مشکی گھوڑا، تقریباً ۵۰۰ دینار کی مالیت کا ایک عمامہ اور ایک ہندی قیمتی تلوار جس کا پرتلہ اور دستہ سونے سے مرصع تھے صلہ میں عطا کیں۔

اوہ بدیل من قولتی واھا لمن نات والبدیل ذکراھا

اس محبوبہ کی جدائی کے سبب جو دور ہوگئی ہے اب بجائے "یہ خوش" کے بوقت حصول دیدار آہ کہتا ہے اور ہجر کی وجہ سے اس کا بدل اس کا ذکر ہے جو ہمیشہ وردِ زبان ہے

اُس نے ایران کی شعب بوان کی بھی جو جنت نشان سمجھی جاتی خوب تعریف کی ہے:

مغانی الشیب طیبا فی المغانی بمنزلۃ الربیع من الزمن

شعب بوان خوبی و دلکشی میں بہ اعتبار دوسرے منازل کے ایسے ہیں جیسے موسم ربیع (بہار) دل فریبی میں دوسرے زمانوں پر فضیلت رکھتا ہے۔

عضدالدولہ کے دربار میں آکر متنبی کی شاعری میں عیش و نشاط کی لہر آگئی لیکن یہاں بھی وہ نہ رک سکا اور اوائل شعبان ۳۵۴ھ میں عراق کے لئے روانہ ہوا۔ عضدالدولہ نے شیراز سے جانے سے نہ اس کو روکا اور نہ اس کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام کیا۔ چنانچہ وہ تین ماہ کے بعد واپسی کا وعدہ کرکے ۸ رمضان ۳۵۴ھ کو عراق لوٹ آیا۔

موت

وہ رمضان میں شہر واسط پہنچ کر اپنے دوست ابونصر محمد جبلی کے پاس ٹھہر گیا۔ ۱۷ رمضان کو واسط سے روانہ ہو کر ۲۷، ۲۸ رمضان کو دیرالعاقول کے نزدیک پہنچا تو بدویوں کی ایک جماعت نے فاتک بن ابی الجہل کی سرکردگی میں اس پر حملہ کر دیا اور اس کا سارا مال ومتاع لوٹ لیا۔ متنبی اس سے قبل فاتک کے بھانجے ضبہ کی بہت بیہودہ اور ہتک آمیز ہجو کر چکا تھا جس کو وہ اپنے سینہ میں دبائے ہوئے تھا موقعہ ملتے ہی متنبی پر حملہ کر دیا۔ اس کے ہمراہ ۷۰ آدمی تھے اور سب مسلح متنبی کے ہمراہ کل ۲ عدد۔ یہ لوگ بڑی بے جگری سے لڑے بالآخر معہ متنبی ایک ایک کر کے مارے گئے۔ یہ واقعہ ۲۸ رمضان ۳۵۴ھ کا ہے۔ ایک روایت ہے کہ متنبی نے دشمن کی کثیر تعداد دیکھ کر راہ فرار اختیار کرنی چاہی جس پر اس کے غلام نے کہا کیا آپ نے یہ شعر نہیں کہا۔

الخیل واللیل والبیداء تعرفنی

والسیف والرمح والقرطاس والقلم

مجھے گھوڑے، راتیں، صحرا، تلوار، نیزے اور کاغذ قلم خوب جانتے ہیں۔

متنبی یہ سن کر پلٹا اور اس بے جگری سے لڑا کہ بالآخر موت سے ہم کنار ہوا، اور اس طرح اس عظیم شاعر نے عمر کی ۵۱ بہاریں دیکھ کر دنیا سے منہ موڑ لیا۔

مولانا حامد علی خاں مرحوم

از مولانا وجیہہ الدین احمد خاں قادری، رامپور

رام پور کسی زمانہ میں دار العلوم اور دار العلماء تھا۔ یہاں کی گلی گلی کے اندر اونچے سے اونچے علماء موجود تھے۔ طلباء کی بھی انتہائی کثرت تھی ہزاروں کی تعداد میں یہاں طلباء موجود رہتے تھے جس میں افغانی، پنجابی، بنگالی، آسامی، برما اور رنگون تک کے رہنے والے یہاں آتے تھے۔ خود مقامی آدمیوں کو بھی انتہائی ذوق تھا کہ وہ عربی اور فارسی پڑھیں اور اس میں کمال حاصل کریں۔

یہاں پر فارسی کے باکمال حضرات میں سے مولوی عبد الرزاق خاں طالب (متوفی ۱۹۱۶ء) مولوی حسین شاہ خاں نامی (م ۱۸۹۴ء) بڑے بڑے قابل فارسی داں ہوئے۔ عربی داں حضرات میں یہاں پر کچھ تو مقامی علماء ہوئے اور کچھ بیرونی علماء نے یہاں آکر سکونت اختیار کرلی۔ بیرونی علماء میں سے مولانا عبد العلی بحر العلوم (م ۱۲۲۵ھ) تین سال تک رام پور میں رہے۔ ملا محمد حسن لکھنوی عرصۂ دراز تک یہاں پر رہے یہیں شادی کی اور یہیں ۱۷۸۴ء / ۱۱۹۹ھ میں انتقال فرمایا ــــــ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی (م ۱۸۶۱ء) مولوی عبد الحق خیر آبادی (م ۱۸۹۹ء) بھی یہاں مقیم رہے۔ عبد الحق خیر آبادی کے صاحبزادے مولوی اسد الحق صاحب نے بھی یہیں پر ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء میں انتقال فرمایا ــــ

مقامی علماء میں سے مولانا فضل حق رامپوری بڑے جلیل القدر علامہ ہوئے۔ برما سے

دے کر بخارا تک ان کا چرچا تھا۔ انھوں نے بڑی گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں کہ جن کے پڑھنے والے اور پڑھانے والے بھی اب دنیا میں موجود نہیں رہے۔ مولانا موصوف میرے استاذ تھے اور عرصۂ دراز تک مدرسہ عالیہ کے پرنسپل رہے ۱۹۴۰ء میں وصال ہوگیا۔ مولانا منور علی صاحب (م ۱۹۳۴ء) یہاں کے مشہور محدث تھے۔ ان کے استاذ میاں محمد شاہ صاحب (۱۹۲۰ء) اور ان کے استاذ الاستاذ میاں حسن شاہ صاحب (م ۱۳۱۲ھ) محدثین کرام میں سے تھے۔ مولوی اکبر علی خاں صاحب (م ۱۳۰۲ھ) بھی یہاں کے مشہور و معروف محدث تھے مولانا عبدالعلی خاں ریاضی داں (م ۱۳۰۳ھ) اور مولوی عبدالعلی صاحب منطقی (م ۱۲۷۸ھ) بھی یہاں کے مشہور عالم ہوئے ——— الغرض یہ حضرات وہ تھے کہ جن میں سے بعض کو میں نے خود بھی دیکھا تھا ——— میں نے طالب علمی کے زمانہ میں مولوی احمد امین خاں صاحب (م ۱۹۳۸ء) مولوی معز اللہ خاں صاحب (م ۱۹۴۳ء) مولوی نظیر الدین صاحب (م   ) مولوی افضال الحق صاحب (م ۱۹۵۵ء) اور خود میرے پیر و مرشد اور استاذ حضرت مولانا وزیر محمد خاں صاحب رح (م ۱۹۲۵ء) مدرسہ عالیہ میں درس دیتے تھے اور ان تمام ہی حضرات کا اپنے دور کے باکمال علماء میں شمار تھا ——— میں جب علی گڑھ کی ریاست دادوں کے مدرسہ حافظیہ سعیدیہ کی ملازمت سے فارغ ہو کر رام پور میں آیا تو اس وقت بھی علماء کا اور علم کا چرچا یہاں پر بہت تھا۔ میں نے ملا حسن (منطق کی مشہور کتاب) اور شرح ہدایۃ الحکمۃ (فلسفہ کی بہترین کتاب) اپنے محلہ (انگوری باغ) کی مسجد میں شروع کرائی کہ اس میں تقریباً بیس ۲۰ پچیس ۲۵ طالب علم شریک ہوا کرتے تھے ان میں پندرہ ۱۵ سولہ ۱۶ طالب علم بہت ہی سمجھدار تھے۔ انھیں میں مولوی حامد علی خاں صاحب بھی تھے۔

مولوی حامد علی خاں صاحب نہایت گہری استعداد رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت کچھ فوائد ملا حسن اور شرح ہدایۃ الحکمۃ کے ذریعہ حاصل کیے۔ مولانا بڑے متوکل، قانع، مہذب مدبر اور سمجھدار انسان تھے۔ کم عمری ہی میں اُن کے والد رشید علی خاں صاحب کا انتقال

ہوگیا تھا اس لیے مجبوراً معاش کے لیے رام پور کے دفاتر میں ملازمتیں کیں۔ وہ ملازمت بھی کرتے تھے اور تحصیل علم بھی۔ تحصیل علم میں انھوں نے یہاں کے بڑے بڑے علماء کی طرف توجہ کی اور فارغ التحصیل ہوکر درس وتدریس کی دنیا میں ایک اونچا مقام حاصل کیا۔

روہتک (ہریانہ) والے ان کے معتقد تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح روہتک آجائیں۔ چنانچہ ان کو یہاں کے دفتر کی ملازمت چھڑانے کے بعد وہ لوگ ان کو روہتک لے گئے۔ وہاں پر تھوڑے زمانہ تک مدرسہ خیر المعاد میں رہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب روہتک کے حالات کچھ نازک ہوئے تو ہم نے مولوی حامد علی خاں صاحب کو مجبور کیا کہ وہ رام پور آجائیں چنانچہ وہ رام پور تشریف لے آئے اور یہاں مدرسہ عالیہ میں ۷ دسمبر ۴۷ ۱۹ء سے درجہ تفسیر کے مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کو افتاء سے بھی ایک خاص مناسبت تھی۔ مشورے اور رائے وہ مجھ سے بھی لیتے تھے مگر تحریری فتویٰ نویسی وہی انجام دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھ کے فتاویٰ کی نقول ایک مجلد رجسٹر میں لائبریری مدرسہ جامع العلوم فرقانیہ، مسٹن گنج رامپور میں محفوظ ہیں اس کے علاوہ تقریر بھی بہت عمدہ کیا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں وہ میرے انتہائی دست وبازو تھے۔

جب میری عمر ۵۸ برس کی ہوئی اور ریٹائری کا زمانہ قریب آگیا تو وہ بھی مدرسہ عالیہ میں تنہائی محسوس کرنے لگے اور ملازمت سے برداشتہ خاطر ہوگئے، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ میں جو مدرسہ عالیہ سے مانوس تھا وہ صرف آپ کی وجہ سے تھا مجھے کچھ دوسرے حضرات سے الفت وانسیت پیدا نہیں ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہتک والوں نے انتہائی زور دے کر انھیں دوبارہ بلالیا۔ لہٰذا وہ ۱۶؍ جنوری ۱۹۵۹ء کو مدرسہ عالیہ سے استعفیٰ دے کر روہتک چلے گئے اور مدرسہ خیر المعاد کو پھر آباد کیا —— وہاں پر انھوں نے علمی اور عملی خدمات کی وجہ سے بڑی عزت وشہرت پائی —— تقسیم ملک کے بعد جب نقل آبادی کا مسئلہ درپیش ہوا تو روہتک کی آبادی ملتان کی طرف منتقل ہوگئی، اسی منتقلی کی صورت میں وہ بھی انتہائی تکلیف کے ساتھ ملتان

چلے گئے۔ وہاں پر اُن کی شہرت و مقبولیت میں روہتک سے بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ ملتان میں ان کے مخلصین کے تعاون سے ایک شاندار مدرسہ خیر المعاد اور ایک عالی شان مسجد تعمیر ہوئی اور ایک وسیع و عریض مکان بھی بنوایا کہ جس کا نام حامد منزل ہے۔

مولانا نے علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ میں سیاست کے میدان میں آنے کے بعد دین اور اسلام کی ترقی کی کوشش کروں۔ یہ چیز وہاں کے بہت سے ارباب علم کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ ان کو اس میدان میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ عوام بھی ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے —— ایک بار سیاسی تنازعہ میں جب مولانا کو گرفتار کیا جانے لگا تو اس وقت شہر ملتان کے ہزاروں آدمی سڑکوں پر پولیس کی راہ میں لیٹ گئے کہ پہلے ہمیں گرفتار کرو بعد میں انھیں پکڑنا۔ چنانچہ مجبوراً حکومت نے وارنٹ منسوخ کیے۔ یہ اُن کی مقبولیت کا عالم تھا۔

میدان سیاست کے علاوہ مولانا تحریر کے میدان میں بھی صاحب کمال تھے۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے لیکن شاید محفوظ بہت کم ہی رہا —— پھر بھی جس قدر محفوظ ہے اور طبع ہو کر آگیا ہے وہ اُن کی ذہانت، لیاقت اور طرزِ تحریر کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کا پہلا کارنامہ مقاماتِ ارشادیہ فارسی مؤلفہ حافظ عنایت اللہ خاں کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۶۰ صفحات پر محیط ہے اور تصوف کے مقامات و اسرار کا بہترین نچوڑ ہے۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے تین ایڈیشن اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ دوسرا کارنامہ تذکرۃ المشائخ کی تصنیف ہے۔ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اپنے پیر و مرشد مولوی حافظ عنایت اللہ خاں صاحب مجددی (م ۱۳۴۵ھ) تک کے حالات ۱۸۴ صفحات پر لکھے ہیں —— تیسری تالیف انوار مجدد الف ثانی کی شکل میں منظر عام پر آچکی ہے، اس میں مجدد صاحب (م ۱۰۳۴ھ) کے حالات، اقوال و مناقب وغیرہ کو ۳۲ صفحات میں سمونے کی قابل قدر کوشش کی ہے —— اس کے علاوہ مجموعۂ فتاویٰ کا تعارف ابتدا میں کرا دیا گیا ہے ——

مولانا ایک عرصہ سے کمزور اور ضعیف تھے مگر سرہند شریف کے عرس میں برابر حاضری کی کوشش کرتے رہے اور آتے رہے مگر ایک وقت ایسا آیا کہ امراض نے ان کے اوپر احاطہ کر لیا اور وہ اس دنیا سے ۷ر جنوری ۱۹۸۰ء کو رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اُس عالم میں اُن کو مراتب عالیہ مرحمت فرمائے۔

الحمدللہ کہ اُن کے تمام صاحبزادے دینی ذوق رکھتے ہیں۔ بڑے صاحبزادے حافظ محمد علی خاں مدرسہ کے کاموں کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں اور اِن کے دوسرے برادران ناصر علی خاں واحمد علی خاں اور دیگر متوسلین، متعلقین و مریدین بھی مذہبی امور میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں اور مدرسہ کی ترقی میں کوشاں ہیں ــــــــ

اللہ جل شانہٗ وعم نوالہٗ اپنے کرم سے اُس عالم میں اُن کے مراتب عالیہ کو بلند و بالا فرمائے اور اِس عالم کے اندر اُن کے مخلصین ومعتقدین کو کامیابی وکامرانی عطا فرمائے۔ آمین

۱۹۵۴ء حیاتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظامِ عفت و عصمت ۔ تاریخ صقلیہ ۔ تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ۔ تاریخ ادبیات ایران ۔ تاریخ علم فقہ ۔ تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند بنگال ۔ تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظامِ حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ۔ صدیق اکبر ۔ تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ۔ انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ۔ تاریخ گجرات ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۔ مصائب و زوال ...

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط ۔ امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے ۔ عرب و ہند ۔ تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ۔ معارف الآثار ۔ نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ رد ۔ ... ضلع بجنور ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ۔ عرب و ہند عہد رسالت میں ۔ ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات ۔ لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ مورعشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ۔ تفسیر مظہری اردو جلد ششم ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ۔ تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ۔ تاریخ الفخری ۔ حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحئی ۔ تفسیر مظہری اردو جلد نہم ۔ مآثر و معارف ۔ حکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم ۔ بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ ضیاء تنزیلی ۔ عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. . (N) 231 PHONE : 262815 SEPTEMBER 1984
R. No. 965—57 Subs. 40- Per Copy Rs. 3-50

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا۔

ٹائیٹل جلال پریس جامع مسجد دہلی ۶

اکتوبر ۱۹۸۴ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

قیمت سالانہ: چالیس روپے

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی

مطبوعاتِ ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ فہم قرآن ۔ تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" ۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" ۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول ۔ اسلام کا نظامِ حکومت ۔ سٹرٹیو ۔ تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" ۔ تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے) (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر ۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن ۔ اسلام کا نظامِ مساجد ۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا ۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابتِ حدیث ۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخِ چشت ۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

برہان

سالانہ چندہ
چالیس روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۳ | محرم الحرام ۱۴۰۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۴ء | شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

ایران میں انقلاب اور اس کی موجودہ حکومت کے متعلق راقم الحروف وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا ہے، ابھی گذشتہ ماہ دسمبر میں جنوبی افریقہ کے ایک سفر میں انٹرویو دیتے ہوئے راقم الحروف نے کہا تھا کہ میرے نزدیک انقلاب بہرحال اسلامی ہے اس کو سنی یا شیعہ کہنا درست نہیں ہے البتہ ایران کی موجودہ حکومت کو اسلامی نہیں کہا جاسکتا اور اس کے لئے ہمیں ابھی انتظار کرنا چاہیئے۔ راقم الحروف کا ایران کے انقلاب کے متعلق یہ تاثر اس مشاہدے اور تجربے پر مبنی تھا کہ انقلاب سے پہلے ایرانی طلبہ اور طالبات کی ایک بڑی تعداد علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پارہی تھی اور یہ سب وضع قطع لباس اور معاشرت اور اخلاق و عادات کے اعتبار سے مغربی تہذیب میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن انقلاب کے برپا ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ان نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی حالت یکسر منقلب ہوگئی، لڑکوں نے ڈاڑھیاں بڑھالیں، انگریزی لباس ترک کر دیا اسی طرح لڑکیوں نے مغربی لباس اور نیم برہنگی ترک کر کے چادر اور لباس ساتر اختیار کرلیا۔ پھر یہی نہیں بلکہ ان سب لوگوں نے سرسید نگر میں ایک بہت بڑا مکان کرایے پر لیا جس میں پنجوقتہ اذان کے ساتھ نماز با جماعت ہوتی تھی روزانہ عشاء کے بعد باقاعدہ درس قرآن ہوتا تھا اور آئے دن وعظ اور تبلیغ کے اجتماعات ہوتے تھے، ان تمام چیزوں سے متاثر ہونا ایک امر طبعی تھا

اس بنا پر انقلاب کے بعد ہی میں نے برہان میں جو نظرات لکھے تھے اس میں اس انقلاب کی بہت تعریف کی تھی لیکن انقلاب کے برپا ہونے کے بعد وہاں جو حالات پیش آئے ان کی وجہ سے شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے، اور اس بنا پر میں بالکل خاموش ہو گیا، اس درمیان میں مختلف مقالات اور مضامین ان حضرات کی طرف سے شائع ہوتے رہے جنھوں نے خود ایران پہونچ کر حالات کا مطالعہ بچشم خود کیا تھا یہ مضامین میری نظر سے گذرتے رہے لیکن چونکہ ان مضامین میں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد خیالات و افکار کا اظہار کیا گیا تھا اس بنا پر میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا اور تردد و تذبذب کے عالم میں رہا۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے برادر محترم مولانا محمد منظور نعمانی کو کہ انھوں نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ان کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا جو خود علامہ خمینی کے قلم کی رہین منت ہیں ان کتابوں میں علامہ خمینی نے نہایت وضاحت اور صراحت کے ساتھ ان بنیادوں کو بے جھجھک اور بے تامل بیان کر دیا ہے جس پر انقلاب ایران مبنی ہے اور حکومت کے اس نصب العین اور منہج و طریق کار کی بھی وضاحت کر دی ہے جس پر وہ اب اپنی حکومت کو چلا رہے ہیں اور آئندہ بھی اسی نہج پر کام کرنے کا عزم رکھتے ہیں، مولانا نعمانی نے اپنے اس دقیق اور عمیق و وسیع مطالعے کے نتائج صاف اور شستہ زبان میں نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ماہنامہ الفرقان کی گذشتہ چند اشاعتوں میں شائع کر دئے ہیں، میں نے مولانا کے یہ مقالات بڑی دلچسپی سے از اول تا آخر پڑھے اور اب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ایرانی انقلاب یا موجودہ حکومت کے متعلق میں نے اب تک برہان میں جو کچھ لکھا ہے میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔ الفرقان کے یہ مضامین اس درجہ اہم اور بصیرت افروز ہیں کہ ان

کے مطالعے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان ان سے اختلاف کی جرأت کرسکتا ہے، جی تو چاہتا تھا کہ میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھوں لیکن اس سے خواہ مخواہ مذہبی بحثوں کا دروازہ کھلتا ہے جن میں الجھنا میری افتادِ طبع کے خلاف ہے۔ ضرورت ہے کہ مولانا النعمانی کے ان مضامین کو کتابی شکل میں چھاپنے کے علاوہ ان کا عربی، انگریزی اور فارسی میں ترجمہ بہت بڑی تعداد میں شائع کیا جائے۔

بہر حال علامہ خمینی کا ہم سب کو اس لئے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اگر وہ چاہتے تو تقیہ کے اصول پر عمل کر کے عالمِ اسلام کی عام ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اپنے ان افکار وخیالات کو جو انھوں نے اپنی کتابوں میں ظاہر کئے ہیں، بیان نہ کرتے۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ نہایت صفائی اور وضاحت سے اپنے بنیادی عقائد وافکار کو اپنی تصنیفات میں بیان کر دیا ہے اور اس کے بعد عالمِ اسلام کو موقع دیا ہے کہ وہ ایران کے انقلاب اور اس کی حکومت کے متعلق اپنا موقف متعین کریں۔ یقیناً یہ بہت بڑی جسارت اور خود اعتمادی کی دلیل ہے جس پر علامہ خمینی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۲)

سعید احمد اکبر آبادی

وقت گذرنے کے ساتھ بے تکلفی بڑھتی رہی اور ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ میں مفتی صاحب کے خاندان کا ایک فرد ہو گیا اور مفتی صاحب میرے خاندان کے، چنانچہ ایک مرتبہ اماں جی (مفتی صاحب کی والدۂ محترمہ، جن کی وفات پر میں نے مہاجر میں ایک مضمون بھی لکھا تھا) نے مجھ سے فرمایا: میرے دو نہیں بلکہ تین بیٹے ہیں، عتیق، جلیل اور سعید۔ لیکن اس تمام بے تکلفی اور قربت کے باوجود مفتی صاحب اور میرے درمیان سن وسال اور مرتبہ و مقام کا جو فاصلہ تھا اس کو میں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ چنانچہ میں ان کو اپنا برادرِ بزرگ سمجھتا تھا اور وہ مجھ کو برادرِ خورد جانتے تھے، لیکن ایسا برادر جو دوست بھی ہو، کسی نے ایک عقلمند سے پوچھا: بھائی بہتر ہوتا ہے یا دوست؟ اس نے جواب دیا: وہ بھائی کس کام کا جو دوست نہ ہو، اور میں دوست بھی تھا اور بھائی بھی، اس لئے یہ رشتہ بہت قوی تھا اور مضبوط بھی۔

میں ایک برس والدہ صاحبہ وغیرہا کے ساتھ محلہ ابو المعالی میں رہا، پھر سب لوگ آگرہ چلے گئے تو میں بڑے بھائیوں کے محلہ میں ایک مکان میں رہنے لگا۔ اس کے

بعد میں نے مدرسہ کے اندر رہنے کا ارادہ کیا تو مدرسہ کے صدر دروازے کے اوپر جو ایک کمرہ بنا ہوا ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی، جن کا شمار اکابر اساتذہ دارالعلوم میں ہوتا تھا رہتے تھے۔ اس کمرہ کی بغل میں ایک کمرہ ہے، والد صاحب قبلہ کی خواہش کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے میرے لئے یہ کمرہ تجویز کیا کہ میں ایک طرف خود ان کی اور دوسری جانب مولانا سراج احمد صاحب رشیدی کی براہ راست نگرانی میں رہوں، اس طرح بسلسلۂ طالب علمی میرے قیام دارالعلوم کے تین دور ہیں، دور اول میں میں گوشہ نشین رہا۔ گھر سے مدرسہ اور مدرسہ سے گھر، بس یہ میری دنیا تھی، طلبا سے خلا ملا بالکل نہیں تھا، البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں مفتی صاحب سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہوتی تھی، دور ثانی میں تعلقات کا حلقہ وسیع ہوا، میں نے طلبا کی انجمنوں کے جلسوں میں شرکت اور ان میں تقریر کرنا شروع کر دیا۔

اس سلسلہ میں ایک مرتبہ یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح کے ہاں ان کی بیٹھک میں روزانہ مغرب سے عشار تک مجلس ہوتی تھی جس میں خالص علمی اور دینی گفتگو ہوتی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں بھی اس مجلس میں شریک ہوتا تھا، ایک روز میں اور مفتی صاحب ہم دونوں اس مجلس میں حاضر ہوئے تو حضرت الاستاذ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: میاں سعید! تم تقریر کی مشق بھی کرتے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! جمعیت محمودیہ کا جلسہ ہر جمعرات کو عشار کے بعد ہوتا ہے، میں اس میں شریک ہو کر تقریر کرتا ہوں، مفتی صاحب کو بھانجی مارنے میں مزہ آتا تھا، فوراً بول پڑے، حضرت! یہ تقریر کیا کرتے ہیں، بس مولانا ابوالکلام آزاد کی کسی تقریر کے ایک جز کو رٹ لیتے ہیں اور جلسہ

میں آکر اسے اُگل دیتے ہیں۔ حضرت الاستاذ نے یہ سنا تو بے ساختہ ہنس پڑے، پھر فرمایا: شروع شروع میں یہ عادت بُری نہیں، اچھی ہے، کیونکہ اس طرح ایک نامور ادیب وخطیب کے خاص خاص جملے اور الفاظ زبان زد ہو جاتے ہیں اور مقرر اپنی تقریر میں انھیں الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے اور اس طرح ایک دن وہ خود صاحبِ طرز اچھا مقرر بن جاتا ہے، لیکن یہ عادت مستقل ہرگز نہ ہونی چاہیئے، یہ بات تو ختم ہوگئی، لیکن اس کے بعد حضرت الاستاذ نے جو حکیمانہ بات کہی وہ بھی سننے کے لائق ہے، ارشاد ہوا: ہاں میاں! تقریر کی مشق ضرور کیا کرو، یہ سمجھو کہ انسان کا سر ایک صندوق ہے اور زبان اس کی کنجی ہے، اب فرض کرو تمھارے پاس ایک صندوق ہے جو ہیرے جواہرات سے پُر ہے لیکن اگر صندوق کی کنجی تمھارے پاس نہیں ہے تو پھر صندوق کس کام کا؟ اس سے نہ خود تم فائدہ اٹھا سکتے ہو اور نہ کوئی دوسرا، ہاں اگر کنجی تمھارے قبضے میں ہے تو اب صندوق تمھارے لئے بھی کار آمد ہوگا اور دوسروں کے لئے بھی۔

اس زمانہ میں مفتی صاحب کے گھر آنا جانا بھی زیادہ ہوگیا تھا اور اس طرح مفتی صاحب کے ذاتی فضائل وکمالات اور خاص عادات واطوار، جن کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا، ان کے مشاہدہ ومعائنہ کا موقع تو ملا ہی تھا، بڑی بات یہ ہوئی کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت بابرکت سے مستفید ومستفیض ہونے اور آپ کی نہایت سادہ اور بے تکلف مگر انتہائی عارفانہ زندگی کے احوال وشئون کے براہ راست اور قریبی مطالعہ کی سعادت نصیب ہونے لگی، حضرت مفتی صاحب کا روحانی مرتبہ ومقام کیا تھا؟ اس کا اندازہ تو میرا ایسا عامی آدمی کیا کر سکتا ہے، البتہ جو بات میں اپنے علم ویقین کی روشنی میں جزم اور قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ فقر و درویشی جس کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے

سرمایۂ فخر فرمایا ہے، اس کا جو عالم میں نے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اقدس میں دیکھا ہے وہ عرب و عجم میں کہیں نظر نہیں آیا، وہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم اور شیخ کامل تھے، ان کے شاگردوں اور مریدوں اور معتقدوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، پھر مدرسہ میں چپراسی اور خدّام بھی کم نہیں تھے، لیکن باایں ہمہ صبح کے وقت مدرسہ جانے سے پہلے گھر کا سودا سلف لینے خود بازار جاتے تھے اور بازار جاتے وقت آس پاس کے گھروں کی عورتوں سے پوچھ لیتے تھے تاکہ انھیں کچھ منگانا ہو تو وہ بھی لیتے آئیں۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت و توجہات عالیہ سے میں نے کیا کچھ حاصل کیا ہے اس کا ذکر آیندہ جستہ جستہ آتا رہے گا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ سنئے، ایک مرتبہ حضرتِ موصوف مفتی صاحب کو اور مجھے ساتھ لے کر ایک بیل گاڑی کے ذریعہ دیوبند سے دس بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں پہونچے اور اپنے ایک مرید یا معتقد کے گھر قیام فرمایا، یہ مغرب سے ذرا پہلے جھٹ پٹے کا وقت اور موسم سرما کے آغاز کا زمانہ تھا، عشاء کے بعد کھانا آیا تو وہ باجرے کی روٹی اور چنے کے ساگ پر مشتمل تھا اور شاید کوئی چٹنی یا اچار بھی اس کے ساتھ تھا، یہ دیکھتے ہی مفتی صاحب کے ماتھے پر بل پڑ گیا، ان میں ایک کمال یہ تھا کہ کیسا ہی کوئی مجمع ہو وہ کسی ناگوار سے ناگوار احساس کو ظاہر کئے بغیر نہ رہتے تھے مگر ذرا مسکراتے ہوئے آنکھوں کی ایک خاص گردش اور معصومانہ لب ولہجہ کے ساتھ اس کا اظہار اس بلیغ انداز میں کرتے تھے کہ وہ ایک لطیف طنز ہوتا تھا اور سامعین برا ماننے کے بجائے اچانک ہنس پڑتے تھے، تو پھر بھلا اس موقع پر وہ چوکنے والے کہاں تھے، بولے: اباجی! کیا تذکیۂ نفس کی ایک شرط باجرے کی روٹی اور چنے کا ساگ کھانا بھی ہے؟ حضرتِ مفتی صاحب کو ہنسی آگئی اور نرم اور دھیمی آواز میں فرمایا:

میاں عتیق! کھا کے تو دیکھو، کیا مزے کی چیز اور جاڑوں کا تحفہ ہے، پھر حضرت مجھ سے مخاطب ہوئے اور پوچھا: تمھاری کیا رائے ہے! میں نے عرض کیا: حضرت! سبحان اللہ، یہ گرم گرم روٹی اور اس پر خالص چپڑا ہوا اور یہ ساگ خالص گھی میں بگھرا ہوا۔ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، ہم شہر والوں کو یہ کہاں نصیب! حضرت مفتی صاحب یہ سن کر خوش ہوئے اور فرمایا: اصل مقام شکر ایسی ہی چیزیں ہیں جن کو عرف عام میں ادنیٰ اور معمولی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان چیزوں پر شکر کرنے میں انسان کا اپنے متعلق اعتراف، ہیچ میرزی بھی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے ایک ایسی بات کہی کہ اسے سن کر کم از کم مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میرے دل پر ایک نشتر سا لگ گیا، ارشاد ہوا: یوں تو میں امیروں اور دولت مندوں کے ہاں ان کے مکلف کھانے بھی کھاتا ہوں اور ان کو اللہ کی بڑی نعمت جان کر شکر ادا کرتا ہوں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ گھر کا سادہ کھانا کھانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب کے احساس سے قلب میں انشراح اور طمانیت کی جو کیفیت میں محسوس کرتا ہوں وہ مکلف کھانوں میں محسوس نہیں ہوتی، مفتی صاحب پر اس گفتگو کا کیا اثر ہوا؟ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ میں نے یہ دیکھا کہ انھوں نے دیہاتوں میں جانا عموماً ترک کر دیا تھا اور اگر کبھی حضرت مفتی صاحب نے ساتھ چلنے کو کہا بھی تو انھوں نے کہہ دیا: جلیل (قاری جلیل الرحمن صاحب، مفتی صاحب کے برادر خورد) کو ساتھ لے جائیے، مجھ سے مٹی کے ڈھوبروں میں نہیں کھایا جاتا۔

ہاں تو ذکر میرے قیام دار العلوم کے دور ثانی کا ہو رہا تھا جب کہ میں بڑے بھائیوں نامی محلہ کے ایک مکان میں رہتا تھا جسے مردانہ مکان ہونے کی وجہ سے بیٹھک کہتے تھے، اس بیٹھک میں میرے ساتھ مفتی صاحب کے پھوپا ڈپٹی محمد اشفاق صاحب کے

فرزند ارجمند مولوی محمد آفاق بھی رہتے تھے جو دار العلوم میں پڑھتے تھے اور اسباق میں مجھ سے جونیر تھے، اس لیے کبھی کبھی یعنی ہفتہ میں تین چار دن مجلس ہمارے ہاں اس بیٹھک میں جمتی تھی جس میں چار پانچ احباب شریک ہوتے تھے اور یہ سب دار العلوم کی مختلف جماعتوں میں پڑھتے تھے، مجھ سے تعلق کی وجہ سے مفتی صاحب بھی ان مجلسوں میں شرکت کرتے تھے، ارکان مجلس سب ہی فارسی اور اردو شعر و ادب کا پاکیزہ اور شگفتہ ذوق رکھتے تھے اور خاص طور پر مفتی صاحب کا ذوق تو بہت ہی رچا بسا تھا اور وہ اگرچہ شعر تو نہیں کہتے تھے لیکن سخن فہم اعلیٰ درجہ کے تھے اور اس کی وجہ ایک تو خاندانی خصوصیت تھی اور پھر اکابر دیوبند کی اولاد کی طرح مفتی صاحب نے دار العلوم کے درجۂ فارسی کے پنج سالہ نصاب کی تکمیل کی تھی اور ان کے استاد مولانا محمد یٰسین صاحب تھے جو اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کی مہارت میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، اور ان کی تعلیم کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم میں فارسی زبان و ادب کا پختہ ذوق پیدا ہو جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مفتی صاحب کے ایک چچا زاد بھائی جو ان کی پھوپی زاد بہن کے شوہر ہونے کے رشتہ سے بہنوئی بھی ہوئے جمیل الرحمٰن تھے، یہ انگریزی میں بی اے تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، مگر تھے نہایت ذہین اور طباع، اردو زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، طبیعت میں غضب کی روانی تھی، نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت تھی، جمیل تخلص کرتے تھے اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے، تپ دق میں بیمار ہو کر جوانی میں چل بسے تھے[1] مفتی صاحب اور مرحوم میں رشتہ داری کے علاوہ ہم مذاقی کے باعث

---

[1] عرصہ دراز ہوا ماہنامہ جامعہ، نئی دہلی میں، جب کہ اس کے اڈیٹر مولانا اسلم جیراجپوری تھے میں نے مرحوم پر ایک مضمون "اردو کا ایک جوان مرگ شاعر" کے عنوان سے لکھا تھا۔ میں نے مرحوم کو نہیں دیکھا تھا، مفتی صاحب سے جو کچھ سنا تھا مقالہ کی بنیاد وہی تھا۔

بہت گہرا ربط و تعلق تھا، وہ اول درجہ کے سخن سنج و سخن گو اور یہ اعلیٰ قسم کے سخن فہم و سخن شناس، کوئی نئی غزل یا نظم جب تک مفتی صاحب کو سنا کر اس کی داد نہ لے لیتے انھیں چین نہ آتا تھا۔ پھر پڑھتے بھی بہت خوب تھے۔ مفتی صاحب کا بیان ہے جب وہ مترنم ہوتے تھے ایک سماں بندھ جاتا تھا، مفتی صاحب کو ان کی غزلوں کی غزلیں یاد تھیں۔

اب مفتی صاحب کے ذوق شعر و ادب کا یہ پس منظر ذہن نشین کر کے سنیے ہماری اس مجلس میں گفتگو کا موضوع عموماً شعر و ادب ہوتا تھا، فارسی اور اردو دونوں کا کبھی عرفی اور نظیری پر تنقید ہو رہی ہے اور کبھی غالب کے مشکل اشعار مثلاً:
"ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق" یا "مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی" وغیرہ وغیرہ، ان میں سے کوئی شعر لے لیا اور اس پر بحث شروع کر دی، مفتی صاحب ان گفتگوؤں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے اور بڑی جچی تلی بات کہتے تھے جس سے ان کے مخصوص ادبی افکار و نظریات کا علم ہوتا تھا۔ مثلاً فارسی شاعری میں تغزل کے اعتبار سے عرفی اور نظیری کو امیر خسرو سے بڑا شاعر مانتے تھے، کہتے تھے، خسرو میں قدرت کلام اور جزاست فکر بے پناہ ہے، لیکن سوز و گداز اور احساسِ درد و غم جو تغزل کی جان ہے عرفی اور نظیری کے کلام میں خسرو سے زیادہ ہے، اسی طرح مفتی صاحب اردو شعرا میں غالب کی عظمت فکر خیال اور اس کے تیکھے انداز بیان کے معترف تھے لیکن اس کے باوجود ان کے نزدیک تغزل میں مومن کا مرتبہ غالب سے اونچا تھا اور اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ مومن میں جو سوز و گداز اور خود سپردگی ہے وہ غالب کے یہاں اس کی انانیت اور خود پرستی کی وجہ سے مفقود ہے اس سلسلے میں ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ دیکھئے غالب کا ایک شعر ہے:

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

اس شعر میں کس درجہ انانیت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے خود کہا ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

اس کے بالمقابل اب مومن کا شعر دیکھئے ۔ کہتے ہیں :

اس نقشِ پا کے سجدے نے کتنا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ان دونوں شعروں میں کتنا بڑا فرق ہے ارباب ذوق اس کا اندازہ کر سکتے ہیں ۔ ایک مرتبہ مفتی صاحب نے اپنے خاص درد بھرے لہجے میں مومن کی یہ غزل سنائی جس کے تین شعر مجھے اب تک یاد ہیں :

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بے نالہ منہ سے گرتے ہیں بے گریہ آنکھ سے — اجزائے دل کا نہ حال نہ پوچھ اضطراب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع — مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

ان شعروں کو سنانے کے بعد مفتی صاحب نے بڑی قوت سے کہا کہ غالب کے پورے دیوان میں اس غزل کا کوئی جواب نہیں ہے ۔ پھر ایک مرتبہ کہا کہ میں ہی نہیں بلکہ خود غالب بھی مومن کے قائل تھے اسی وجہ سے تو جب انھوں نے مومن کا یہ شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سنا تو غالب پھڑک اٹھے اور انھوں نے کہا کہ میں اس شعر کے بدلے میں اپنا پورا دیوان دینے کے لئے تیار ہوں غرضیکہ ہماری اس مجلس میں اسی قسم کے ادبی مذاکرے ہوتے تھے اور مفتی صاحب اپنے بلند ذوقِ شعر و ادب کے جوہر دکھاتے رہتے تھے جس سے ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوا ۔

"فارسی ادب پر"
مثنوی مولانا روم کا اثر

از ڈاکٹر نجم الآفاق صدیقی
ایم - اے - ڈی - فل -

مذکورہ بالا عنوان مثنوی مولانا روم کی ادبی، لسانی اہمیت کی وضاحت کا مقتضی ہے اس سلسلہ تحریر میں ہمیں فارسی ادب کی تدریجی ترقی، اسلوب بیان، خیالات اور رجحانات کے ماتحت مولانا روم کے علمی کارناموں، خاندانی ماحول، تعلیم و تربیت، ان کی اخلاقی اور تعلیمی ارتقاء، صحبت، اساتذہ، تعلیم گاہ اور سب سے زیادہ ان کی روحانی اصلاح کے سلسلے میں واضح طور پر نہ سہی اجمالاً تبصرہ کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ فن شاعری کی مشہور صنف مثنوی کی تعریف اس کے تدریجی ارتقاء سے بحث کرنی ہوگی۔ سب سے اہم اور ضروری موضوع جس کی وضاحت کے بغیر مضمون تشنہ رہے گا اور تصوف، اس کی اصطلاح، اس کی معنویت، اثرات اور تمام ضروری مسائل کو روشناس کرانا ہوگا۔

فارسی ادب میں جو اصناف ممتاز طور پر قابل اعتنا ہیں وہ قصیدہ، غزل اور مثنوی ہیں جیساکہ ایک مشہور قطعہ عام طور پر زبان زد عوام ہے۔

در شعر سہ تن پیمبران اند ... ہر چند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را ... فردوسی و انوری و سعدی

شاعر نے غالباً یہ قطعہ شاہنامہ کی تصنیف کے بعد کہا ہے جس کا تعلق مثنوی مولانا روم کے بہت بعد کا ہے۔ بیشک شاہنامہ بہت قابل قدر کتاب ہے اور فردوسی لائق تحسین لیکن یہ وہ دور ہے جب رزم و پیکار کا بازار گرم تھا۔ اطائی کا رزمیہ پوری آب وتاب سے مشاہیر ادب کا پسندیدہ تھا جس کا جواب نہ تھا، خدا نے فردوسی کو سلیقہ بخشا اور اس نے شاہنامہ لکھ کر عزت حاصل کی، ایسے ہی قصائد میں بھی انوری سے بڑھ چڑھ کر شعراء وجود میں آگئے۔ ہاں ان تین شعری پیغمبروں میں شرف قبول کی پائدار شہرت حضرت سعدی کو ایسی ملی کہ کسی دور میں کسی حال میں ان کی مجموعی شہرت میں کمی نہ آئی، سعدی کا کارنامۂ اعظم ان کی مقبول ترین تصنیف گلستاں بوستاں ہے جو آج بھی اسی آب وتاب، قدر وقیمت اور کثرت سے چھپتی بکتی اور پڑھی جاتی ہے۔ فارسی ادب کی یہ بے مثل کتاب اپنی مقبولیت اور پسندیدگی کی بنیاد پر آج بھی سرمایۂ افتخار روزگار ہے۔ غور طلب یہ بات ہے کہ دراصل گلستاں بوستاں کی مقبولیت اتنی اس قدر کیوں ہے تو دو باتیں جو بظاہر صاف نمایاں ہیں ہر کس وناکس کی سمجھ میں آجائیں گی۔ مذہب اسلام جس کی بنیاد تعلیم اور جس کا مطمح نظر انسانی اطوار کی اصلاح فطرت انسانی پر قائم رہ کر ہر طبقہ کے آدمیوں کا آدمی بنانا ہے اور جو اپنے طرز عبادت اور معاملات میں ساری دنیا کے مذاہب سے منفرد ہے جس کا نظام عوام، خواص، امیر وغریب سب سے یکساں ہے جس نے نہ تو تیاگ اور تجرد کی تعلیم دی ہے اور نہ ایسی ریاضت ومشقت کا پابند کیا ہے جو بعض مذاہب نے اصلاح وعمل سے جائز رکھے ہیں نہ ضبط وبرداشت کی ایسی تعلیم دی ہے کہ ایک گال پر تھپڑ کھاکر دوسرا گال سامنے کردو بلکہ اس کی تعلیم فطرت یہ ہے کہ ہر حال میں اپنی انا کو فنا نہ ہونے دو عزت نفس پر قائم رہو دانت کا بدلہ دانت اور نقصان کا بدلہ نقصان ہے لیکن ذرا بھی تجاوز نہ ہو چونکہ تجاوز نہ ہونے پر عوام کو قابو نہیں لہذا حکم ہے کہ اسے معاف کردو اور ساتھ ہی یہ کھلی ہوئی تعلیم ہے کسی حال میں علیحدگی پسندی نہ اختیار کرو۔ سب سے کٹ کر پہاڑ۔ کھوہ۔ غار میں جاگزیں نہ ہو۔ البتہ گوشہ نشینی، ایسی جگہ کی تلاش جہاں سکون سے عبادت یا سوچ بچار ہوسکے جائز ہے

خواہ غار ہو یا مسجد، کوئی گوشہ ہو یا جنگل لیکن کسی حال میں بھی متعلقین سے غفلت جائز نہیں ہے۔ جو حقوق واجب ہیں ان کی ادائیگی تمام طاعت وعبادت اور گوشہ نشینی پر مقدم ہے آدمیوں کا آدمیوں سے ملنا جلنا نہ ہوگا تو ان کی اخلاقی کمزوریوں کا اندازہ کیسے ہوگا اور ان کمزوریوں کی اصلاح کیسے ہوگی۔ پھر ماں باپ کے حقوق، ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک، بیوی بچوں کی دیکھ ریکھ، عام آدمیوں سے مناسب برتاؤ معاشرت اور معاش کے ضابطوں پر عمل کیسے ہوگا جب کہ انھیں سبھوں پر صحیح عمل ہی مذہب ہے۔ سعدی صاحب نے اپنی تصنیف گلستاں بوستاں میں انھیں موضوعات کے پیش نظر بیش بہا نظریے، قصص، روایات، تمثیلیں جمع کر کے دوامی شہرت پائی ہے یہ ان کا خلوص ان کی بزرگی تھی کہ مقبول دو عالم ہوگئی۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان تمام حسنات کی محرک اور ترغیب دینے والی طاقت کو یہ بات ہر ذہن پر خود بخود روشناس ہو جائے گی جسے ہم صرف ایک مثال سے سامنے لا رہے ہیں اور وہ یہ کہ خلاق عالم نے ساری کائنات کی تخلیق میں جس صناعی سے کام لیا ہے وہ یہ ہے کہ اُس پروردگار نے اس عالم فانی کو مجموعہ تضاد بنایا ہے۔ حکما و عقلاء کے نزدیک تضاد کا اجتماع محالات سے ہے یعنی آگ پانی، سیاہ سفید ایک ہی جگہ ناممکن ہے کہ جمع ہوں لیکن اس صناع مطلق نے ہر جگہ اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ دن، رات، آرام و تکلیف، بلند و پست، خشکی و تری عذاب و ثواب، نیکی و بدی، مروت، بے مروتی ہے یہی تضاد حسن تخلیق کائنات ہے اور بنیاد آفرینش۔ فرشتے اللہ کی تسبیح میں محو تھے سارا عالم ساکن غیر متحرک اور یکساں تھا تخلیق نے آفرینش آدم کے ذریعے سکون کو حرکت سے جمود کو زندگی سے بدلا۔ زندگی کو اونچ نیچ دی آرام تکلیف بخشا، حدود حدودی اور اختلافات و تصادم کا مجموعہ بنا کر ہماہمی پیدا کی اور اسی جذبۂ خصوصی کی بتدریج ترقی نے آدمیوں کو خواہش بخشی، تکمیل خواہش کا جذبہ دیا جس سے ابتداءً بڑے بڑے جھگڑے کھڑے ہوئے۔ قوت نفس نے خود غرضی پیدا کی۔ ہر شخص ایک دوسرے کا مدمقابل آیا باہم ٹکراؤ ہوئے۔ انفراداً پھر اجتماعاً یہی ہماری فطرت بن گئی، وہ تنہا آدمی جماعتی

روپ میں آکر دنیا کے گوشوں میں پھیلنے لگا۔ پھر اس نے جنگلی زندگی سے اعلیٰ زندگی اختیار کی اور آہستہ آہستہ ان کی زندگی میں قانون قاعدے وضع ہوئے۔ جھگڑوں نے صلح اور میل جول کے ضابطے بنائے، تدریجاً ساری دنیا کے حصوں میں آدمی اپنے اپنے علاقوں اور زمینوں آب و ہوا اور ماحول کے اثر سے سدھار قبول کر کے اپنی اپنی جگہ ہموار اور استوار زندگی گزارنے لگے تھوڑے تھوڑے علاقوں پر قابض ہو کر اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے رجحانات کے رہنے سہنے کے ضابطے جینے کے ڈھنگ، ایک دوسرے سے حسن سلوک سے پیش آنے کے قوانین بنائے انھیں ضابطوں کی وضاحت کے بغیر یہ بات ظاہر کرنی مناسب ہے کہ اکثر و بیشتر بڑے بڑے علاقہ داروں اور طاقتوں میں ایسے ایسے تصادم بھی ہوئے جن کی بنیاد پر بنائی تہذیب تہس نہس ہو گئی۔

حقیقتاً اصول زندگی کے ضابطے ہی معاشرت کہلائے، حصول رزق کی جدوجہد کے نتائج کو ہم نے معیشت قرار دیا۔ باہمی رابطہ کا نظم، اخلاق کہلایا۔ حکمرانوں کا نفاذِ احکام جن اصولوں پر مبنی رہا، سیاست بنا۔ طاعت اور بندگی خدا شناسی کی جدوجہد مذہب کے روپ میں ابھری، الغرض تمام ابتدائی اصول مرور ایام کے ساتھ باضابطہ فن اور علم بن گئے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اسلامی تعلیم دو حصوں پر تقسیم ہے، شریعت اور طریقت۔ شریعت، احکام عبادات و معاملات و قوانین اسلام کی عملی حالت کی تشریح اور فرائض کے مسائل کا مجموعی ضابطہ ہے۔ فرائض میں حق العباد، مسائل اور قوانین نیز حق اللہ کے مسائل و قوانین شامل ہیں یعنی حج، روزہ، نماز، زکوٰۃ اور جہاد کے جملہ مسائل، نیز انسانی حقیقت سے باہمی تعلقات کے تمام حقوق جس کا سارا تعلق انسانی ظاہری اعمال، اجسام، رسم و رواج، رہن سہن، میل جول اور معاشرتی نظام سے ہے۔ دوسرا پہلو طریقت کا ہے جس کی روح رواں تصوف ہے۔ طریقت بندہ اور خدا کا وہ صحیح لگاؤ ہے جس کی بنیاد پر مالک اور غلام کا تصور ابھرتا ہے۔ خالق کائنات کا زبانی اقرار اور اس کے احکام پیش کردہ انبیاء پر عمل شریعت ہے اور عملاً یقین، فعلاً عمل اور ہمہ اوقات تصوراتی انداز میں

عبادت تصوف کا اجمال ہے۔

اب ہم لفظ تصوف کی تشریح اور اس کی معنویت پر تبصرہ کیے بغیر اپنے مضمون کو آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھتے۔ لہذا عام زبان میں تصوف علم و عمل سے مرکب جذبہ یا حالت یا عمل کو سمجھا جاتا ہے بظاہر شریعت میں بھی علم و عمل کا نام صاحب شریعت ہونا ہے لیکن اس کے برعکس تصوف کی اجمالی تعریف یہ ہے کہ پہلے عمل ہو اور اس پر مداومت پھر اس عمل کے نتیجہ میں علم پیدا ہو۔ وضاحت یہ ہے کہ تمام آدمیوں کو اشیاء کا جو ادراک ہوتا ہے اس کا عام ذریعہ طریقہ تعلیم و تعلم ہے یعنی بات جان کر علم حاصل کر کے جو نتیجہ ذہن اخذ کرتا ہے وہی معلومات کہلاتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بغیر غور و فکر دفعتہً ایک چیز کا علم ہوتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کیسے ہوا۔ کیوں کر ہوا۔ اصطلاح میں ایسے علم کو الہام کہتے ہیں لیکن یہ الہام عام نہیں ہے یہ نتیجہ ہے تزکیۂ نفس کا اور تزکیۂ نفس ریاضت اور عمل کا نتیجہ ہے جو انسان کا قلب تمام دنیاوی محبتوں۔ دل فریب اشیاء کی کشش اور ہوسناک دلچسپیوں اور تعلقات سے کنارہ کشی کرنے اور یکسو ہو کر خدا کی مرکزی اشیائی قوت کی طرف متوجہ ہونے اور ہوا و ہوس سے مطلقاً احتراز کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے یہ تصوف کی راہ کا بنیادی اور ابتدائی اصول ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی ابتدائی صورت حال کے ساتھ حسب مشق۔ ریاضت اور محنت کو مداومت حاصل ہوتی ہے تو تمام حقائق کی پیچیدہ گرہیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ لہذا مختصراً یوں سمجھیے کہ تصوف علوم باطنی علوم کا اجمالی نام ہے تصوف کی راہ پر کامیابی سے چل نکلنے والے کو صوفی کہتے ہیں۔ صوفی خشوع و خضوع کا مجموعہ ہوتا ہے اس پر اللہ کی ہیبت اور خوف و ادب کا غلبہ ہوتا ہے یہ خوف و ادب حقیقی ہوتا ہے جو شرعی قوانین کے خوف و ادب سے مختلف ہوتا ہے مثلاً اللہ کا رازق ہونا سبھی مانتے ہیں اور حقیقتاً اس اعتراف کے ساتھ طلب معاش میں کوشاں رہ کر یقیناً کامیابی کا حقیقی فاعل خدا کو سمجھتے ہیں لیکن طلب معاش کی سرگرمیوں، حصول مقصد کے اضطراب اور کامیابی ناکامی کے ہراس سے دل پاک نہیں رہتا بخلاف ان کے صوفی (جو در اصل ہو) اگر ویرانہ میں

کبھی پہونچ جائے جہاں کوسوں آب رواں نہ ترہو پھر کبھی اسے فکرو الجھن و اضطراب نہ ہوگا کیونکہ صبر و شکر توکل و رضا قناعت اور تواضع کی کیفیت اس پر طاری رہے گی یقیناً صوفی کردار کے مدارج علیحدہ علیحدہ ہیں کسی پر غلبہ اثبات ہے کوئی عالم محویت میں یہاں اس سے بحث نہیں۔

صوفی کا لفظ تصوف سے بنا جو دراصل اپنی اصلیت کے لحاظ سے سوف تھا۔ یونانی زبان میں سوف کے معنی حکمت ہیں۔ سوفی یعنی حکیم کے لیے یہ لفظ بولا جاتا تھا۔ پھر اس کو ص سے بدل کر صوفی کر دیا گیا یہ معنی علامہ البوریحان بیرون کی تحقیق ہے۔ صاحب کشف الظنون نے حکماء اشراقیہ مشرب کو اصطلاحاً صوفیہ کہا ہے۔

مختصراً یہ کہ دوسری تیسری صدی میں طاعت ظاہری عبادت شرعی کے ساتھ تنہائی میں غور و فکر، ذکر اذکار کی مشق اور ریاضت و محنت کی کثرت نیز انسانی خواہشات کی روک تھام نے ایک طرح کی ایسی قوت جسے ہم روحانی قوت کہتے ہیں پیدا کر دی اور بیشتر مسلمان صوفیہ نے خود علم الٰہی سے وافر حصہ پاکر اپنے اردگرد اور اپنے ماحول سے متاثر افراد کو تعلیم دینے کا ڈھنگ پھیلایا جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ دین حق کے دو شعبہ میں علمی اور عملی طاعات عبادات کی ہدایتوں اور حلال و حرام، مکروہ مباح کے احکام نیز ادائیگی حقوق کی وضاحتوں پر مشتمل ہے جس کو اصطلاحاً فقہ بھی کہتے ہیں۔ عملی شعبہ مجاہدات و ریاضت کے ذریعہ روحانی قوتوں اور باطنی کمالات کو قوۃ سے فعل میں لاتا ہے اسی کا نام تصوف ہے مطلب اس تمام تفصیل کا یہ ہے کہ جیسے ہدایہ، درّ مختار علم فقہ کی مایۂ ناز کتابیں اور شعبۂ دین کی علمی حصہ کی اصل اصول ہیں ایسے ہی مثنوی معنوی، اور مثنوی مولانا روم علم تصوف کی روح رواں اور دین کے شعبہ کے اصول مطالب کا لب لباب ہے وصول اصطلاح صوفیہ میں اپنی ہستی سے نجات پاکر عملی ہستی کے حق میں پیوست ہو جانے کو کہتے ہیں اور یقین سے مراد یہ ہے کہ محض صفائی قلب اور قوت ایمان سے مشاہدہ غیب ہو جائے جس میں کسی دلیل کی ضرورت نہ ہو۔

اسرار و صول و یقین ہے مقصود رموز معرفت اور حقائق تصوف میں یہاں یہ بات بہر حال ذہن نشین رہے کہ مذہب کا یہ تعلق علم احکام اور علم تصوف دونوں پر شامل ہے مولانا نے مثنوی شریعت میں علم شریعت اور علم تصوف کو آپس میں ساتھ متضاد سنس پیش کیا بلکہ یہ اُن کا اعلیٰ درجہ کا کمال ہے کہ آپ کی مثنوی مبارک بالکل کلام الٰہی کی طرح احکام شرعی اور مسائل تصوف پر مشتمل ہے، یہ اس قدر پیچیدہ اور مشکل مسئلہ اور موضوع ہے جس سے بڑے بڑوں کو عہدہ برآ ہونا نصیب نہ ہو سکا یہ صرف مولانا کی ذات تھی کہ وہ اس تضاد سے کوئی عہدہ برآ نہ ہو سکے ہیں۔ اسی کامیابی نے یہ شعر کہلوایا ہے کہ :

"مثنویِ مولویِ معنوی   ہست قرآں در زبانِ پہلوی"

اس پیچیدہ اور مشکل بحث کو نظر انداز کر کے ہم عنوان مذکورہ بالا کے بنیادی موضوع کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں اور وہ ہے صاحب مثنوی کا تعارف اور مختصر حال مثنوی۔ شریعت کے مصنف کا نام نامی محمد تھا جس کی وضاحت یہ ہے کہ محمد بن محمد بن حسین بلخی اور ان کا لقب جلال الدین تھا ان کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے آپ کے بزرگ دادا حسین بلخی اپنے عہد کے صاحب حال بزرگ اور نامی گرامی صوفی تھے سلاطین وقت ان کی بے حد تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ محمد خوارزم شاہ جو خراسان سے عراق تک کے تمام ممالک کا ذی اقتدار عالی شان بادشاہ گزرا ہے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اپنی عزیز بیٹی ان کو بیاہ دی تھی جس کے بطن مبارک سے مولانا کے گرامی قدر والد مسمّی بہاؤ الدین محمد پیدا ہوئے جو خود بھی اپنے عہد کے مشہور صوفی عالم اور ایک عالی مقام بزرگ گزرے ہیں جن کی طرف عوام کا رجوع تھا اس سلسلے سے مولانا گویا خوارزم شاہ کے نواسے ہوئے مولانا روم ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے لہٰذا ان کا آبائی وطن بلخ ہی قرار پائے گا۔ ان کی پیدائش گاہ بھی یہیں سمجھئے۔ ان کی پیدائش کے بعد ان کے بزرگ والد کی طرف رجوع عام کی بڑھتی ہوئی صورت حال نے حکومت کو ان کی طرف سے مشکوک کر دیا اور یہ نظر اشتباہ سے دیکھے جانے لگے صوفی منش

بزرگ کو ایسی صورت حال کی برداشت کیسے ہو سکتی تھی چنانچہ آپ نے وہاں رہنا خلاف مصلحت سمجھا اور مریدانِ خاص میں تین سو مخصوص بزرگوں سمیت بعزم ہجرت روانہ ہوگئے راستے میں یہ جدھر سے بھی گزرے اطراف وجوانب کے ذی علم لوگ اور شرفا کا فریاء اور ان کی تقلید میں عوام گروہ گروہ ان سے ملنے آتے تھے۔ یہ ۶۱۰ھ میں نیشا پور جا پہنچے۔ ان کے آنے کی خبر سن کر حضرت خواجہ فریدالدین عطار خود اُن سے ملنے کو آئے اس زمانے میں مولانا روم کی عمر کل چھ سال کی تھی لیکن می تافت ستارۂ بلندی لعینی ان کے بشرہ سے ان کی عظمت ظاہر ہو رہی تھی ــــ خواجہ صاحب مذکور نے شیخ بہاؤالدین ان کے بزرگ والد سے کہا کہ دیکھو تم اس جوہر قابل سے غافل نہ ہونا۔ بہر حال یہ نیشا پور کچھ روز ٹھہر کر بغداد پہنچے جہاں برسوں قیام رہا پھر انھوں نے سفر حجاز اختیار کیا حجاز سے شام ہوتے ہوئے زنجان آئے پھر زنجان سے متعدد شہروں میں ہوتے ہوئے بالآخر قونیہ پہنچے جہاں جاکر ٹھہر گئے۔ قونیہ کے قیام میں جمعہ کے روز ۱۸ ربیع الثانی ۶۲۸ھ میں وفات پائی۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے پاکیزہ بزرگ والد سے ہی حاصل کی۔ شیخ بہاؤالدین (ان کے باپ کے) کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بڑے پایہ کے بزرگ عالم فاضل تھے۔ مولانا کے والد نے اپنی حیات ہی میں انھیں مولانا کے آغوش تربیت میں دے دیا تھا۔ مولانا نے اکثر علوم وفنون انھیں بزرگ سے حاصل کیے۔ والد کی وفات کے دوسرے سال سے جب کہ ان کی عمر پچیس ۲۵ سال تھی تکمیل علوم وفنون کے خیال سے مولانا نے شام کا قصد کیا اور اس زمانے کے دستور کے مطابق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدرسہ جلادیہ کے دارالاقامہ میں قیام کیا۔ طالب علمی کے ہی زمانے میں زبان عربی، فقہ، حدیث، تفسیر اور معقولات میں فضل وکمال حاصل کر لیا جب کبھی بھی کوئی مشکل مسئلہ یا بحث درپیش آتی اور کسی سے حل نہ ہوتی تو لوگ ان ہی کی طرف رجوع کرتے۔ ایک زمانہ کے بعد جب سید برہان الدین قونیہ آئے تو شاگرد استاد کی ملاقات ہوئی دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے اور تا دیر بہر دو پر عالم بے خودی طاری رہا۔ سکون اور افاقہ کے بعد سید نے مولانا کا امتحان لیا اور جب تمام علوم میں ان کو کامل پایا تو کہا اب صرف علم باطنی کی

تعلیم رہ گئی ہے اور یہ تمہارے بزرگ والد کی امانت ہے جو میں تم کو دیتا ہوں اب تک مولانا پر علوم ظاہری کا غلبہ تھا اور وہ بزعم خود اہل علم میں خود کو ممتاز سمجھتے تھے اور خود علم دین کی ترویج کے سلسلے میں شاگردوں کو علوم دینیہ کا درس دیتے تھے۔ وعظ بھی کہتے تھے اور فتویٰ بھی لکھتے تھے۔ انھیں سماع سے سخت پرہیز تھا اور نہایت درجہ احتراز تھا۔ اب ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا جو دراصل حضرت شمس تبریزؒ کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے حضرت شمس تبریزؒ کے والد محترم کا نام علاء الدین تھا تعلیم کی تکمیل کے بعد یہ بابا کمال محندی کے مرید ہوئے یہ سوداگروں کے لباس میں سفری زندگی اختیار کیے ہوئے تھے اکثر مختلف مقامات کی کارواں سراؤں میں قیام کرنے کی صورت پیش آتی رہتی تھی جہاں یہ مراقبہ اور مجاہدہ فرماتے ایک روز انھوں نے خلوص دل سے دعا مانگی کہ الٰہی مجھے کوئی ایسا خاص بندہ ملے جو میری صحبت کا متحمل ہو دعا کی حالت میں عالم غیب سے اشارہ ہوا کہ تم روم جو اناطولیہ کو کہتے ہیں ہے وہاں جاؤ یہ اسی وقت چل پڑے اور سفر ختم کر کے قونیہ پہنچ گئے جہاں پہنچ کر برنج فروشوں کی سرائے میں حسب معمول اترے۔ مولانا کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو وہ ان سے ملنے کو چلے راستہ میں جو بھی ملتا تھا ان کی قدم بوسی کرتا تھا یہ اسی شان سے سرائے کے دروازے پر پہنچے۔ شمس تبریزی نے بھی سمجھ لیا کہ یہی شخص ہے جس کے لیے بشارت ملی ہے۔ دونوں بزرگوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور دیر تک زبان حال سے باتیں ہوتی رہیں شمس تبریزی نے مولانا روم سے پوچھا کہ ذرا بتاؤ بایزید بسطامی کے ان دو واقعات میں کیسے ہیں ـــــــ ہو گی کہ ان کو ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خربوزہ نہیں کھایا اسی خیال کے ماتحت خود بھی ساری عمر خربوزہ نہیں کھایا اور نہ کھانا پسند کیا کیونکہ یہ پتہ نہ تھا کہ اگر کھایا ہو گا تو کیسے کھایا ہو گا دوسری بات یہ کہ وہ خود اپنے لیے فرماتے ہیں کہ سبحانی ما اعظم شانی، یعنی اللہ رے میری شان کس قدر بلند ہے حالانکہ اللہ کے رسول نے اپنی تمام شان اور عظمت کے باوجود فرمایا کرتے تھے میں دن میں ستر بار استغفار کرتا ہوں۔ مولانا نے فرمایا کہ بایزید بسطامیؒ بڑے

پایہ کے بزرگ تھے لیکن مقام ولایت میں وہ ایک جگہ ٹھہر گئے تھے ان کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منازل تقرب میں مسلسل ایک مرتبہ سے دوسرے مرتبہ پر ترقی کر رہے تھے الغرض مولانا اور شمس تبریز کئی ماہ چلہ کش رہے اس ——— کھانا ——— کم ہوگیا اور حالت میں نمایاں تغیر ہوا۔ سماع جس سے نفرت تھی اب اس سے دلچسپی ہوگئی ایسی کہ بغیر سماع قرار نہ ملتا۔ سارے شہر میں یہ بات پھیل گئی کہ فیض رساں مولانا کا فیض پہنچانا ایک دیوانہ کی توجہ سے جاتا رہا کیوں کہ اب مولانا کی دلچسپی درس و تدریس و عظ و پند سے یکسر جاتی رہی تھی۔ یہ گڑبڑی اس قدر پھیلی کہ شمس تبریزی فتنہ و فساد کے بھڑکنے کے خیال سے راتوں رات شہر چھوڑ کر نکل گئے اور دمشق جا پہنچے۔ مولانا کو شمس تبریزی کی مفارقت اس قدر کھلی کہ وہ کسی کام کے نہ رہ گئے روز ——— رہتے اور صدمہ مفارقت سے روتے تھے بالآخر انھوں نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا یہ دیکھ کر لوگوں کو ندامت ہوئی اور وہ دمشق جاکر مولانا شمس تبریزی کو راضی کر کے واپس لائے۔ جو لوگ شمس تبریزی کو منا کر واپس لانے کے لیے جماعتی حیثیت سے تیار ہوئے ان میں مولانا کے فرزند رشید سلطان اس قافلہ کے سالار تھے۔ الغرض یہ لوگ مولانا کا خط لے کر روانہ ہوئے بڑی مشکل سے دمشق میں ان کا پتہ چلا۔ جاکر مولانا کا خط دیا اور ہزار اشرفیاں نذر کیں شمس تبریزی نے کہا کہ مجھے ان ٹھیکریوں کی ضرورت نہیں مولانا کا نام کافی ہے۔ الغرض وہ کچھ دن کے بعد ان سبھوں کے ساتھ دوبارہ قونیہ تشریف لائے۔ ان سب کا ازحد استقبال ہوا بہت ذوق شوق سے ان کا جلوس بنا کر مولانا اپنے گھر لائے اب بڑے جوش و خروش کی محفلیں ہونے لگیں۔ جب مجلسوں کی دلچسپیوں نے سماع کی محفل گرم کی اور باہمی تعلقات نے ذوق و شوق کو مستحکم کیا تو پھر لوگوں کو یہ باتیں ناگوار ہونے لگیں۔ اس بار مولانا کے ایک شاگرد اور فرزند علاء الدین چلیبی سب کا سرغنہ بنا جس کی دراندازی نے مولانا شمس تبریزی کو زیادہ ناخوش کر دیا چنانچہ ایک دفعہ حیلے سے ایسا نکل گئے کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گئے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ان کو زہر دے دیا گیا واللہ اعلم بالصواب نفحات الانس میں

ہے کہ یہ حرکت مولانا کے بیٹے علاء الدین نے کی اسی کتاب میں شمس تبریزی کی تاریخ شہادت ۶۴۵ھ لکھی ہے۔

مولانا کی صحبت دو سال ان کے ساتھ رہی مولانا ریاضت و مجاہدہ میں یکتا تھے کبھی نماز قضا نہیں کی نماز میں بے حد استغراق تھا اکثر عشاء کی نماز کی نیت باندھ کر صبح کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز جاڑوں میں ان پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ان کے آنسوان کی داڑھی میں جم گئے۔ مولانا کبھی کوئی خزانہ پاس نہ رکھتے تھے، بے نیازانہ مزاج تھا اکثر گھر میں تنگی رہی فیاضی اور ایثار کا یہ عالم تھا کہ کبھی سائل محروم نہیں گیا ——— لباس جو بھی سامنے آیا دے دیا اکثر بیٹھے بیٹھے کھڑے ہو جاتے کبھی کبھی عجیب وغریب حالت طاری ہو جاتی تھی کبھی چپکے سے نکل جاتے سماع کی مجلسوں میں کبھی ایسی بیخودی طاری ہوتی کہ کئی کئی دن ہوش نہ آتا تھا مستی اور سکر کی حالت میں قوالوں کو جسم سے کپڑے اتار کر دے دیتے تھے۔ مستی اور سرور اور وجد کی حالت طاری رہتی تھی ۶۷۲ھ میں قونیہ میں بڑے زور کا زلزلہ آیا یہ زلزلہ مسلسل چالیس روز قائم رہا۔ تمام لوگ سراسیمہ اور پریشان ہو گئے آخر مولانا کے پاس آ کر استدعاء دعا کی۔ مولانا نے فرمایا کہ "زمین بھوکی ہے لقمۂ تر چاہتی ہے" وہ انشاء اللہ کامیاب ہو گی" چند روز بعد آپ کا مزاج ناساز تھا۔ اطبائے کامل فن علاج میں مشغول ہوئے مگر تشخیص مرض سے عاجز رہے مولانا سے پوچھا تو وہ مطلق اطباء کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ لوگ ناامید ہو گئے سارے شہر میں کہرام برپا ہو گیا۔ تمام امراء علماء مشائخ حاضر ہوئے جو بے اختیار چیخیں مار مار کر روتے تھے۔ بالآخر جمادی الثانی ۶۷۲ھ کو ۵ تاریخ روز یکشنبہ دن دو بجے وقت، معرفت الٰہی کا سورج ڈوب گیا۔ ہر مذہب کے لوگ شریک ہوئے۔ عیسائی، موسائی، مسلمان، بیشمار آدمی تجہیز و تکفین میں رہے، یہ تھے مولانا روم علیہ الرحمۃ خلاصہ بحوالہ شبلی مرحوم۔

خود مولانا فرماتے ہیں کہ مولانا روم کا قول ہے کہ ———

میں نے یہ مثنوی جو نادر نکات رشد و ہدایات کا مجموعہ ہے اپنے آغاز دست پناہ

معتمد راہ ہدایتی روح رواں، عارفوں کے شیخ۔ ہدایت اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مخلوق خدا کی میں خدا کی امانت۔ بزرگ ترین رہنما ابو الفضائل حسام الدین حسن بن محمد بن حسن بلخی معروف ابن اخی کی تحریک پر لکھی بات دراصل یہ تھی کہ حضرت شمس تبریز کی مفارقت نے مولانا کو وہ قلبی ٹھیس لگائی تھی ان کی ساری مجموعی صلاحیت اک بارگی ابھر آئی پھر حسام الدین نے ایک روز مولانا سے استدعا کی کہ شیخ عطار رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "منطق الطیر" کے طرز پر ایک مثنوی لکھی جائے جواباً مولانا نے فرمایا کہ رات آپ سے آپ خود مجھ کو بھی یہی خیال آیا تھا چنانچہ اس وقت میں نے چند شعر کہے تھے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ نصف مثنوی میں حقیقی محرک مولانا شمس تبریزی رحمۃ اللہ کا عطا کردہ علم معرفت روحانی کمال اور ان کی یعنی مولانا روم کی ذاتی صلاحیت کو دخل تو ہے ہی لیکن دراصل اس کا محرک ان کی مفارقت کے نتیجے میں قلبی سوز و گداز اور شدت احساس ہے پھر مزید یہ کہ ان کے ہم جلیس یا ایسے شاگرد جو استاد کے عزیز ساتھی تھے مولانا حسام کی تحریک بھی دخل انداز ہے چنانچہ مثنوی شریف کے چھ دفتر ہیں اور پہلے دفتر کے علاوہ کردہ تو ایک کیفیت خاص کی بنیاد پر ہے بقیہ پانچوں دفتر ضیاء الحق حسام الدین کے نام سے مشہور رہیں۔

اب ہم اصل موضوع سے متعلق اظہار رائے اور خیال ضروری سمجھتے ہیں۔

مثنوی شریف مذکورہ اپنی مجموعی حیثیت سے جس پایہ کی نظم ہے وہ محتاج بیان نہیں تصوف کے سلسلے کی لکھی ہوئی متعدد مثنویاں سامنے رکھ کر اگر ان کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی عظمت ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

درسِ نظامی کی تاریخی، دینی اور سماجی اہمیت

پروفیسر محمد اسلم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

سلطان التمش

سلطان المشائخ سے روایت ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد کسی نے اُسے خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا ماجرا گذرا۔ سلطان نے کہا کہ حوضِ شمسی تعمیر کرنے کی وجہ سے اس کی مغفرت ہوگئی ہے۔[۵۴]

حضرت نظام الدین سے روایت ہے کہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے فرزندوں کو سرکاری زمین ملی۔ اس زمین کے بارے میں ان کا مقطع سے کچھ اختلاف ہوگیا۔ بیٹوں کے اصرار پر خواجہ بزرگ خود دہلی گئے تاکہ سلطان التمش سے مل کر یہ قضیہ طے کرادیں۔ خواجہ قطب الدین نے اپنے مرشد سے کہا کہ وہ یہ تکلیف نہ کریں، موصوف خود سلطان سے مل کر ان کا کام کروادیں گے۔ جب خواجہ قطب الدین سلطان التمش کے ہاں پہنچے تو وہ انھیں دیکھ کر بڑا حیران ہوا۔ اس سے قبل اس نے ان سے ملنے کی کئی بار

---

۵۴ ایضاً، ورق ۱۱۵ الف۔

خواہش ظاہر کی تھی لیکن خواجہ صاحب اسے اپنے ہاں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ خواجہ صاحب نے سلطان کو مقطع کے ساتھ اختلاف سے آگاہ کیا اور اس نے فوراً ان کا کام کر دیا۔[۵۵]

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ قاضی محی الدین کاشانی سے منقول ہے کہ سلطان شمس الدین التمش اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ ایک ہی سال میں فوت ہوئے تھے۔[۵۶]

معزالدین کیقباد

عام طور پر سلطان معزالدین کیقباد (۱۲۸۷ء تا ۱۲۹۰ء) کو ایک عیاش طبع حکمران سمجھا جاتا ہے جس کے شب و روز فسق و فجور کی مجلسوں میں گذرتے تھے۔

درر نظامی کی روایت ہے کہ کیقباد نے اپنے دادا سلطان غیاث الدین بلبن کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے اپنے ایک معتمد خواجہ سرا کافور کو حکم دیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کو خیرات کیا کرے۔ ایک بار کافور نے اس رقم میں سے دو ٹنکے سلطان جی کی خدمت میں بھی بھیجے جو انھوں نے قبول کر لئے۔ اس کے بعد بھی وہ متواتر کئی جمعے سلطان جی کی خدمت میں بھی کچھ رقم بھیجتا رہا۔[۵۷]

عہد علائی

جس زمانے میں علی بن محمود جاندار درر نظامی مرتب کر رہے تھے وہ

۵۵؎ ایضاً، ورق ۸۳ ب۔

۵۶؎ ایضاً، ورق ۱۱۵ الف۔

۵۷؎ ایضاً، ورق ۱۰۱ ب۔

سلطان علاء الدین خلجی کا دورِ حکومت تھا۔ اس کی سخت گیر پالیسی کے باوجود چوری چکاری عام تھی۔ جامعِ ملفوظات رقمطراز ہیں کہ بزرگوں کے گھر بھی غیر محفوظ تھے۔ ایک بار چور شیخ احمد نہروالی کے گھر کا بھی صفایا کر گئے تھے[۵۸]۔

درر نظامی کے ایک اندراج سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں مسلح ہندو راہزن جنگلوں میں مسافروں کو لوٹا کرتے تھے[۵۹]۔ ایک دوسرے موقعہ پر علی بن محمود جاندار لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں راستے غیر محفوظ تھے[۶۰]۔

علاء الدین خلجی کا عہدِ حکومت خیر و برکت کا دور سمجھا جاتا ہے۔ حضرت نظام الدین اس بابرکت عہد کے لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اکثر لوگوں کے مال حرام اور مشتبہ ہیں[۶۱]۔

آج ہمارے زمانے میں لوگوں کے مال کی کیا حیثیت ہے ؟

قدیم دہلی

جامع ملفوظات لکھتے ہیں کہ ابتداء میں غیاث پور، جہاں حضرت نظام الدین رہتے تھے، ایک معمولی سا گاؤں تھا[۶۲] اور وہاں بہت کم آبادی تھی۔ جب سلطان کیقباد نے کیلوکھری میں سکونت اختیار کی تو لوگوں کی توجہ غیاث پور کی طرف ہوئی[۶۳]۔

علی بن محمود جاندار نے حوض رانی کے نواح میں "باغِ حسرت" کی نشان دہی

---

[۵۸] ایضاً، ورق ۵۷ الف۔

[۵۹] ایضاً، ورق ۵۴ ب۔

[۶۰] ایضاً، ورق ۸۷ الف۔

[۶۱] ایضاً، ورق ۵۹ الف۔

[۶۲، ۶۳] ایضاً، ورق ۴۷ الف — "موضعی مجہول بود"

کی ہے[۶۴]۔ (حوض رانی کے علاقے میں اب شاندار بنگلے بن گئے ہیں اور ہمارے فاضل بزرگ قاضی سجاد حسین پرنسپل مدرسہ فتح پوری نے بھی وہیں ایک بنگلہ تعمیر کروایا ہے)۔

راقم الحروف نے جوامع الکلم کے بار بار مطالعہ سے قدیم دہلی کے تیرہ دروازوں کا کھوج لگایا تھا۔ ضیاء الدین برنی نے چودھویں دروازے "بہندر کال" کی نشاندہی کی ہے[۶۵]۔ حضرت برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات نفائس الانفاس میں پندرہویں دروازے "دروازۂ پل" کا سراغ ملتا ہے[۶۶]۔ درر نظامی میں دہلی کے سولہویں دروازے "دروازۂ کہال" کا ذکر آیا ہے[۶۷]۔

علی بن محمود جاندار نے ایک بزرگ شیخ حاجی رُوزبہ کا ذکر کیا ہے جن کی قبر "دروازۂ غزنین" کے باہر فصیل کے ساتھ تھی۔[۶۸]

بیعت کا آغاز

حضرت نظام الدین اولیاء نے ایک روز حاضرین مجلس کو بتایا کہ بیعت کی ابتداء بیعتِ رضوان سے ہوئی ہے[۶۹]۔

ہماری یہ ناقص رائے ہے کہ بیعتِ رضوان سے بھی آٹھ سال قبل عقبہ کی گھاٹی

۶۴؎ ایضاً، ورق ۷، ب۔

۶۵؎ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۷ء ج ۲، ص ۱۱۰۔

۶۶؎ عماد کاشانی، نفائس الانفاس، مخطوطہ مخزونہ ندوۃ العلماء لکھنؤ، نمبر ۳۳۲، ص ۶۵۔

۶۷؎ درر نظامی، ورق ۷، الف۔

۶۸؎ ایضاً، ورق ۸۵ ب۔

۶۹؎ ایضاً، ورق ۳۶ ب۔

میں بیعت کی ابتدا ہوئی تھی جس میں انصار نے آنحضرتؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ اپنی جان، مال اور اولاد سے بڑھ کر آپ کی حفاظت کریں گے۔

توبہ کی اقسام

ایک روز حضرت نظام الدین اولیاء نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ توبہ کی تین اقسام ہیں: ماضی، حال اور مستقبل۔

ماضی کی توبہ یہ ہے کہ دشمنوں کو راضی کرے۔ مثلاً اگر کسی شخص کے دس درہم غصب کئے ہوں تو وہ توبہ توبہ کہنے سے معاف نہیں ہوں گے تاآنکہ دس درہم مالک کو لے جا کر نہ دے۔ اگر کسی شخص کو گالی دی ہو اور وہ مر گیا ہو تو اس کی صفات بیان کرے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کرے۔ اور اگر اس سے زنا کا ارتکاب ہوا ہو تو توبہ کرے، لوگوں کو کھانا کھلائے اور شربت پلائے۔

حال کی توبہ یہ ہے کہ اپنے گناہوں پر پشیمان اور نادم ہو۔ مستقبل کی توبہ یہ ہے کہ وہ عہد کرے کہ آئندہ گناہ نہ کرے گا۔

اس موقع پر حضرت محی الدین کاشانی نے سلطان المشائخ سے پوچھا کہ اگر کسی نے اوائلِ جوانی میں گناہ کیا ہو اور بعد میں توبہ کرلی ہو لیکن کبھی کبھی دل میں اس پرانے گناہ کا خیال آجاتا ہو، تو اُسے یہ کیسے معلوم ہو کہ اس کی توبہ قبول ہوگئی ہے اور اس گناہ کا اثر زائل ہوگیا ہے۔ سلطان المشائخ نے فرمایا کہ وہ یہ دیکھے کہ اگر اس گناہ کے تصور سے اسے لذت محسوس ہوتی ہو تو وہ یہ سمجھ لے کہ ہنوز اس گناہ کا اثر باقی ہے (یعنی اس کی توبہ قبول نہیں ہوئی) اور اگر اس کے تصور سے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہو تو وہ یہ جان لے کہ اس گناہ کا اثر زائل ہوچکا ہے اور یہ توبہ کی قبولیت

کی دلیل ہوگی۔[۶۰]

معرفت کی حقیقت

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار کسی اجنبی نے حضرت بایزید بسطامیؒ سے کہا کہ اُسے معرفت کے معنی بتائیں۔ حضرت نے کھانا منگوا کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ اگلے روز اس نے پھر یہی سوال کیا تو حضرت نے حسبِ سابق کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ وہ اُن سے معرفت کے بارے میں سوال کرتا ہے اور موصوف جواب دینے کی بجائے کھانا منگوا کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ "میرے بھائی یہی معرفت ہے۔ کسی کی حاجت پوری کرو اور کسی کو راحت پہنچاؤ۔"[۶۱]

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ غزنین سے مولانا فخرالدین نامی ایک بزرگ کسی پیرِ پارسا سے ملنے گئے۔ جب یہ ان کے ہاں پہنچے تو اس وقت پیرِ صاحب مہمانوں کے لئے کھانا پکانے میں مصروف تھے، اس لئے مولانا کی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک دن مولانا نے پیرِ صاحب سے کہا کہ وہ اتنا لمبا سفر کرکے ان سے استفادہ کرنے آئے تھے اور وہ کھانا پکانے میں مصروف رہتے ہیں، اس لئے استفادہ کا موقع ہی نہیں ملتا۔ پیرِ صاحب نے مولانا سے پوچھا کہ انھوں نے معرفتِ خدا کے موضوع پر بھی کچھ پڑھا ہے؟ مولانا نے کہا کہ انھوں نے تو اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پیرِ صاحب نے فرمایا کہ اگر وہ معرفتِ خدا سے باخبر ہوتے تو پھر کتابیں نہ لکھتے۔[۶۲]

۶۰؎ ایضاً۔ ورق ۱۴ الف، ۱۴ ب۔

۶۱؎ ایضاً، ورق ۱۲ ب۔

۶۲؎ ایضاً؛ ورق ۱۳ الف۔

صوفیوں کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ جو شخص معرفتِ خدا کے بارے میں علم رکھتا ہے وہ اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتا اور جو اس کے متعلق لکھتا ہے، وہ معرفت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

تائب اور متقی میں فرق

ایک روز حضرت نظام الدینؒ اولیاء کی مجلس میں تائب اور متقی کے موضوع پر بحث چل نکلی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ تائب بہتر ہے اور بعض لوگوں کی یہ رائے تھی کہ متقی کو اس پر فضیلت حاصل ہے۔ تائب کے طرفداروں نے کہا کہ وہ معاصی کا مزہ چکھ کر تائب ہوا ہے، متقی تو گناہ کی لذت ہی سے ناآشنا ہے اس لیے اس کے تقوے میں کوئی کمال نہیں ہے۔

حضرت نظام الدین نے طرفین کی بات سن کر فرمایا کہ ایک بار لوگوں نے کسی جولاہے سے پوچھا کہ متقی اور تائب میں کیا فرق ہے؟ اس نے کہا کہ وہ متقی اور تائب کے معنی نہیں جانتا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ متقی وہ ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو اور تائب وہ ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر توبہ کرلی ہو۔ جولاہے نے جواب دیا کہ وہ ایک بات جانتا ہے کہ ایک تاگہ وہ ہے جو ٹوٹا نہ ہو اور اصلی جگہ پر رہا ہو اور دوسرا تاگہ وہ ہے جو ٹوٹ جائے اور اسے جوڑ دیا جائے۔ اس کا تجربہ ہے کہ وہ دونوں تاگے برابر نہیں ہو سکتے۔[۳۲]

یہ واقعہ فوائد الفواد میں ۱۳ ماہ صفر ۷۱۹ھ کو منعقد ہونے والی مجلس کے ذیل میں بھی درج ہے۔

---

[۳۲] ایضاً، ورق ۱۵ الف

اخوت کی اقسام

ایک روز حضرت نظام الدینؒ نے حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اخوت دو طرح کی ہوتی ہے :

۱۔ اخوتِ نسب

۲۔ اخوتِ دین

ان دونوں میں سے اخوتِ دینی قوی تر ہے۔ اس کی دلیل دیتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ اگر دو حقیقی بھائی ہوں اور ان میں سے ایک کافر ہو اور دوسرا مومن، تو مومن اپنے کافر بھائی کی میراث نہیں لے سکتا۔ اسی لئے اخوتِ نسب کمزور ہے۔ اب رہی اخوتِ دین، تو یہ بڑی مضبوط ہے کیونکہ ان بھائیوں کا تعلق دنیا میں تو ہے ہی آخرت میں بھی رہے گا۔[۵۴]

نفلوں کی جماعت

چشتیوں کے ہاں جماعت کے ساتھ نفل ادا کرنے کا رواج تھا۔ حضرت سلطان المشائخؒ نے اسے اپنے بزرگوں کا مسلک بتایا ہے۔ موصوف نے حاضرینِ مجلس کو بتایا کہ بابا فریدؒ کے حکم سے انھوں نے بھی نفل با جماعت ادا کیے تھے بلکہ امامت کا شرف بھی انھیں کے حصے میں آیا تھا۔[۵۵]

زکوٰۃ کی اقسام

حضرت نظام الدینؒ اولیاء نے ایک روز حاضرینِ مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا کہ زکوٰۃ کی تین اقسام ہیں :

---

[۵۴] ایضاً ، ورق ۵۷ الف۔

[۵۵] ایضاً ، ورق ۲۲ ب۔

۱۔ زکوٰۃِ شریعت

۲۔ زکوٰۃِ طریقت

۳۔ زکوٰۃِ حقیقت

زکوٰۃِ شریعت یہ ہے کہ دوسو درہم پر پانچ درہم زکوٰۃ دے۔ زکوٰۃِ طریقت یہ ہے کہ پانچ درہم اپنے پاس رکھ کر باقی رقم زکوٰۃ میں دے دے اور زکوٰۃِ حقیقت یہ ہے کہ پوری رقم زکوٰۃ میں دے دے اور اپنے پاس کچھ نہ رکھے۔[۶۶]

ہدیۂ شاہی کا حکم

سلطان المشائخؒ نے ایک روز جامع ملفوظات کی موجودگی میں فرمایا کہ شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مرشد حضرت ابوسعید تبریزیؒ اور ان کے مرید اکثر فاقہ سے رہتے تھے۔ موصوف کسی سے کچھ نہ لیتے۔ دن کو اُن کا اور اُن کے مریدوں کا روزہ ہوتا تھا۔ مغرب کے وقت تمام حضرات کڑوے خربوزے (حنظل) سے افطار کرتے اور رات بھر عبادت میں مصروف رہتے۔ ایک روز حاکمِ تبریز نے قاصد کے ہاتھ کچھ رقم حضرت ابوسعید کے خادم کو بھجوائی۔ اس نے اسی رقم سے افطاری کا سامان خرید کر حضرت کے سامنے لا رکھا۔ اگلی صبح حضرت نے خادم کو بلا کر کہا کہ گذشتہ رات انھیں عبادت میں لذت محسوس نہیں ہوئی اس لیے وہ یہ بتائے کہ افطاری کا سامان کہاں سے آیا تھا؟ خادم نے ڈرتے ڈرتے سارا واقعہ سنایا۔ حضرت ابوسعید نے پوچھا کہ جب شاہی قاصد رقم لے کر خانقاہ میں آیا تھا تو وہ کہاں کھڑا ہوا تھا؟ خادم نے اس جگہ کی نشاندہی کی تو حضرت نے وہاں سے مٹی اکھڑوا کر خانقاہ سے باہر پھکوا دی۔[۶۷]

---

۶۶ ایضاً، ورق ۲۶ الف۔

۶۷ ایضاً، ورق ۷۰ الف۔

بیعت صرف زندہ سے کرنی چاہیئے

حضرت نظام الدینؒ اولیار ، سے روایت ہے کہ بابا فریدؒ کا ایک بیٹا دہلی جاکر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر بیٹھ گیا اور خود کو ان کا مرید سمجھ کر محلوق ہوگیا۔ بابا صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے بیٹے کو لکھا کہ خواجہ صاحب ان کے مخدوم اور مرشد ہیں لیکن غائب سے بیعت جائز نہیں ۔ صحیح بیعت وہ ہے جو زندہ شیخ کے ہاتھ پر کی جائے۔[۷۸]

اہل بہشت کا ایک گروہ

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ ایسے خوش نصیب لوگ بھی ہوں گے جنھیں قیامت کے دن فرشتے اس طرح گھسیٹ کر بہشت میں لے جائیں گے جس طرح بچوں کو گھسیٹ کر مکتب کی طرف لے جاتے ہیں ۔ وہ لوگ خدا کی بارگاہ میں التجا کریں گے کہ انھوں نے محبت کے ساتھ اس کی عبادت کی تھی لہذا اس عبادت کے صلے میں وہ بہشت میں نہیں جانا چاہتے ۔ بارگاہِ خداوندی سے فرشتوں کو یہ حکم ملے گا کہ انھیں زنجیروں میں جکڑ کر زبردستی بہشت کی طرف لے جائیں۔[۷۹]

عصمتِ انبیار

حضرت نظام الدینؒ نے ایک روز حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرکے فرمایا کہ انبیار کرام گناہوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں لیکن اولیار اللہ گناہوں سے محفوظ ہوتے ہیں ، معصوم نہیں۔[۸۰]

شہرت بعد از مرگ

سلطان المشائخؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار لوگوں نے صوفی حمید الدین ناگوریؒ سے

---

[۷۸] ایضاً ، ورق ۳۷ الف ۔

[۷۹] ایضاً ، ورق ۱۷ الف ۔

[۸۰] ایضاً ، ورق ۸۸ الف ۔

پوچھاکہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بعض بزرگ مرنے کے بعد نامور ہو جاتے ہیں اور بعض بزرگوں کو لوگ بھلا دیتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ جو بزرگ اپنی زندگی میں مشہور ہو گئے تھے وہ مرکر گمنام ہو گئے اور جو زندگی میں گمنام رہتے تھے وہ مرکر مشہور ہو گئے۔[۸۱]

حسین بن منصور حلاج

علی بن محمود جاندار رقمطراز ہیں کہ حضرت نظام الدین ؒ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ حسین بن منصور حلاج کی لاش جلاکر اس کی راکھ دجلہ میں بہادی۔ اتفاق سے سید احمد کبیر نے وہ پانی لیا۔ اسی سبب سے ان پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو گئی۔[۸۲]

کرنے کا کام

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دن کو روزہ رکھے، رات کو عبادت کرے اور وہ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکا ہو، تو سمجھ لیجئے کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ اصل کام دل سے دنیا کی محبت ختم کرنا ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی دنیا کی محبت ہو اور وہ خدا سے محبت کا دم بھرتا ہو، تو جان لیجئے کہ وہ کذاب ہے۔ قیامت کے دن ایسا شخص خدا کے دوستوں کے سامنے شرمسار ہوگا۔[۸۳]

عزلت کا فائدہ

سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ عزلت کا فائدہ فکر و ذکر ہے اور یہ بزرگ ترین

۸۱ؔ ایضاً، ورق ۹۶ الف۔

۸۲ؔ ایضاً، ورق ۱۷ الف۔

۸۳ؔ ایضاً، ورق ۷۰ ب۔

عبادت ہے ۔ یہ نعمت خلق سے خلوت اور گوشہ نشینی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔[۸۴]

مومن ہونے کی شرط

حضرت نظام الدینؒ فرماتے ہیں کہ ایتمور نامی ایک ترک نے دہلی میں ایک مسجد بنوائی اور بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے بھائی شیخ نجیب الدین متوکلؒ کو امامت کے فرائض سونپے ۔ اس نے انھیں رہنے کے لئے ایک مکان بھی دیا۔ کچھ عرصہ بعد ایتمور نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام کے ساتھ کی اور اس تقریب پر ایک لاکھ ٹنکے سے بھی زیادہ رقم خرچ کر ڈالی ۔ ایک دن شیخ موصوف نے اس سے کہا کہ جب تک وہ اس سے زیادہ رقم راہ خدا میں خرچ نہیں کرتا اس وقت تک وہ مومن نہیں ہو سکتا۔ ایتمور نے ناراض ہو کر انھیں امامت سے الگ کر دیا اور مکان بھی خالی کرالیا۔ شیخ نجیب الدینؒ اس سلوک پر بڑے رنجیدہ ہوئے اور دہلی سے اجودھن چلے گئے۔ انھوں نے بابا صاحب کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔ بابا صاحب نے ان سے کہا کہ ایسی باتوں پر دل تنگ نہیں کرنا چاہیے۔ مزید براں انھوں نے اپنے برادر خورد کی تسلی کے لیے یہ آیت بھی پڑھی :

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا

(البقرہ : ۱۰۶)

کچھ عرصہ بعد ایتمر نامی ایک شخص اس نواح میں آیا اور اس نے بابا صاحب اور ان کے اعزا کی بڑی خدمت کی۔[۸۵]

---

[۸۴] ایضاً ، ورق ۷ ب

[۸۵] ایضاً ، ورق ۱۸ الف ، ۱۸ ب۔

مشایخ زادے

درر نظامی کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مشایخ اپنے نالائق فرزندوں کے ہاتھوں نالاں رہتے تھے۔ جامع ملفوظات مشایخ زادوں کے اطوار و اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیِّتِ وَیُخرِجُ المَیِّتَ مِنَ الحَیِّ

ایک شیخ طریقت نے اپنے فرزندوں کے بجائے ایک غلام کو اپنی مسند پر بٹھایا تھا[۵۹۶]

ایسا ہی ایک واقعہ حضرت اخی جمشید راجگیریؒ کے ملفوظات میں نقل ہوا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ایک شیخ کے سات بیٹے تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے والد کی مسند پر بیٹھنے کی تمنا دل میں لیے بیٹھا تھا۔ جب اس بزرگ کی وفات کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ فلاں کلال کے ہندو غلام کو خرید کر اس کی خدمت میں پیش کریں۔ حضرت نے اس غلام کو کلمۂ شہادت پڑھایا اور ایک ہی توجہ میں اس کو سلوک کے تمام مقامات طے کرا کے اپنی مسند پر بٹھا دیا[۵۹۷] بیٹوں نے اس پر احتجاج کیا تو باپ نے ان سے کہا کہ اگر باپ مال و دولت چھوڑے تو اس کے وارث بیٹے ہوتے ہیں، عشق و محبت میں میراث نہیں ہوتی[۵۹۸]

---

۵۹۶ ایضاً، ورق ۴۰ الف

۵۹۷ تصوف کی اصطلاح میں اسے توجہ قسری کہتے ہیں۔ مرشد ایک ہی توجہ میں مرید کو تمام مقامات طے کرا دیتا ہے۔

۵۹۸ یحییٰ بن علی الاصغر، ملفوظات اخی جمشید راجگیری، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کلکشن ۲۹۷ فارسیہ مذہب و تصوف، ورق ۵۹ الف، ۵۹ ب۔

بابا فریدالدین گنج شکرؒ بھی اپنے فرزندوں سے خوش نہ تھے۔ موصوف فرمایا کرتے تھے کہ اگر عورت کو خلافت اور مشایخ کا سجادہ دینا مناسب ہوتا تو اپنی صاحبزادی بی بی شریفہ کو اپنا جانشین بنا دیتے۔[۸۹] یہ تو اس وقت کے شیخ کے خیالات تھے۔ سلطان شمس الدین التمش بھی اپنے بیس بیٹوں کی موجودگی میں یہ کہا کرتا تھا کہ اس کی بیٹی رضیہ میں حکمران بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

اختتام

درر نظامی کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

ای ساقی می بریز و ساغر بشکن
می با کہ بخوریم چون حریفان رفتند

---

۸۹ خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، مطبوعہ دہلی ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۶۔

سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام

سید کاظم نقوی، ریڈر شعبہ دینیات شیعہ، مسلم یونیورسٹی - علی گڈھ

سرمایہ داری اور مادیت

یہ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری کا بہاؤ مادیت کے رخ پر ہے، یہ نرا کھرا مادی نظام ہے۔ اس میں خدا اور آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ انسان کو اسی دنیا کی مادی زندگی میں محدود فرض کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہے وہ یہی دنیا اور اس کا وقتی فائدہ۔ یہ سب ٹھیک، لیکن نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد مادی فلسفہ پر نہیں ہے۔ اس نظام میں زندگی کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ زندگی کے لیے ایک خالص معاشرتی نظام تو بنا دیا گیا لیکن انسانی زندگی کا کوئی علمی اور فلسفی مفہوم نہیں بتایا گیا۔ سرمایہ داری نے ایک طرف سیاسی آزادی کا اعلان کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی غیر مادی مرکزِ اعلیٰ کا تصور نہیں ہے، دوسری طرف مذہبی آزادی کا پرچار کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نظام کو روحانیات اور مذہبیات سے عناد نہیں ہے۔ جہاں تک اس ماحول کا تعلق ہے جس میں اس نظام نے آنکھیں کھولیں وہ مادیت سے چھلک رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صنعتی انقلاب کے بعد تمام حقائق و معارف کا منفرد معیار تجرباتی علوم قرار پا گئے تھے۔ تجربہ نے تمام علمی میدانوں میں غیر معمولی اہمیت حاصل

کرلی۔ اس نے ایسے شاندار حقائق کا انکشاف کیا جن کا سان گمان تک نہیں تھا۔ اس نے کائنات کے بے شمار اسرار و رموز بے نقاب کر کے انسانی زندگی کے سامنے مہولتوں کے دروازے پاٹوں پاٹ کھول دئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تنہا تجرباتی علم ساری عظمتوں اور عزتوں کا وارث بن گیا۔ خالص عقلی افکار و عقائد لوگوں کی نظروں سے گر گئے۔ یہ بھی ہوا کہ عموماً جن باتوں کو ایک بدیہی حقیقت کے طور پر مانا جاتا تھا یکایک، اچانک ان کی بابت رائے میں تبدیلی ہوگئی۔ نتیجتاً تمام پرانی باتیں مشکوک نظر سے دیکھی جانے لگیں۔ مادیت کے اس سیلاب میں کلیسا کے غلط اور غیر دانشمندانہ رویہ کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے دماغوں پر پہرے بٹھا رکھے تھے۔ ظالم بادشاہوں کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا مستقل مشغلہ تھا۔ انھوں نے اپنے مذہبی موقف سے بڑے غلط فائدے اٹھائے۔ انھوں نے مذہب کو اپنے مادی اغراض و مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا۔ انھوں نے ہر علمی اور اصلاحی تحریک کا سر کچلنا شروع کر دیا۔ اہل کلیسا کے اس ناپاک کرتوت نے بے خطا مذہب کو بدنام کر دیا۔ مذہب سے لوگوں کو نفرت ہوگئی، کیونکہ جرم اسی کے نام سے کیا گیا تھا، حالانکہ بے چارہ مذہب اہل کلیسا کے رویہ سے اسی طرح نالاں، ناراض اور متنفر تھا جس طرح دوسرے عوام الناس۔

یہی اسباب تھے جنھوں نے مادیت کو مغربی دماغوں میں بری طرح ٹھونس دیا۔ ماحول کے تمام تر مادیت سے متاثر ہونے کے باوجود نظام سرمایہ داری کی عمارت اس بنیاد پر قائم نہیں کی گئی ہے۔ اس نظام کے کرتا دھرتا اشخاص نے انسانی زندگی کے مفہوم کی وضاحت یا عوام کے برگشتہ ہونے کے ڈر سے نہیں کی اور یا وہ مفہوم زندگی اور نظام زندگی کی گہری ...... وابستگی سے ناواقف تھے۔ جو بھی ہو، اس نظام کی پشت پر انسان کی زندگی کا کوئی فلسفیانہ مفہوم موجود نہیں ہے۔ یہی اس کی بڑی کمزوری ہے۔

بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ انسانی زندگی کے خصوصیات معین کیے بغیر اس کے لیے معاشرتی نظام تجویز کر دیا جائے۔ پہلے خود زندگی کا مفہوم طے ہونا چاہیئے پھر ایسا قانون بنانے کی منزل ہے جو اس کے مطابق ہو۔

انسان اس دنیوی زندگی میں محدود ہے جس کی ابتدا پیدائش اور انتہا موت پر ہے یا اس کے بعد اس کے لیے کوئی ابدی زندگی بھی ہے؟ کہیں ایسا تو نہ ہو کہ یہ زندگی اس حیاتِ جاودانی کا پیش خیمہ ہو۔ وہاں کی آسائش اور راحت اس دنیوی زندگی کی لطافت اور پاکیزگی سے وابستہ ہو؟

حسن اتفاق سے تجرباتی علوم ہی کے اصول کی روشنی میں دنیا نے یہ انکشاف کر لیا ہے کہ انسان موت کے بعد بالکل نیست و نابود نہیں ہو جاتا بلکہ وہ ایک دوسرے عالم میں منتقل ہو کر زندگی گذارنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں موجودہ زندگی کے لیے کسی نظام کے مرتب کرنے میں آیندہ زندگی کی رعایت ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

پھر یہ مسئلہ بھی نظر میں رکھنا لازمی ہے کہ انسان خود بخود وجود میں آ گیا ہے یا اس کو کسی صاحبِ عقل و اختیار قوت نے پیدا کیا ہے؟ اگر انسان کا وجود اتفاقی نہیں ہے بلکہ صاحبِ عقل، خالق مختار کے ارادے اور نگاہِ کرم کا رہونِ منت ہے تو وہی انسانی خصوصیات اور اسرار و رموز کا واقف کار ہے۔ اس کا تمام افرادِ انسانی سے یکساں تعلق ہے۔ اپنے ہمہ گیر علم و اطلاع اور سب کے ساتھ مساویانہ تعلق کی بنا پر انسان کے لیے مکمل اور بے لوث نظامِ حیات بنانے کا اسی کو حق ہے۔

یہ تصور بالکل غلط ہے کہ وجودِ خدا اور آخرت کا عقیدہ خالص ذہنی اور فکری بات ہے جس کا ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور انسانی زندگی کے مسائل علٰحدہ ہیں۔ اس مسئلے کو بغیر حل کیے ہوئے بھی زندگی کے واسطے قانون مرتب کیا جا سکتا ہے۔ یہ خیال نقطۂ حقیقت سے بالکل ہٹا ہوا ہے۔ واقعہ

یہ ہے کہ اس مسئلے کا دل، عقل اور زندگی سے یکساں ارتباط ہے۔

گذشتہ بیان سے اچھی طرح واضح ہوگیا کہ نظام سرمایہ داری خالص مادی نظام ہے۔ ملکی باشندوں کی سیاسی آزادی کی بازگشت اسی خیال کی طرف ہے کہ کوئی ایسی شخصیت یا جماعت موجود نہیں ہے جو اپنے ارادے، رجحانات، آرار و افکار میں معصوم ہو۔ معاشرتی مسئلے کا حل جس کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے اور انسانی زندگی کے واسطے قانون اور نظام کی تجویز میں جس کے اوپر بھروسہ کرلیا جائے۔

سرمایہ داری میں اخلاق کا درجہ

نظام سرمایہ داری سے مادیت کی روح ابل رہی ہے۔ اس کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے کہ اخلاقیات کو اس نظام سے نکال دیا جائے، ان کے حقیقی وجود کو یا تسلیم نہ کیا جائے اور یا ان کے مفہوم میں بالکل تبدیلی کردی جائے۔ نظامِ سرمایہ داری نے صاف صاف اعلان کیا ہے کہ شخصی مفاد کی حمایت ہمارا بنیادی مقصد ہے ملک کے باشندوں کو ہر قسم کی آزادی ہم نے اسی انفرادی مفاد کی خاطر دی ہے۔ تمام موجودہ مصائب و آلام اور شدائد و مظالم جن کے تحمل کی سکت نہ پاکر پورا عالمِ انسانیت فریاد کر رہا ہے اسی نظریہ کے ڈھائے ہوئے ہیں۔ اس نظام کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہی شخصی مفاد قومی مفاد کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، جو نتائج اخلاقیات کی مدد سے وجود میں آتے ہیں وہ انفرادی محرکات سے بھی حاصل ہوسکتے ہیں۔ انسان جب کوئی قومی خدمت کرتا ہے تو اسے شخصی فائدہ بھی پہونچتا ہے کیونکہ وہ جس جماعت کو فائدہ پہونچا رہا ہے خود بھی اسی کا ایک جز ہے۔ اگر ہم نے کسی ڈوبتے کو بچا لیا تو اپنی ذات کو فائدہ پہونچایا، کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہ شخص آئندہ کوئی ایسا کام کرے جس سے حصہ رسدی ہمیں بھی فائدہ پہونچے۔ معلوم ہوا کہ قومی مفاد چونکہ تحلیل ہونے کے بعد شخصی مفاد کی شکل اختیار کرلیتا ہے لہذا اس کا تحفظ

انفرادی محرک اور ذاتی مفاد کا احساس کرے گا۔ اس مقصد کے لیے اخلاقیات کا قدم درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ استدلال کیا صحیح ہے؟

خالص مادیت کے پرچار کے ساتھ سرمایہ داری کے طرفداروں کا مذکورہ استدلال حیرت انگیز ہے۔ اس دنیا کے علاوہ کسی دوسرے عالم اور اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کو نہ مانتے ہوئے یہ کہنا کہ ہر قومی فائدہ تحلیل ہوکر انفرادی فائدہ بن جاتا ہے بڑی دیدہ دلیری کا کام ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ کبھی جماعتی مفاد لوگوں سے جان کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے؟ فرمایئے کہ اس وقت جماعتی فائدہ شخصی فائدے میں کیونکر تحلیل ہوگا؟ فرد تو بالکل نیست و نابود ہو جائے گی، اس خدمت سے حصہ رسدی فائدہ اسے کیونکر پہونچے گا؟ جبکہ اسے اس قربانی سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ہے تو اس اجتماعی مصلحت اور منفعت کی خاطر اخلاقیات یا اخروی ثواب کے علاوہ اور کس محرک کی بنا پر وہ اپنی جان پر کھیلے گا؟

تعجب ہے کہ ایسے ایسے عقلائے روزگار سے یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ ہمیشہ اجتماعی مفاد کا انفرادی مفاد سے سازگار رہنا ضروری نہیں ہے۔ باہم سازگار ہونے کی شکل میں یہ صحیح ہے کہ قوم کا فائدہ تحلیل ہوکر فرد کا فائدہ بن جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یوں وضاحت کی جائے کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ فرد کو اپنی تنہا مصلحت اور جماعتی مصلحت دونوں میں سے ہر ایک کا لحاظ کرنے سے مساوی فائدہ حاصل ہو رہا ہو۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے کہ اپنی خصوصی مصلحت کی رعایت سے بہت سا فائدہ پہونچتا ہے اور جماعت کی مصلحت کی رعایت کرنے میں کم فائدہ ہوتا ہے، دوسرے شریک ہو جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اخلاقیات ہی جماعتی مصلحت کو مقدم کرنے کے محرک بن سکتے ہیں۔ اخلاقیات، خدا کے حاضر و ناظر، علیم و خبیر، قادر و مقتدر ہونے اور آخرت کا

عقیدہ درمیان سے نکال لینے کے بعد قومی اور معاشرتی مصلحتوں کے تحفظ کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ جو ماحول ان دونوں سے خالی ہوگا وہ انسانوں کی نہیں، درندوں کی بستی ہوگی۔

سرمایہ داری کی تباہ کاریاں

یہ بہت لمبی زنجیر ہے جس کی تمام کڑیوں کو سامنے نہیں لایا جاسکتا۔ اس نظام کی تباہ کاریوں کی سب سے پہلی کڑی یہ ہے کہ اقلیت کا مفاد اور اس کی زندگی اکثریت کے رحم وکرم پر ہے۔

سیاسی آزادی نے قانون سازی اور حکام کو منتخب کرنے کا حق قوم کی اکثریت کو دیدیا ہے۔ حسنِ اتفاق سے اکثریت کی نمایندہ جماعت پورے طور پر سرمایہ داری کی مادی ذہنیت رکھتی ہے۔ بتائیے کہ اس وقت اقلیت کے حقوق کا کیا حشر ہوگا؟ جو قوانین اکثریت کے فائدوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بنائے گئے ہوں اقلیت ان کے سایہ میں سود و بہبود کی کیا توقع کر سکتی ہے؟ کیا مادی نقطۂ نظر سے یہ عجیب اور خلافِ امید بات ہوگی کہ اکثریت قانون سازی میں بس اپنے مفاد اور مصلحت کا لحاظ کرے اور اقلیت کے حقوق، اس کی مصلحتوں کو بالکل پامال کر ڈالے؟

غور کیجئے کہ جب خدا اور عالم آخرت کا وجود نہیں ہے، جبکہ انفرادی مصلحت ہی سب کچھ ہے، جبکہ اخلاقی اقدار کی کوئی قیمت نہیں ہے تو اکثریت کی زیادتیوں سے اقلیت کو کون بچائے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ عوام کے حقوق کی پامالی اور ان پر ظلم وتشدد کے لحاظ سے سرمایہ دارانہ نظام اپنے پہلے کے نظاموں سے کم نہیں ہے۔ صرف اتنا سا فرق ہے کہ پہلے افراد قوموں کے حقوق سے کھیلتے تھے اور اب اقلیتیں اکثریتوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی ہوئی ہیں۔

کاش سیلاب یہیں پر رُک جاتا

کاش تباہ کاریوں کا سیلاب یہیں پر آکر تھم جاتا، لیکن اس کا بہاؤ اس وقت اور تیز ہوجاتا ہے جب اسی نظام سے اقتصادی آزادی کا دھارا پھوٹتا ہے۔
پہلے وضاحت ہوچکی ہے کہ سرمایہ داری نے افراد کو ہر طرح کی اقتصادی آزادی دیدی ہے۔ ہر فرد آزاد ہے کہ دولت و ثروت اکٹھا کرنے کے جو وسائل چاہے اختیار کرے۔ حکومت ہر قسم کی آسانیاں فراہم کرنے کے لیے تیار ہے۔ بدقسمتی سے نظام سرمایہ داری نے یہ اعلان اس وقت کیا جبکہ دنیا میں صنعتی انقلاب پوری طرح آچکا تھا۔ سائنس نے مشین ایجاد کرکے صنعت کا رُخ بالکل بدل دیا۔ چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کا نام ونشان تک نہیں رہ گیا۔ ساری دولت سمٹ کر ایک خاص محدود طبقہ کے ہاتھوں میں آگئی جس کے پاس اتفاق سے جدید صنعتی آلات موجود تھے۔ ان کی پشت پر سرمایہ داری کی عطا کردہ غیر محدود اقتصادی آزادیاں تھیں۔ انھوں نے ان سے پورا فائدہ اٹھایا اور خوب دل کھول کر دولت کمائی۔ صنعتی مشین نے جس طبقے کی صنعت وحرفت کو تباہ کردیا تھا دولت مندوں نے اقتصادی آزادی کا سہارا لے کر انھیں خوب خوب کچلا، وہ بیچارے اس پرزور دھارے پر کہاں رک سکتے تھے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا اقتصادی میدان ان بڑے سرمایہ داروں کی دوا دوش کے لئے خالی ہوگیا، پست اور متوسط دونوں طبقے تاب مقاومت نہ لاکر میدان سے ہٹ گئے۔ اب ملک کی اکثریت مالداروں کے رحم وکرم کا آسرا لگائے زندگی کے دن کاٹ رہی ہے۔ سابقہ ایسے گروہ سے ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کی مادی ذہنیت اپنے دماغوں میں لئے ہوئے ہے، جس نے شخصی اور انفرادی مصلحت وفائدے کو اپنا کعبۂ مقصود قرار دے لیا ہے۔ اگر اس کی امداد اور ہمدردی کا ہاتھ نہ بڑھے اور اس بے آسرا اکثریت کو فقر وغربت کے گڑھے سے نہ نکالے تو حیرت کا محل نہیں ہے۔ آخر کس لیے

سرمایہ دار مفلوک الحال اکثریت کی مدد کریں، جبکہ اسی دنیا کی لذتیں اور فائدے سب کچھ ہیں، جبکہ ایثار، فداکاری، قربانی، مواسات اور خدمت خلق کے الفاظ ان کی لغت میں موجود نہیں ہیں، جبکہ حکومت نے انھیں پابند نہیں بنایا بلکہ ہر قسم کی آزادی دے دی تو وہ اپنا پیٹ کاٹ کر کسی دوسرے کی شکم پری کیوں کریں؟

دولت مندوں کو اسی ذہنیت کی راہ پر چلنا چاہیئے جو نظام سرمایہ داری نے ان کے دماغوں میں بھر دی ہے۔ ان کو اکثریت کی غربت اور محتاجی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ان میں جو افراد محنت و مشقت کر سکیں۔ ان سے اپنے کارخانوں اور فیکٹریوں میں معمولی مزدوریاں دے کر کام لینا چاہیئے۔

خالص شخصی مصلحتیں اور فائدے کو پیش نظر رکھنے کے یہی فطری تقاضے ہیں جن کا پورا ہونا ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ سوداگروں کی باہمی رقابت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خواہش ان زیادتیوں سے بچالے گی ایک ایسا تصور ہے جس کے خلاف روزمرہ کے مشاہدات موجود ہیں۔ ایک محدود طبقے کا کسی نقطے پر متفق ہو جانا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ہوتا یہی ہے کہ کارخانہ دار مزدوروں کے مقابلے میں ایکا کر لیتے ہیں۔ مزدور جہاں بھی جاتا ہے اسے وہی قلیل مزدوری ملتی ہے۔ اس کا پیٹ مجبور کرتا ہے کہ ہر پھر کر وہ اسی قلیل اجرت پر کام کرے۔

قیمتوں کا مسئلہ کیونکر حل ہوگا؟

دوکانداروں کی بے جا نفع خوری اور اشیاء کی قیمتوں میں اعتدال و توازن کا مسئلہ بھی دوکانداروں کے باہمی مقابلے اور چشمک کے سہارے حل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب بھاؤ چڑھتا ہے تو پورے بازار میں جیسے کوئی کوڑی گھما دیتا ہے، سب جگہ ایک ہی نرخ ہو جاتا ہے، اور اگر کہیں کوئی فرق نکلتا ہے تو بہت کم جو ناقابل لحاظ ہے۔

اقتصادیات کے فطری اصول بھی اس کی مکمل روک تھام نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے

کہ چیزیں مختلف قسم کی ہیں ۔ ضروریاتِ زندگی میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ قیمت کے نقطۂ اعتدال سے بڑھنے پر ان کی مانگ کم ہو جائے ۔ کھانے ، پینے اور پہننے کی چیزوں کے خریدنے پر انسان مجبور ہوتا ہے ۔ بیمار کو بہرحال دوا خریدنا پڑے گی ، خواہ دواخانے اسے کتنا ہی مہنگا کر دیں ۔ بے شک جن چیزوں کی انسان کو ضرورت نہیں پڑتی ، صرف اپنا کوئی شوق پورا کرنے کے واسطے خریدتا ہے ان میں ایسا ہوگا کہ قیمت جب حدود اعتدال سے آگے بڑھے گی تو ان کی مانگ کم ہو جائے گی ۔ یہاں ممکن ہے کہ مانگ کی کمی سے متأثر ہو کر تاجر اشخاص ان چیزوں کا بھاؤ معتدل اور متوازن کر دیں ۔ ان مشکلات کو انسانی خصوصیات کا تحفظ کرتے ہوئے بس اسلام نے حل کیا ہے ۔ آیندہ اس امر پر روشنی ڈالی جائے گی ۔

سیاسی آزادی کا حشر

اقتصادی آزادی کے ان تلخ نتائج کے بعد سیاسی حریت کی صورت بھی مسخ ہو کر رہ جاتی ہے ۔ تمام ملکی باشندوں کے سیاسی حقوق میں مساوات کا غذ پر نظام سرمایہ داری کا جز ضرور ہے ، لیکن ان شدید اقتصادی ہچکولوں کے بعد اس کی چولیں بالکل ڈھیلی ہو جاتی ہیں ۔ اقتصادی آزادی پوری قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دے گی ۔ سرمایہ دار اور غریب ۔ مالدار اور سرمایہ دار ہونے کے اثرات تمام معاملات کی باگ ڈور دولت مندوں کے ہاتھ میں دیدیں گے ۔ سیاسی آزادی ان کے سامنے ہاتھ پیر ڈالدے گی ۔ سرمایہ دار ملک میں اپنے اقتصادی موقف کی وجہ سے ، نشر و اشاعت کے ذرائع قابو میں ہونے کی بنا پر حاجت مند ، مفلوک الحال عوام کی رائے روپے سے خرید سکنے کے سبب سے حکومت پر پوری طرح چھا جائیں گے ۔ اس کے تمام پرزے ان کی مصلحتوں اور فائدوں کی تحریک سے ناچیں گے ۔ قانون اور سماجی نظام ان کے اشاروں پر مرتب ہوگا ، حالانکہ قانون سازی کا حق پوری قوم کو دیا گیا تھا ۔ یہ ہے نظام سرمایہ داری کا آخری انجام ! حکومت اور

قانون سازی دونوں پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہوگیا، ملک کی اکثریت اپنے تمام وطنی حقوق سے محروم ہوگئی!

اب سامراج جنم لیتا ہے!

یہاں پہونچکر نظام سرمایہ داری کی وہ بدترین تباہ کاری سامنے آتی ہے جس نے سارے عالم کے امن داماں کو تہ وبالا کردیا ہے۔ یہ سرمایہ دار جن کے ہاتھوں میں اس نظام نے ہر قسم کا اقتدار دیدیا ہے اپنے ہموطنوں کا خون چوسنے کے بعد اِدھر اُدھر اطرافِ عالم پر حریصانہ نگاہیں ڈالتے ہیں۔ ان کی خود غرضی اور مصلحت اندیشی انھیں سمجھاتی اور سجھاتی ہے کہ ہمیں اپنے اثرات کے دائرے کو اور وسیع کرنا چاہیئے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

(الف)

زیادہ سامان اسی وقت تیار کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کا خام مادہ زیادہ مقدار میں موجود ہو، جس کے پاس خام اشیاء زیادہ ہیں وہی صنعت اور تخلیق کی طاقت زیادہ رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خام مادے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے حاصل کرنے کے لیے ان ممالک میں اثر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

(ب)

کارخانہ دار نفع اور فائدے کے لالچ میں مال زیادہ تیار کرتے ہیں۔ عوام کے پاس روپیہ نہ ہونے کے سبب سے ان کے مال کی کھپت ملک کے اندر نہیں ہوتی ہے۔ انہی سرمایہ داروں کی خود غرضی نے ان کی مالی حالت کو اتنا سقیم کردیا ہے کہ ان کی آمدنی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے پورے طور پر کافی نہیں ہوتی۔ اس صورت میں سرمایہ داروں کو ملک کے باہر نئے بازاروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیرونی بازاروں پر قبضہ ان ممالک میں روابط اور اثرات پیدا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

خالص مادی ذہنیت جو اخلاقی اور روحانی اقدار کی قائل نہیں، جس کے نزدیک اس محدود دنیا اور اس کے مصالح و فوائد کے علاوہ زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں ہے اپنا مفاد مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے ممالک میں کیوں اپنا اثر قائم نہ کرے؟ کس بنا پر ان کی قدرتی دولتوں کو نہ ہتھیائے؟ کس لیے دنیا کا امن و امان ملحوظ رکھتے ہوئے خود نقصان اٹھائے؟ شخصی مصلحت اور مفاد کے نقطۂ نظر سے جس پر پورے نظام سرمایہ داری کی بنیاد ہے یہ تمام اقدامات جائز اور معقول ہیں۔

حق و انصاف یہ ہے کہ اس نظام نے انسانیت کو عظیم مصائب اور مظالم میں مبتلا اور عالمی امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ انسان اس سے متاثر ہو کر اخلاقیات کے دائرے سے بہت دور ہو گیا۔ ایثار، باہمی اعتماد، خیر خواہی اور بے لوثی کے الفاظ بے معنی ہو گئے۔ ہر طرف ماحول پر خود غرضی اور مطلب پرستی چھا گئی۔ دلوں میں محبت، یگانگی، الفت و خلوص، اخوت و برادری کے بجائے کینہ، حسد، بغض و عناد کے جذبے پرورش پانے لگے۔ دنیا فردوس بریں کا جواب کیا بنتی، جہنم کا نمونہ بن گئی۔

(باقی)

حضرت شاہ اہل اللہ پھلتی قدس سرہٗ

جناب مسعود انور علوی کاکوروی

ابتدائے آفرینش سے اس عالم آب و گل میں ایسی عظیم المرتبت و جلیل القدر ہستیاں بے شمار گذری ہیں جو آغوش خمول و گمنامی سے باہر نہ آسکیں۔ ایسی ہی عظیم المرتبت ہستیوں میں ایک شخصیت شاہ اہل اللہ پھلتیؒ کی بھی ہے جو حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ (م ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸-۱۹ء) کے صاحبزادے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) کے برادر خورد ہیں۔ تذکرہ نگاروں اور مورخین نے آپ کے حالات و واقعات کے سلسلے میں کسی قدر سکوت اختیار کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ابتدائی دور کے خانوادۂ ولی اللہی کے سوانح نگاروں نے بھی موصوف کے حالات میں کچھ زیادہ وسعت نظری نہ دکھائی۔ شیخ محمد محسن ترہتی نے حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال کے سو سال بعد "الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبدالغنی" تالیف کی تو اس میں بھی آپ کے حال میں دو سطریں لکھ کر قلم روک دیا۔

وکان لولی اللہ اخ یسمی الشیخ	شاہ ولی اللہ کے ایک بھائی شاہ
اهل اللہ کان من اهل اللہ	اہل اللہ تھے جو اللہ والے اور
واهل العلم بلی لم یبلغنی	صاحب علم تھے لیکن مجھے ان کے

خبرہ فوق ان لہ کتاباً لطیفاً فی تخریج احادیث الہدایۃ	حالات کا اس سے زیادہ قطعاً علم نہیں کہ انھوں نے ہدایہ کی احادیث متبرکہ کی تخریج کے سلسلے میں ایک عمدہ کتاب لکھی۔

"حیاتِ ولی" مولفہ مولوی رحیم بخش دہلوی جو صرف خانوادۂ ولی اللّٰہی کے حالات و واقعات اور افادات پر مشتمل ہے اس میں بھی شاہ صاحب کا تذکرہ تقریباً نہیں کے برابر ہے البتہ حضرت شاہ عبدالعزیز (م ۱۲۳۹ھ) کے حال میں ان کے چار عربی مکتوبات بھی درج ہیں جو شاہ صاحب موصوف کے نام ہیں۔ صاحب حدائق الحنفیہ اور تذکرۂ علمائے ہند نے شاہ صاحب کا نام گرامی تک شاملِ کتاب نہ کیا۔ صاحب نزہۃ الخواطر نے ضرور آپ کا تذکرہ کیا ہے مگر وہ بھی اسی قدر کہ "نام مع ولدیت اور یہ کہ وہ حنفی علمائے ربانیین اور بزرگ ہستیوں میں سے تھے فن طبابت میں ماہر تھے" بعد ازاں آپ کی چاروں تصانیف کی فہرست درج کی ہے[۲]۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ملفوظات میں ضرور آپ کا ذکر ملتا ہے۔

اس سے خیال ہوتا ہے کہ مولفین و مورخین کی نگاہوں سے اب تک آپ کے حالات پوشیدہ رہے ہیں۔ واللہ اعلم۔

احقر کے لئے یہ بات بڑی باعث سعادت و مسرت ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے جس قدر حالات و واقعات و افادات حاصل ہوئے یکجا ہدیۂ قارئین کر رہا ہے جو بحمداللہ اب تک کے تمام سوانح نگاروں کے تذکروں سے کہیں زائد ہیں۔

لہ الیانع الجنی مخطوطہ کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ کاکوری۔

۲ؔ نزہۃ الخواطر، علامہ سید عبدالحی الحسنیؒ، ۶ : ۲-۱۴۱

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

ولادت:

حضرت شاہ عبدالرحیم دہلوی (۱۰۵۴ھ/۱۶۴۴ء تا ۱۱۳۱ھ/۱۷۰۸-۹ء) نے دو[2] شادیاں کی تھیں پہلی شادی سونی پت میں ہوئی جن سے ایک صاحب زادے شیخ صلاح الدین[3] پیدا ہوئے اور دوسری شادی ۶۰ سال کی عمر میں (۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء) اپنے ایک شاگرد و مرید شیخ محمد صدیقی پھلتی (۱۱۲۵ھ/۱۷۱۳ء) (والد ماجد شیخ عبیداللہ صدیقی) کی بڑی صاحب زادی فخرالنساء بیگم[4] سے ہوئی جن سے دو صاحبزادے شاہ ولی اللہ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۲-۳ء تا ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور شاہ اہل اللہ (۱۱۱۹ھ/۱۷۰۸ء تا ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۲ء) متولد ہوئے۔ صاحب "القول الجلی" نے شاہ اہل اللہ قدس سرہ کے حالات و افادات بھی بالتفصیل درج کئے ہیں۔ بلکہ آپ کا حال شروع کرنے سے بیشتر لکھا ہے کہ:

> ذکر احوال کرامت اشتمال وکلمات معرفت سمات جامع اوصاف کمال مظہر اسرار ذی الجلال قدوۂ ارباب انتباہ زبدۂ مقربان حضرت الہ حضرت شاہ اہل اللہ سلمہ اللہ کہ برادر خورد عظیم حضرت الشانند[5]

نیز آپ کی ولادت کے سلسلے میں ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ:

---

[3] شیخ صلاح الدین صاحب کے نام تک سے اکثر حضرات ناواقف ہیں اور جو جانتے بھی ہیں، وہ بھی یہ کہ انھوں نے صغر سنی میں وفات پائی تھی حالانکہ انھوں نے دور کہولت سے گزر کر وفات پائی۔ بڑے ذی علم، باخدا اور باذوق شخص تھے۔ ۱۲ منہ

[4] القول الجلی و اسرار الخفی: ۳۔

[5] ایضاً: ۴۲۰۔

قبل از ولادت ایشاں روزے حضرت شیخ عبدالرحیم قدس سرہٗ حضرت ایشاں را بنام اہل اللہ ندا فرمودند، خادماں عرض نمودند کہ نام مبارک ایشاں ولی اللہ است وحضرت بایں نام ندامی فرمایند۔ فرمودند کہ عنقریب است کہ برادر ایشاں متولد شود ایں نام وے ست کہ زبان من بآں جاری شدہ است پس بعد چندے ایشاں متولد شدند وبایں نام مسمی گشتند[۶]

ان کی پیدائش سے پہلے ایک روز حضرت شیخ بزرگ شاہ عبدالرحیم قدس سرہٗ نے حضرت اقدس (شاہ ولی اللہ) کو اہل اللہ کے نام سے پکارا۔ گھر کے خدام نے عرض کیا کہ آپ کا نام گرامی تو ولی اللہ ہے اور حضرت اس نام سے پکار رہے ہیں۔ فرمایا کہ عنقریب ان کا ایک بھائی پیدا ہوگا یہ نام اسی کا ہے جو میری زبان پر جاری ہوا ہے پھر تھوڑے ہی عرصے بعد آپ پیدا ہوئے اور اس نام سے موسوم ہوئے۔

تعلیم و تربیت :

اپنے والد ماجد، بڑے بھائی اور دوسرے اساتذہ سے حاصل کی۔ بچپن سے ہی ذہانت و فطانت جبینِ مبارک سے ظاہر تھی۔ بڑے ذکی و ذہین، نکتہ سنج، صائب الرائے اور متقی و پرہیز گار تھے۔ فقہ، علوم عقلیہ اور فنِ طب میں ملکہ حاصل کیا۔ بارہ سال کی عمر میں والد ماجد سے مشرف بہ بیعت ہوئے اور اشغال طریقت حاصل کئے۔ اسی سال حضرت شیخ بزرگ کا وصال ہوگیا، چنانچہ بقیہ درسیات کی تکمیل اپنے بڑے بھائی سے کی۔ اپنی فطری استعداد و صلاحیت کی بنا پر جلد ہی کمال کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

وازبسکہ فطرتے صافی داشتند باندک

چونکہ فطرت صافی کے مالک تھے لہٰذا

---

[۶] القول الجلی : ۴۲۰۔

توجہے مورد برکات طریقت ومطرح اشعہ انوار حقیقت گردیدند؎

ذرا سی توجہ سے طریقت کی برکتوں اور انوار حقیقت کی شعاعوں کے مورد بن گئے۔

شیخ محمد عاشق پھلتی رح رقم طراز ہیں:

والحق کاسمہ اہل اللہ ہستند کہ از ایام صبی در تقوی وطہارت وعلم وفضل نشوونما یافتند۔ فطرتے صافی وطبیعتے بس عالی و ذہنے ثاقب ورائے صائب و فہمے دقیقہ یاب وذکائے روشن مثل آفتاب می دارند۔ جمیع کتب متداول بر حضرت ایشاں گذرانیدہ فراغ حاصل نمودند۔ در جودت فہم ودقت نظر رتبہ بس عالی دارند؎

آپ در حقیقت اسم بامسمیٰ یعنی اہل اللہ ہی ہیں بچپن سے ہی تقویٰ وطہارت اور علم وفضل میں پرورش پائی۔ فطرتِ صافی طبیعتِ عالی، ذہن رسائی، صائب الرائی نکتہ سنجی اور روشن فہمی میں آفتاب کے مثل ہیں تمام کتب مروجہ میں حضرت اقدس سے پڑھ کر فراغ حاصل کیا۔ جودتِ فہم اور باریک بینی میں بلند و اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں۔

حضرت ایشاں نزدیک قصد سفر اول دستارِ خلافت برسرِ ایشاں بستند واجازت ارشاد وبیعت دادند وجانشین حضرت شیخ بزرگ قدس سرہٗ ساختند و فرمودند چنانچہ خرقہ ما از حضرت والد قدس سرہٗ

جب حضرت اقدس نے اپنے پہلے سفر کا ارادہ فرمایا تو دستار خلافت آپ ہی کے سر پر باندھی اور اجازت ارشاد وبیعت عطا فرما کر حضرت شیخ عبد الرحیم قدس سرہٗ کا جانشین کیا اور فرمایا کہ جس طرح ہم کو

؎ القول الجلی : ۱۲۴

؎ القول الجلی بذکر آثار الولی : ۴۲۰

رسیدہ بود ہم چناں ما بایشاں دادیم باید کہ یاراں ایشاں را بجائے حضرت بزرگ قدس سرہٗ دادند۔[۹]

حضرت والد ماجد سے خرقہ پہونچا ہے ہم نے بھی اسی طرح اُن کو دیا۔ سب لوگوں کو چاہیئے کہ ان کو حضرت بزرگ قدس سرہٗ کی جگہ پر سمجھیں۔

صاحب "القول الجلی" کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ اہل اللہ صاحب کے سر پر دستارِ خلافت اس وقت باندھی گئی جب ان کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا پہلا سفر حج بہ قول ان کے بیس سال کی عمر میں یعنی ۱۱۳۴ھ میں شروع ہوا تھا۔ اس وقت شاہ اہل اللہ کی عمر ۱۱۱۹ھ ولادت کے حساب سے ۱۵ سال تھی۔

طب میں مہارت :

شاہ صاحب فن طبابت میں جیسا کہ عرض کیا ہے بڑے ماہر تھے گویا وہ بھی میراث تھا کیوں کہ بہ قول حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ کے

حکمت ہم در خاندانِ ما معمول بود چنانچہ جد بزرگوار وعم فقیر دوائی کردند والد ماجد وبندہ موقوف ساختہ ایم[۱۰]

ہمارے خاندان میں حکمت (طبابت) کا رواج بھی تھا چنانچہ جد بزرگوار (شاہ عبدالرحیم) وفقیر کے چچا (شاہ اہل اللہ) بھی مطب کرتے تھے۔ والد ماجد اور میں نے اس کو موقوف کیا۔

فن طبابت کے سلسلہ میں شاہ صاحب کے دو قابل ذکر واقعات یہاں درج کرنا بے محل نہ ہوگا۔ پہلے خواب کے راوی خود آں جناب کے بھتیجے ہیں اور دوسرا خواب آپ کے

۹ے القول الجلی بذکر آثار الولی : ۲۲۴۔

۱۰ے ملفوظات عزیزی - مطبع مجتبائی میرٹھ : ۲۲۔

ماموں زاد بھائی شیخ محمد عاشق پھلتیؒ نے "القول الجلی" میں تحریر فرمایا ہے اور غالباً یہی خواب اور واقعہ آپ کے مشغلۂ طبابت میں دلچسپی لینے کے محرک بنے ہوں گے کیوں کہ اس سے بیشتر آپ کو اس مشغلہ سے کوئی خاص شغف نہ تھا۔ جیساکہ خود حضرت شیخ محمد عاشق صاحبؒ فرماتے ہیں:

درطب دستے رسا وحدسے شامل در موجز القانون بعضے مسائل ضروریہ کہ از مصنف ماندہ بودند زیادہ کردہ رسالہ درحد خود تمام ووافی ساختند اما باوجود حذاقت دریں فن بمقتضائے بے پروائی معالجات ومداوات مرضے ہر وقت کم می پرداختند[۱]

آں جناب کو طب میں دست رسا اور فراست شامل حاصل ہے "موجز القانون" میں بعض ضروری مسائل جو مصنف سے رہ گئے تھے اضافہ کر کے رسالہ کو پورا مکمل کیا لیکن اس فن میں حذاقت کے باوجود بمقتضائے بے پروائی علاج ومعالجہ کی طرف کم متوجہ ہوتے تھے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

عم من درطب مہارت کمال داشتند روزے درخواب دیدند کہ شخصے می گوید کہ خدا بیمار است دواکن وحضرت والد ماجد فرمودند درحدیث آمدہ کہ روزِ قیامت خدا خواہد گفت کہ من مریض شدم دوا نہ کردی وگرسنہ شدم وتشنہ شدم وعریاں شدم آب وطعام وجامہ ندادی بندہ گوید خدایا تو منزہ می فرمود کہ فلاں

میرے چچا شاہ اہل اللہ فن طب میں بڑی مہارت رکھتے تھے ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیمار ہے اس کا علاج کرو۔ (شاہ صاحب موصوف نے اپنا یہ خواب اپنے بڑے بھائی شاہ ولی اللہ صاحب سے بیان کیا) آنجناب (حضرت والد ماجد) نے فرمایا کہ حدیث شریف

---

[۱] القول الجلی : ۱۲۱ ۔ ۱۲۴

بندہ من بیمار بودہ گرسنہ بود گویا من بودم۔ [۱۲]

میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں بیمار تھا تو نے دوا نہ دی۔ میں بھوکا تھا، پیاسا تھا، برہنہ تھا تو نے کھانا، پانی اور کپڑا نہ دیا۔ بندہ عرض کرے گا خداوندا تو، تو ان تمام دنیاوی ضرورتوں سے پاک و بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرا فلاں بندہ بیمار تھا فلاں بھوکا تھا، تو گویا میں ہی بیمار، بھوکا تھا۔

بڑے بھائی نے اس خواب کی تعبیر یوں کی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ تنبیہ ہوئی ہے کہ تم مطب کیا کرو کیوں کہ فن طبابت کی تحصیل کے بعد مطب نہ کرنا اور مخلوق خدا کو فائدہ نہ پہونچانا ویسا ہی ہے جیسا صاحب استطاعت و مقدرت ہوتے ہوئے کسی بھوکے کو کھانا نہ کھلانا یا کسی حاجت مند کی حاجت روائی نہ کرنا، قیامت میں اس پر مواخذہ ہوگا۔

چنانچہ اس کے بعد سے آپ نے طبابت شروع کی اور ایک "واقعہ" کے بعد سے تو اس فن میں اس قدر انہماک و شغف بڑھ گیا کہ شبانہ روز میں وقت نا وقت کوئی مریض بھی آجاتا تو فوراً اس کو دیکھتے تھے۔

روزے در واقعہ دیدند کہ گویا عزیزے بزرگ بر فیل سوار و در دست قصبے طولانی وارد آمد و بایشاں گفت کہ برائے تہنیت شما

ایک روز واقعہ میں دیکھا کہ ایک بزرگ عزیز جن کے ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈنڈا ہے ہاتھی پر سوار آئے اور ان سے کہا کہ میں

---

[۱۲] ملفوظات عزیزی: ۴۳۔

آمدہ ام و بشارت آوردہ ام کہ خدائے تعالیٰ از علاج شما شفا یافت یا گفت کہ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام شفا یافت ازیں معنی ایشاں را نہایت فرحت وابتہاج حاصل شد ازاں وقت خادماں را اجازت دادند کہ ہر وقت کہ کسے مریض بیاید البتہ مرا اطلاع دہید در ہر حال کہ باشم۔

تم کو مبارک باد دینے آیا ہوں اور یہ بشارت لایا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے علاج سے شفا پائی یا یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شفا پائی۔ اس بات سے آنجناب (عم مکرم) کو نہایت مسرت و مسرت ہوا اور اسی وقت سے خدام کو یہ حکم دیدیا کہ جس وقت بھی کوئی مریض آجائے تو مجھے فوراً اطلاع دو میں جس حالت میں بھی ہوں۔

اس واقعہ کے بعد اپنے کو ہمہ وقت مخلوق خدا کی خدمت کے لئے وقف کردیا اس اچانک تبدیلی پر کہ کہاں تو فن طبابت سے پہلو تہی کرتے تھے اور کہاں اب کسی دم اس سے الگ نہ ہونا چاہتے تھے اکثر اعزہ و مقربین نے پوچھا تو فرمایا کہ:

معلوم نیست کہ معالجۂ کدام کس درجہ قبولیت یافت در ایام کہ مداوات یک دو فقیر ہم اتفاق افتادہ بودہ شاید بمقتضائے حدیث قدسی مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِی الحدیث بہ نسبت شاں ایں معنی ظہور نمودہ۔[۱۳]

مجھے نہیں معلوم کہ کس شخص کے علاج سے درجۂ قبولیت حاصل ہوا (جو وہ بزرگ مجھے مبارکباد و بشارت دینے آئے) اس دوران دو ایک فقیروں کے علاج کا اتفاق ہوا تھا شاید بمقتضائے حدیث میں بیمار ہوا تم نے میری عیادت نہ کی، اسی نسبت سے اس معنی نے ظہور کیا۔

---

[۱۳] القول الجلی : ۲۲ — ۴۲۱

شاہ صاحب نہ صرف یہ کہ مطب میں آئے ہوئے مریضوں کو دیکھتے بلکہ ضرورت وقت پڑنے پر ان کے مکانوں پر بھی تشریف لے جاتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ:

در وقتیکہ در دہلی کہنہ می ماندم در کوچہ انبیا خانہ رسیدے کنیز کے پوربی جاہلہ بود و نماز ہم در عمر خود گاہے نخواندہ و چون مسنہ بود و حق پرورش بر ہمہ صاحب زادگان خود داشت، بسیار خدمت و خاطرش می کردند قریب موت آوازے بلہجہ مشرقی می کرد بفہم کسے نمی آمد حکما و صلحا را طلبیدہ می پرسیدند آخرش نوبت بہ عم من کہ شاہ اہل اللہ نام داشت رسید ایشان دریافتند کہ می گوید لاتخافی ولا تحزنی از مجانتش گفتند بہ پرسید ایں لفظ برائے چہ می گوئی بعد کوشش بسیار گفت گروہے از من می گویند باز پرسیدند چہ معنی دارد گفت معنی نمی دانم مگر معلوم می شود کہ برائے تسلی می گویند باز تکلیف دادند کہ از ایشان بپرس کہ از کدام عمل ایں تسلی می کنند بعد دیرے گفت می گویند ہیچ نماز و روزہ وغیرہ عملے خیر نکردہ مگر روزے برائے روغن رفتہ از بازار

جس زمانہ میں پرانی دہلی میں میں رہتا تھا کوچہ انبیا کے ایک سید کے یہاں ایک پوربن بڑھیا جو ان پڑھ تھی لونڈی کی حیثیت سے پلی تھی عمر میں کبھی نماز تک نہ پڑھی تھی رہتی تھی جب آخری وقت آیا تو پوربی لہجے میں کچھ ایسے الفاظ ادا کرنے لگی جو کسی کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ کئی اطبا، صلحا بلوائے گئے۔ جب کسی کی سمجھ میں نہ آیا تو چچا جان (شاہ اہل اللہ) کو زحمت دی گئی۔ آپ نے غور کر کے سنا تو پتہ چلا کہ کہہ رہی ہے "ڈرو مت پریشان و رنجیدہ نہ ہو" آپ نے گھر والوں سے فرمایا کہ اس سے پوچھو کہ یہ الفاظ کیوں کہہ رہی ہے بڑی مشکل سے بولی کہ کچھ لوگ کھڑے ہوئے مجھ سے یہ الفاظ کہہ رہے ہیں۔ دریافت کیا گیا کہ ان الفاظ کا کیا مطلب ہے بولی یہ تو نہیں جانتی مگر دل کہتا ہے کہ میری تسلی کے لیے کہہ رہے ہیں۔ کہا گیا کہ ان لوگوں سے پوچھو کہ کس کام کے سلسلے میں یہ

در موسم سرما آوردہ جوشش می کردی یک
روپیہ برآمد مد اول خواستی کہ پنہاں
داشتہ بکار خود آرے چراکہ کسے را
بینائی ایں امر نمی دانستے باز از دیدن
حق جل و علا شرم کردہ بہ صاحبش
تسلیم ساختے ایں فعل حسن پسند افتاد
بعوض آں بشارت می دہم [۱۲ہ]

تسلی دے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر خاموش
رہنے کے بعد بولی یہ کہہ رہے ہیں کہ تونے
زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا مگر ایک
دن سردی کے موسم میں تو بازار سے گھی
لے کر گھر آئی اور اسے گرم کیا تو اس میں
سے ایک روپیہ نکلا تھا۔ پہلے تیری یہ نیت ہوئی
کہ یہ روپیہ ہضم کرے کیوں کہ کسی کو اس کی
خبر نہ تھی مگر پھر اللہ کے خوف سے تونے
وہ روپیہ دوکان دار کو لے جاکر واپس
کر دیا۔ تیرا یہی فعل پسند آگیا اور اسی
کے بدلہ یہ بشارت دے رہے ہیں۔

ایک دوسرا واقعہ بھی انھیں کی زبانی ملاحظہ ہو:

درہموں وقت وہموں جا بزرگے بود
در مرض موت باعم موصوف رفتیم
آں بزرگ بہ طور سبحہ گردانی انگشتاں
رامی گردانید و چنانچہ بعد صد شمارہ
رامی کشند می کشید چو عم شما انگشتاں
رامطابق کرد بعد صد گردانیدن و
کشیدن صادق می آمد گفتند کار نیکو

(ایک بار ایک مریض کے گھر جاتے
وقت شاہ عبدالعزیز صاحب کو
بھی جو اس وقت بچے تھے ساتھ
لیتے گئے) مریض ایک بزرگ تھے
مرض الموت سے دوچار تھے غفلت
طاری تھی مگر ہاتھ کی انگلیاں اس
طرح چلا رہے تھے گویا ہاتھ میں تسبیح

[۱۲ہ] ملفوظات عزیزی: ۱۳-۱۲-

را محاورہ ساختن بہ کار می آید و بے قصد هم فعل بوقوع می آید بعد ملکہ چنانچہ گذشت [۱۵]

ہوا اور ایک تسبیح پوری کر کے دوسری شروع کرتے وقت امام کو درست کر رہے ہوں - جب میرے چچا نے حساب کیا تو ٹھیک سَو دانے گننے کے بعد وہ امام کو درست کرتے تھے - شاہ اہل اللہ فرمانے لگے کہ نیک کام کا محاورہ پڑجانا بھی بڑے کام آتا ہے کہ بے ارادہ و بے ہوشی میں بھی وہ کام انجام پا رہا ہے -

(باقی آئندہ)

---

[۱۵] ملفوظات عزیزی : ۱۳ -

تبصرے

جدید دنیا میں اسلام مسائل اور امکانات

مرتبہ: پروفیسر آل احمد سرور، تقطیع متوسط، ضخامت: ۳۲۸ صفحات، کتابت طباعت بہتر، قیمت: ۴۰ روپے، پتہ: اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے حسب معمول ۱۹۸۱ء میں ایک بڑا سیمینار جدید دنیا میں اسلام مسائل اور امکانات کے موضوع پر ہوا تھا۔ اس سیمینار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں علماء اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات دونوں نے حصہ لیا اور مقالات پڑھے تھے۔ یہ مقالات تعداد میں بائیس ہیں جو موضوع بحث کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر حاوی ہیں۔ ایک مقالہ راقم الحروف کا بھی تھا جو اس میں شامل ہے، اس مقالے کا عنوان ہے: شریعت بدلتے ہوئے زمانے میں، حضرت عمر فاروق کے اجتہادات کی روشنی میں۔ علماء میں مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی کا مقالہ ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت، مولانا اخلاق حسین قاسمی کا مقالہ سیکولر ملکوں میں اسلام کا رول اور انگریزی تعلیم یافتہ حضرات میں جناب غلام نبی صاحب باگرو کا مقالہ ہندوستانی سیکولر جمہوریہ میں اسلامی قانون کی مناسبت اور ایم۔ اے شیدا کا مقالہ مسلم ممالک میں اسلامی قانون کا نفاذ اور اس کا جواز جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا مقالہ حضرت عمر فاروق اعظم کے اجتہادات سے ہم کو کیا ملا اور کیا مل سکتا ہے۔ اس مجموعے

کے خاص اور اہم مقالات ہیں۔ ان کے علاوہ اور مقالات بھی لائق مطالعہ ہیں۔ لیکن ہم کو سب سے زیادہ متاثر شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم کے خطبۂ افتتاحیہ نے کیا۔ یہ خطبہ زبان وبیان اور افکار وخیالات کے اعتبار سے اس مجموعے میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر آل احمد سرور نے موضوع سیمینار کا تجزیہ وتحلیل جس خوبی اور بلاغت سے کیا ہے وہ بھی بہت قابل قدر ہے۔ میر واعظ مولوی محمد فاروق صاحب نے اپنے مقالے میں جو کچھ فرمایا ہے ان کے جذبۂ ایمانی اور ولولۂ عمل کی نشانی ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے اور اس کے مطالعہ سے شادکام ہوں گے۔

ایام خلافت راشدہ

از مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈانگری، ضخامت ۴۸۰ صفحات، کتابت وطباعت معمولی، قیمت مجلد -/30، پتہ: جامعۂ سراج العلوم السلفیہ، ڈاکخانہ بڑھنی ضلع بستی، یوپی۔

خلافت راشدہ اور اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت پر اصلاً اور ضمناً عربی، اردو، انگریزی اور دوسری زبانوں میں کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اس عہد مبارک کی مکمل تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے، فاضل مولف جو مشہور عالم دین اور مصنف ہیں انھوں نے اصل مآخذ اور مراجع کو کھنگال کر اس کتاب میں فوجی انتظامات، مالیاتی نظم ونسق اور فتوحات کو نظر انداز کر کے صرف ان واقعات کو یکجا کر دیا ہے جن کا تعلق خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ذاتی سیرت و کردار اور ان کے طریق حکمرانی وجہاں بانی سے تھا، جو عدل وانصاف، انسانی مساوات اور رحمدلی وشفقت وہمدردی بنی نوع انسان کی اساس پر قائم تھا۔ اس پوری کتاب کے پڑھنے سے خود بخود یہ اثر ہوتا ہے کہ آج کل کی اصطلاح

میں لوگ جس کو فلاحی ریاست (Welfare State) کہتے ہیں ایسی مثالی اسٹیٹ دنیا کی تاریخ میں اگر کبھی اور کہیں عملاً قائم ہوئی ہے تو بے شبہ وہ وہی اسٹیٹ تھی جسے زمانہ خلافت راشدہ کے نام سے جانتا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جنھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر فرمایا ہے انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے: "مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری لائق شکر و تحسین ہیں کہ انھوں نے وقت کے تقاضہ کو محسوس کرتے ہوئے خلافت راشدہ کے انسانی اور اخلاقی پہلو کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ مسلمان حکام، ذمہ داروں اور عہدہ داروں کے لئے ایک دستاویز اور پوری انسانیت کے لئے ایک تحفہ ہے۔" ضرورت ہے کہ اس کا ترجمہ ہندی اور انگریزی میں بھی شائع کیا جائے۔

دلائل ہستی باری تعالیٰ

از مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری، تقطیع متوسط، ضخامت ۱۸۰ صفحات، کتابت و طباعت معمولی، قیمت مجلد درج نہیں، مندرجہ بالا پتہ سے ملے گی۔

وجود باری تعالیٰ کے عقلی اور نقلی، منطقی اور وجدانی دلائل و براہین قرآن مجید میں اور مذہب و فلسفہ و منطق کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں، مولانا نے ان دلائل کا خلاصہ اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ کتاب اغلاط اور زبان و بیان کی خامیوں سے پُر ہے۔

(س ا)

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔ تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس، روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب و کوئٹہ

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹۔ ۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط، امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، [illegible]، تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔ نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ ردہ، سرگذشت ضلع بجنور، علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات، لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم، رموز عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبدالحق، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب، [illegible] عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

Regd. No. . (N) 231
R. No. 965—57

PHONE : 262815
Subs. 40- Per Copy Rs. 3-50

OCTOBER 1984

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

ٹائمیٹل جلال پریس جامع مسجد دہلی ۶

نومبر ۱۹۸۴ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

قیمت سالانہ : چالیس روپے

مرتبہ

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق ۔ فہم قرآن ۔ تاریخ ملت حصہ اول 'نبی عربی صلعم' ۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ تاریخ ملت حصہ دوم 'خلافتِ راشدہ' ۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول ۔ اسلام کا نظام حکومت ۔ سٹریہ ۔ تاریخ ملت حصہ سوم 'خلافت بنی امیہ'

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخ ملت حصہ چہارم 'خلافتِ ہسپانیہ' ۔ تاریخ ملت حصہ پنجم 'خلافت عباسیہ اول'

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم 'خلافت عباسیہ دوم' ۔ بصائر ۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم 'تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ' ۔ تدوین قرآن ۔ اسلام کا نظام مساجد ۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم 'خلافت عثمانیہ' ۔ جارج برنارڈ شا ۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابت حدیث ۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت ۔ قرآن اور تعمیر سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

برہان

سالانہ چندہ
چالیس روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۴ | صفر المظفر ۱۴۰۵ھ مطابق نومبر ۱۹۸۴ء | شمارہ ۵

عبید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی کے دردناک حادثۂ قتل کے بعد ۳۱ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا اپنے ہی حفاظتی دستہ کے دو ظالم وسفاک نوجوانوں کی گولیوں کی بوچھار کا شکار ہوکر ہلاک ہو جانا آزادی کے بعد سے اب تک وہ دوسرا نہایت الم ناک اور دردناک حادثہ ہے جس نے ملک وقوم میں درد وکرب اور شدت غم کی لہر دوڑادی ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب اندرا گورنمنٹ نے دربار صاحب امرتسر میں فوج بھیجنے کا اقدام کیا تھا ہمارا ماتھا اسی وقت ٹھنکا تھا کہ اب خیر نہیں ہے، کیونکہ جہاں تک خالصتان کے مطالبہ کا تعلق ہے وہ ایک خالص سیاسی معاملہ تھا اور اس لیے سکھوں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو خالصتان کا مخالف تھا لیکن دربار صاحب میں فوج کا داخلہ خالص ایک مذہبی معاملہ تھا جس پر سب سکھ متفق ہو گئے خواہ وہ خالصتان کے حامی ہوں یا نہ ہوں۔ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جب مذہبی جذبات بھڑکتے ہیں تو انسان دیوانہ ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ یہ نہیں سوچتا کہ جو کچھ ہوا ہے اس میں خود اس کی کم نظری یا غفلت کو دخل ہے یا نہیں۔ اس کے عتاب اور غضب کا نشانہ صرف وہ شخص یا جماعت ہوتی ہے جس نے اس کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا ہے چنانچہ وہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ پہلے سے تھا اور ملک اندرا گاندھی جیسی محبوب اور ہردلعزیز شخصیت سے محروم ہو گیا۔

اندرا گاندھی کی ہر دلعزیزی اور ان کی قائدانہ شخصیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے کہ ایک مرتبہ الیکشن میں اس طرح شکست کھا جانے کے بعد کہ ان کا اور ان کی پارٹی کا نام ونشان مٹ گیا اور ملک میں جنتا گورنمنٹ قائم ہوگئی اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری حالانکہ ان کی مختلف طریقوں سے تذلیل کی گئی اور ان کی توہین میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ وہ اپنی تقریروں میں برابر یہ کہتی رہیں کہ جنتا گورنمنٹ بھانت بھانت کے لوگوں کا ایک سنگھٹن ہے جو "اندرا ہٹاؤ" کے نعرے پر متفق ہوگئے ہیں۔ اب جبکہ اندرا ہٹ گئی ہے اور زمام حکومت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے تو اب ان کے اندرونی اختلافات ابھریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ الیکشن کی مدت ختم ہونے سے پہلے پہلے حکومت کا شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔ چنانچہ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اور جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ ابھی پورے دو برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ جنتا گورنمنٹ ختم ہوگئی اور اندرا گاندھی پھر اسی شان وشوکت اور ساتھیوں اور رفیقوں کے ساتھ واپس آگئیں اور پھر دوبارہ ہندوستان کی وزیراعظم بنیں۔ اس چیز نے ان کی ہر دلعزیزی کا لوہا ساری دنیا سے منوا لیا اور اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں اس کی کوئی مثال شاذ ونادر ہی مل سکتی ہے۔

لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ان کی حکومت کا یہ دور آخر اتنا شاندار اور کامیاب نہیں رہا جتنا کامیاب پہلا دور تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے ان کا پورا ساتھ نہیں دیا۔ انھوں نے فرقہ وارانہ فسادات روکنے کے لئے خاص مسلمانوں کے متعلق تمام ریاستوں کو جو احکامات بھیجے ان پر کسی حکومت نے عمل نہیں کیا۔ یہی حال ان ضوابط کا ہوا جو قومی یکجہتی کے لئے حکومت کے منظور کردہ تھے۔ گورنمنٹ

کے افسروں میں قانون کی خلاف ورزی کا ایک عام رجحان پیدا ہو گیا تھا، رشوت کے بغیر کوئی
کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اشیار کی گرانی میں روز بروز ہوش ربا اضافہ ہو رہا تھا، شہروں
میں گندگی کے انبار نظر آتے تھے، بجلی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا، جن اداروں میں کبھی رشوت
کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا مثلاً کالج یونیورسٹیاں وغیرہ، ان میں بھی داخلے اور امتحان
میں رشوت کی گرم بازاری شروع ہو گئی تھی عوام کی زندگی اجیرن بن گئی تھی جو لوگ
ناجائز ذرائع سے روپیہ کماتے ہیں یہ ملک انھیں کے رہنے کی جگہ بن گیا تھا پھر سب سے
اخیر میں دربار صاحب میں کروڑوں روپے کے نہایت مہلک اسلحہ کا جو ذخیرہ ہاتھ لگا، یا
اب بھی پنجاب کے مختلف علاقوں میں اسلحے برآمد ہو رہے ہیں، کیا یہ سب کچھ اعلیٰ افسران
حکومت کی سازش اور غیر آئینی حرکات کے بغیر ممکن ہو سکتا تھا، اور دور کیوں جائیے!
اندرا گاندھی کا اپنے حفاظتی دستے کے دو نوجوانوں کے ہاتھوں اس دردناک طریقہ
پر ہلاک ہو جانا خود اس کی دلیل ہے کہ ان کا اعلیٰ خفیہ پولیس کا انتظام کس درجہ ناقص اور
خراب ہے، یہ دونوں نوجوان سکھ تھے اس لیے خفیہ پولیس کا فرض تھا کہ ان کے حرکات و
سکنات پر کڑی نگاہ رکھے، سیکورٹی ضوابط کے ماتحت یہ دو نوجوان بیک وقت یکجا
نہیں ہو سکتے تھے پھر یہ کیسے جمع ہوئے اس کے علاوہ ایک قاتل دو ماہ کی رخصت
لے کر پنجاب میں اپنے وطن چلا گیا تھا، خفیہ پولیس کا فرض تھا کہ وہ یہ معلوم کرتی کہ
پنجاب میں جو دہشت پسند فوج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں ان میں کوئی اس نوجوان
کا قریبی عزیز و قریب تو نہیں تھا، پھر یہ بھی دیکھنا چاہیئے تھا کہ دو مہینے کی چھٹی کے زمانے
میں یہ نوجوان کیا کرتا رہا اور کن لوگوں سے اس کی ملاقاتیں ہوئی ہیں اور کن کن لوگوں سے
کیا کیا گفتگوئیں ہوئی ہیں، اگر اعلیٰ محکمۂ خفیہ پولیس اس طرح وزیر اعظم کے حفاظتی دستے
کی نگرانی کرتا تو غالباً یہ واقعہ پیش نہیں آسکتا تھا، بہرحال جو مقدر تھا وہ پیش آکے
رہا اور ہم اس کو بھی حکومت کی نا اہلیت اور کرپشن کا ایک شاخسانہ

کہہ سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ حکومت کی ان کمزوریوں اور نا اہلیوں کے باوجود خود اندرا گاندھی کی شخصیت ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز شخصیت تھی، انھوں نے شخصی اور ذاتی طور پر اس ملک کو آگے بڑھانے کے لیے اور اس ملک میں سالمیت برقرار رکھنے کی غرض سے جو عظیم الشان کارنامے انجام دئے ہیں وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے اور ان کا اس دنیا سے رخصت ہو جانا یقیناً ایک عہد کا خاتمہ ہے، ساتھ ہی ہم ہندوستان کے تمام ارباب سیاست سے خواہ وہ با اقتدار پارٹی کے افراد ہوں یا مخالف پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہوں دردمندانہ اپیل کرتے ہیں کہ اس وقت ملک نہایت خطرناک حالات سے گذر رہا ہے، ضرورت ہے کہ سب لوگ اپنی اپنی پارٹی کے مفاد کو نظر انداز کرکے ملک وقوم کے مفادات کو پیش نظر رکھیں اور ان کے لیے مل جل کر اتحاد و اتفاق سے کام کریں، ملک میں بہت بڑے پیمانے پر فوری طور پر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور جس میں ہزاروں آدمی ہلاک اور برباد ہوگئے، ان کی کروڑوں روپے کی جائیدادیں اور املاک تباہ ہوگئیں، حد درجہ افسوسناک اور ملک کی پیشانی کا نہایت بدنما داغ ہے۔ ہر محب وطن کا فرض ہے کہ وہ آئندہ کے لئے اس بات کا عہد کرے کہ وہ اس صورت حال کا جرأت اور دلیری کے ساتھ مقابلہ کرے گا اور اس کا پھر دوبارہ اعادہ نہیں ہونے دے گا۔

ان دنوں ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونے کی بنا پر رسالہ کی ترسیل بروقت عمل میں نہ آسکی۔

اس غیر معمولی تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

منیجر رسالہ برہان
عمید الرحمٰن عثمانی

مفتی صاحب کی کہانی میری زبانی

(۳)

سعید احمد اکبر آبادی

دور جدید کے اردو شعراء میں حسرت موہانی، مفتی صاحب کو سب سے زیادہ پسند تھے، وہ ان کے بڑے مداح اور معترف تھے، ان کی غزلوں کی غزلیں مفتی صاحب کو یاد تھیں، حسرت کی ایک غزل جس کے دو شعر یہ ہیں:

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!
بے زبانی ــــ ترجمانِ شوقِ بیحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!

ایک اور غزل ہے جس کے یہ دو شعر اب تک مجھے یاد ہیں:

دامنوں کی نہ خبر ہے نہ گریبانوں کی
قابلِ دید ہے دنیا ترے حیرانوں کی
اے جفا کار ترے عہد سے پہلے تو نہ تھی
کثرت اس درجہ محبت کے پشیمانوں کی

مفتی صاحب کو حسرت کی یہ دو غزلیں بہت پسند تھیں، بہانہ بہانے سے

انھوں نے ان کو اتنی بار پڑھا کہ سنتے سنتے مجھے بھی یاد ہوگئی تھیں، ایک مرتبہ مجھ سے دریافت کیا: تمھیں حسرت کا کونسا شعر سب سے زیادہ پسند ہے؟ میں نے کہا یہ شعر:

تمنا نے کی خوب نظارہ بازی
مزہ دے گئی حُسن کی بے شعوری

بولے: اوہو ہو! کیا غضب کی داخلیت ہے۔

حسرت سے مفتی صاحب کی ملاقات بھی عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی، ایک مرتبہ مفتی صاحب نے بیان کیا: تحریک خلافت شباب پر تھی، اس کی ایک کانفرنس کراچی میں تھی، اس میں شرکت کے لیے دارالعلوم دیوبند سے میں اور چند ساتھی کراچی کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں صبح کے وقت ہم بیدار ہوئے تو دیکھا کہ ہمارے سروں پر اوپر کی برتھ پر ایک صاحب تشریف فرما ہیں جو فربہ اندام اور پست قامت ہیں، رنگ سانولا، چہرہ پر چیچک کے نشان، ڈاڑھی گنجان، آنکھیں درخشاں اور بڑی، پیشانی فراخ اور کشادہ، نہایت موٹے کھدر کی شیروانی اور پاجامہ، سر پر میلی کچیلی ترکی ٹوپی، عمر چالیس پچاس کے درمیان، اب ہم لوگوں کی ان بزرگوار پر اچانک نظر پڑی تو ان سے دلچسپی پیدا ہوگئی، سوال یہ تھا کہ یہ ہیں کون بزرگوار؟ جتنے منہ اتنی باتیں، کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ، میں نے کہا: یہ بزرگوار کوئی بھی ہوں مگر ہیں کوئی بڑے آدمی ضرور! اتنے میں ایک بڑا اسٹیشن آگیا اور ہم نے ایک مکلف ناشتہ کا آرڈر دیا، ناشتہ آگیا تو ہم نے ان صاحب سے کہا: آیئے جناب ناشتہ کر لیجیے، وہ فوراً پھدک کر نیچے تشریف لے آئے اور میرے پہلو میں بیٹھ گئے، اب گفتگو شروع ہوئی:

ہم : جناب کہاں جا رہے ہیں ؟

وہ : (خنخناتی آواز میں) جی ! میں کراچی جا رہا ہوں۔

اب ہمارے کان کھڑے ہوئے اور ہم نے پوچھا: کیا آپ بتا سکتے ہیں کیوں"

وہ : وہاں خلافت کانفرنس میں شریک ہونا ہے۔

ہم : جناب کا اسم گرامی !

وہ : فضل الحسن میرا نام ہے۔

میں : (اشتیاق دید کی اضطرابی کیفیت کے ساتھ) ارے تو آپ مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی ہیں !

وہ : اب آپ نے پہچان ہی لیا تو میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

یہ سن کر ہم سب کو بڑی خوشی ہوئی اور ہم میں سے ہر ایک نے بڑی عقیدت کے ساتھ مولانا سے مصافحہ کیا، اب مولانا نے کہا: آپ بھی تو اپنا تعارف کرائیں، جب مولانا کو علم ہوا کہ ہم سب دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھتے ہیں اور مدرسہ کی جمعیۃ الطلبا کے عہدہ دار ہیں تو مولانا بڑے مسرور ہوئے اور ہم سے فرداً فرداً دوبارہ مصافحہ کیا، اب ناشتہ سے فراغت کے بعد ہم اطمینان سے بیٹھے تو میں نے مولانا سے عرض کیا: حضرت! ہم سب آپ کے کلام کے عاشق ہیں، کچھ عطا فرمائیے، مولانا نے فوراً سنانا شروع کر دیا۔ پہلے اپنی وہ مشہور غزل سنائی جس کا ایک شعر یہ ہے:

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا ذہن میں رہے

اس کے بعد دو تین غزلیں اور سنائیں، مفتی صاحب کہتے تھے: علاوہ شعر و شاعری کے مولانا کی گفتگو بڑی دلچسپ اور پر لطف ہوتی تھی۔

مجھے "بڑے بھائیوں" کے محلہ میں رہتے ہوئے دو برس ہی ہوئے تھے کہ رمضان کی تعطیل میں آگرہ آیا تو یہاں حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم دارالعلوم جن کی مشفقانہ توجہ اب میری طرف زیادہ ہو گئی تھی، ان کا ایک والانامہ والد صاحب قبلہ کے نام موصول ہوا جس میں تحریر تھا: "سعید دیوبند کے محلہ بڑے بھائیوں میں رہتا ہے، وہاں اس کی صحبت قصبہ کے لڑکوں کے ساتھ رہتی ہے، میں اس کو پسند نہیں کرتا اس لئے اب آپ سعید کو مدرسہ کے احاطہ میں رکھیں" والد صاحب نے جواب دیا: "آپ نے بجا فرمایا میں تعمیل ارشاد کروں گا، مگر درخواست یہ ہے کہ آپ سعید کو ایک کمرہ بلا شرکتِ غیرے دے دیں اور نیز آپ اس کو براہ راست اپنی یا کسی بڑے استاد کی نگرانی میں رکھ دیں"۔ مہتمم صاحب نے دونوں باتیں مان لیں، چنانچہ مدرسہ یا مسجد کی طرف سے دارالاہتمام میں جانے کے لیے جو زینہ اوپر جا رہا ہے اس کے وسط میں بائیں جانب اس زمانہ میں صرف دو کمرے تھے (اب تیسرا بھی بن گیا ہے) ان میں سے ایک کمرہ جو دروازہ کے سیدھ میں ہے اس میں حضرت مولانا سراج احمد رشیدی رہتے تھے اور دوسرا کمرہ جو اس کی بغل میں ہے اس کو مولانا حبیب الرحمن صاحب نے میرے لیے تجویز فرمایا۔ اس بنا پر رمضان کی تعطیل کے ختم پر میں مدرسہ آیا تو اسی کمرہ میں فروکش ہوا اور رہنے لگا۔

اب میرے قیام دارالعلوم کا تیسرا دور شروع ہوا جو آخری بھی ہے، یہ دور جو تین برس کی مدت پر ممتد ہے، میری تعلیمی زندگی کا نہایت اہم دور ہے، کیونکہ میری تعمیر و تشکیل جو کچھ ہوئی ہے اسی دور میں ہوئی ہے، پہلے میرا ماحول شعری و ادبی تھا، لیکن اب میرا ماحول علمی اور دینی تھا، پہلے میری صحبت چند شہری طلبہ کے ساتھ تھی، اب میں ہر وقت اساتذۂ کرام اور چند نہایت ہونہار اور ذہین و مستعد مختلف صوبوں کے طلبہ کی معیت میں تھا۔ میرا کھانا پینا اور ناشتہ وغیرہ حضرت الاستاذ مولانا

سراج احمد رشیدی کے ساتھ تھا، مولانا جو حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت بھی تھے، دارالعلوم کے اکابر اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، اردو اور فارسی کے پختہ کلام شاعر بھی تھے، طبعاً نہایت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور مجلسی بزرگ تھے، ہر جمعرات کو ان کے ہاں مغرب کے بعد احباب کی مجلس جمتی تھی جو اپنے اپنے گھر سے کھانا لاکر ایک ساتھ ہم طعامی کرتے تھے اور کھانے کے بعد سبز چائے کا دور چلتا تھا جس کا اہتمام مولانا بہت زیادہ کرتے تھے، اس مجلس کے .... ارکان خاص علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، شیخ الادب مولانا محمد اعزاز علیؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا محمد بدر عالم صاحب میرٹھی۔ مفتی صاحب 'طباخ' بھی بہت اچھے تھے اور خصوصاً مرغ کا اسٹو پکانے میں تو ان کو بڑا کمال تھا۔ اسی لئے اس مجلس میں کبھی کبھی اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی کوئی چیز بھی لے کر آتے۔ اسی طرح مولانا محمد بدر عالم صاحب بڑے اچھے شکاری تھے، اس لئے وہ کبھی مرغابی یا تیتر سے اس مجلس کی تواضع کرتے۔

مفتی صاحب اس زمانے میں مدرس تھے اور دارالافتا میں فتوی نویسی بھی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں کرتے تھے، مفتی صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا بڑے شوق، دل کی لگن اور محنت سے پڑھا تھا، پھر ذکاوت و فطانت خداداد اور فطری اور اساتذۂ کرام اپنے اپنے فن میں یگانۂ روزگار، اس بنا پر ہر علم و فن کی استعداد مفتی صاحب کی پختہ اور اعلیٰ تھی، اس پر مستزاد یہ کہ ان میں ملکۂ تقریر و خطابت اعلیٰ قسم کا تھا، افہام و تفہیم کی صلاحیت قدرتی تھی، اپنے مافی الضمیر کا اظہار بڑی وضاحت اور صفائی سے کرتے جس میں گنجلک یا الجھن نام کو بھی نہ ہوتی تھی، اس بنا پر ان کا درس مقبول تھا، البتہ آواز ان کی بلند تھی اور درس بھی وہ اس بلند آواز سے دیتے تھے کہ ان کی آواز درس گاہ سے باہر دور تک جاتی تھی، مفتی صاحب

کو خود بھی اپنی بلند آوازی پر ہنسی آتی تھی، ایک دن ہنستے ہنستے سنانے لگے: ایک مرتبہ جامع ازہر، مصر کے ایک استاد یہاں آئے ہوئے اور دارالعلوم کے مہمان خانہ میں مقیم تھے، ایک روز وہ درس گاہوں میں گھومتے پھرتے میری درس گاہ میں بھی آگئے، میں اس وقت سلم العلوم (منطق) کا درس دے رہا تھا، میں نے مصری عالم کو خوش آمدید کہہ کر اپنے پاس بٹھالیا اور درس شروع کردیا اور جب گھنٹہ بجا اور درس ختم ہوگیا تو موصوف مجھ سے مخاطب ہوئے اور بولے: "یا استاذ واللہ انک لرجلٌ فاضل، ولکنک تجهر جهیر البرق احاف انک ستکون حمارًا۔" مفتی صاحب یہ واقعہ سنا کر خود بھی ہنس پڑے اور ہم سب کو بھی ہنسی آگئی۔

جہاں تک مفتی صاحب کی فتویٰ نویسی کا تعلق ہے اس کے متعلق وہ خود بیان کرتے تھے کہ شروع شروع میں وہ استفتا کا جواب بہت طویل لکھتے تھے جس میں موافق اور مخالف دلائل اور اخیر میں قول راجح کے دلائل اور ان کی عبارتوں کی بھرمار ہوتی تھی، لیکن حضرت مفتی صاحب ایسے تمام جوابات قلم زد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ تمہارا جواب ماقل و دل ہونا چاہیئے، ہر عبارت نقل کے لائق نہیں ہوتی، پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ مستفتی تم سے بحث نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک مسئلہ کے بارے میں صرف ایک حکم شرعی دریافت کر رہا ہے اس لئے تمہارا مطالعہ تو وسیع اور عمیق ہونا ضروری ہے لیکن جواب مختصر ہونا چاہیئے جس میں صرف چھنی چھنائی بات کا ذکر ہو، مفتی صاحب کہتے تھے: بڑی مشق اور تمرین کے بعد جب مجھ میں یہ صلاحیت اور استعداد پیدا ہوگئی تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: "ہاں اب تم کو فتویٰ لکھنا آگیا۔"

نیشنلزم یعنی قوم برادری اور اخلاص وطن کی تڑپ جیسے مفتی صاحب کی گھٹی میں پڑی تھی، اس معاملہ میں جتنا سنجیدہ فکر اور پختہ خیال میں نے مفتی صاحب

کو پایا ان کے معاصرین میں کسی کو نہیں پایا، ان کی طالب علمی کے زمانہ میں طلبا کا ایک قلمی اخبار نکلتا تھا جس کا نام یاد نہیں رہا، اس اخبار کی ایک اشاعت میں مفتی صاحب کا ایک طویل مضمون "سودیشی کی ضرورت" شائع ہوا تھا، میں نے یہ مضمون از اول تا آخر پڑھا، مضمون نہایت مدلل اور بصیرت افروز، پر زور اور شگفتہ و دلکش زبان میں تھا، میرے دماغ پر مفتی صاحب کے حسن تحریر کا پہلا نقش ان کے اسی مضمون کے مطالعہ سے قائم ہوا تھا، انھوں نے اس مضمون میں جو کچھ لکھا تھا اس کے عملی پیکر وہ خود تھے، چنانچہ اس زمانہ میں بھی جبکہ دار العلوم کے "شہزادے" یعنی اکابر دیوبند کی اولاد، نہایت عمدہ ململ، چکن کے کرتوں اور جاپانی ہزارہ کے لٹھے کے پاجاموں میں ملبوس نظر آتے تھے — مفتی صاحب اس زمانے میں بھی کھدر پہنتے تھے، وضع کے اتنے پابند تھے کہ ایک کرتہ جو زیادہ لانبا نہیں ہوتا تھا بغیر کالر کے ہوتا اور پاجامہ چوڑے پائنچوں کا اور سیدھی کاٹ کا اور دونوں کھدر کے اور کرتہ کے نیچے بنیان وہ بھی کھدر کی عمر بھر ان کا لباس یہی رہا، شیروانی پہنتے تھے مگر وہ بھی دیسی کپڑے کی، اس قسم کے وضعدار خال خال ہی ملیں گے۔

مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی میرے ماموں زاد بھائی تھے اور مجھ سے بیحد محبت کرتے تھے، سیوہارہ کے مدرسہ میں تکمیل تعلیم کے بعد دورۂ حدیث کے لیے دیوبند آئے تھے اور جس سال (۱۳۴۵ھ) میں خود دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اس سال یہ صحیح بخاری کا سماع کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے مجھ سے کہا: تم ہمہ تن متوجہ ہو کر حضرت شاہ صاحب (علامہ محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کی تقریر سنو اور میں تمہارے لیے وہ تقریر لکھتا رہوں گا، چنانچہ انھوں نے دو موٹی موٹی کاپیاں لکھی تھیں، جنھیں میں حرزِ جاں بنائے رکھتا تھا، لیکن جب ۱۹۴۷ء میں میرا گھر لٹا تو یہ کاپیاں بھی گئیں؛

کر دیا سوق کی نے میدان صاف

مفتی صاحب کی طرح مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی بھی شروع سے ہی جذبۂ استخلاص وطن وقوم پروری سے سرشار تھے اور ملکی وقومی مسائل ومعاملات میں دونوں کے افکار ونظریات میں بڑی ہم آہنگی ویک جہتی تھی، اس پرمستزادیہ کہ مولانا بڑے فعال ومتحرک تھے، ان میں لیڈر بننے کے صفات بدرجہ اتم موجود تھے، ہرکام میں پیش پیش رہتے تھے، اس وجہ سے اور بعض دوسرے اسباب کی وجہ سے بھی مفتی صاحب اور مولانا میں دانت کاٹے کی دوستی تھی، مولانا بدرعالم صاحب میرٹھی (ثم مہاجر مکی) کو ملکی سیاست اور قومی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، اس لیے مفتی صاحب سے خاص تعلق اور ربط رکھتے تھے، اس طرح ہم چار آدمیوں (مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن، مولانا بدرعالم اور راقم الحروف) کا ایک گروپ بن گیا تھا جو اوقات مدرسہ کے بعد عموماً ایک ساتھ رہتا تھا۔

ہم چاروں عصر کی نماز اکثر حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ان کی مسجد میں ادا کرتے تھے، اس مسجد میں دو کمرے تھے، ایک اندرون مسجد اور دوسرا بیرون مسجد، پہلا کمرہ حضرت مفتی صاحب کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا مفتی صاحب کی نشست گاہ تھا۔ نماز سے فراغت کے بعد اگر ٹہلنے یا کہیں جانے کا پروگرام نہ ہوتا تو مغرب تک اسی کمرہ میں نشست رہتی، مسجد میں امامت عموماً تو حضرت مفتی صاحب ہی کرتے تھے، لیکن جہری نماز میں کبھی کبھی وہ مفتی صاحب کو آگے بڑھا دیتے تھے، مفتی صاحب حافظ اور ساتھ ہی قاری تو اول درجہ کے تھے ہی ان کی آواز میں لوچ اور ہلکا ہلکا سا درد بھی غضب کا تھا اس لیے نماز میں بڑا لطف آتا تھا، ایک واقعہ سنیے:

۳۶ء میں ایم اے کا امتحان دلی یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن میں پاس

کرنے کے بعد مفتی صاحب کی دعوت پر جب میں پہلی بار کلکتہ گیا تو ایک روز مفتی صاحب، مولانا محمد حفظ الرحمٰن اور میں، ہم تینوں عصر کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے لئے بالی گنج میں ان کی کوٹھی پر گئے۔ مولانا حسب معمول بڑے تپاک، اور بے تکلفی سے ملے، باتیں کرتے کرتے مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تو مولانا کے ملازم احمدؔ نے وہیں ڈرائنگ روم میں جا نمازیں بچھا دیں، مولانا اور ہم باوضو تھے ہی، سید ھے مُصَلّے پر جا کھڑے ہوئے، اب ہم نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، لیکن مولانا نہ مانے اور مفتی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔ مفتی صاحب نے سورۂ القارعہ اور سورۂ الہٰکم التکاثر اپنے لحن داؤدی میں تلاوت کیں، سلام پھیرنے کے بعد مولانا آزاد نے دو رکعتیں سنت کی ادا کیں مگر کمال خشوع وخضوع سے، اس کے بعد صوفہ پر بیٹھ گئے، آنکھیں بند کرلیں، ایک اونی چادر جو اوڑھے تھے اس سے اپنے تمام جسم اور آنکھوں کو مستغنی کر کے تمام سر اور چہرہ چھپا لیا۔ دس منٹ کے بعد جب آنکھیں کھولیں تو مفتی صاحب کو خطاب کر کے فرمایا: "مولوی صاحب! اگر اصول تجوید کی رعایت کے ساتھ حسن صوت نہ ہو تو مخارج صحیح ادا ہوں گے مگر دل پر اثر نہ ہو گا، اللہ جل شانہٗ کا آپ پر بڑا فضل وکرم ہے کہ تجوید کے ساتھ خوش آوازی کی نعمت سے بھی آپ بہرہ ور ہیں۔ اس لیے آپ کی قرارت دل کے دروازہ پر دستک دیتی ہے۔"

ایک مرتبہ اس مسجد میں بڑا عجیب وغریب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ ہم چاروں نے حسب معمول عصر کی نماز مسجد میں حضرت مفتی صاحب کی امامت میں ادا کی، ایک بنگالی طالب علم تھا وہ بھی کم از کم عصر کی نماز تو اسی مسجد میں پڑھتا تھا، آج اس نے یہ کیا کہ نماز کا سلام پھرتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: "حضرات! اب میں دیوبند سے جا رہا ہوں، آپ میرے لیے دعا کریں کہ میرا خاتمہ بخیر اور اسلام پر ہو" جب دعا ختم ہو گئی تو حضرت مفتی صاحب اس طالب علم کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: "تم کہاں جا رہے ہو؟" اس نے

کہا: "تھانہ بھون" کیوں؟ حضرت مفتی صاحب نے دریافت فرمایا، "حضرت تھانوی مظلہٗ العالی سے تصوف کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے" طالب علم نے جواب دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت مفتی صاحب کو غصہ آگیا اور سخت لہجہ میں فرمایا: مولانا اشرف علی کو صوفی کون کہتا ہے، انھیں تصوف سے کیا واسطہ! حضرت مفتی صاحب کے یہ الفاظ بہ ظاہر بہت سخت اور حیرت انگیز ہیں، لیکن ان کی وضاحت واقعۂ ذیل سے ہوگی:

اس واقعہ کے چھ سات برس کے بعد جب میں مدرسۂ عالیہ مسجد فتحپوری دہلی میں تھا، ایک روز میں حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ باتوں باتوں میں حضرت تھانوی کا ذکر نکل آیا تو میں نے یہ واقعہ سنایا، مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اسے سنتے ہی ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے اور گردن جھکالی تھوڑی دیر کے بعد گردن اٹھائی، .... اور تاثراتی لہجہ میں فرمایا: "میاں سعید! کیا یہ واقعہ سچا اور تمھارا عینی مشاہدہ ہے؟" میں نے عرض کیا: "جی ہاں! اس وقت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھی موجود تھے، یہ دونوں حضرات تو یہیں دلی میں موجود ہیں، آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔" یہ سن کر فرمایا: اگر یہ واقعہ صحیح ہے ـــــ اور جب تم کہہ رہے ہو تو یقیناً صحیح ہی ہے ـــــ تو آج میرے دل کی ایک پرانی گرہ کھل گئی اور اس کی تفصیل یہ ہے: تحریک خلافت اور اس کے ضمن میں تحریک ترک موالات بڑے زوروں پر تھی اور جمعیت علمائے ہند کے زیر قیادت بڑی کامیابی سے چل رہی تھی، لیکن مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اس تحریک میں نہ صرف یہ کہ شریک نہیں ہوئے، بلکہ اس کی مخالفت میں فتویٰ دیا۔ جمعیت علمائے ہند نے اس کا سخت نوٹس لیا اور طے کیا کہ جمعیت کا ایک سہ نفری وفد تھانہ بھون پہونچ کر براہ راست مولانا سے گفتگو کرے، اس وفد کے لیے

تین نام منظور ہوئے : (۱) حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی (۲) مولانا احمد سعید دہلوی اور (۳) میں (حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ) ہم تینوں تھانہ بھون پہونچے اور تین روز تک وہاں مقیم رہے ، مولانا سے ہم لوگوں کی گفتگوؤں کا جو حشر ہوا وہ تو سب کو معلوم ہے ، دراصل سنانا یہ ہے کہ ایک دن ہم مولانا کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ایک شخص آیا اور سلام کر کے بیٹھ گیا ، مولانا تھانوی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا : تم کون ہو ؟ اس نے کہا : حضرت ! میں مظاہر العلوم کا ایک طالب علم ہوں ، حضرت سے استفادۂ باطنی کی غرض سے حاضر ہوا ہوں ، مولانا نے پوچھا کیا تم نے پہلے سے خط کے ذریعہ اس کی اجازت لی ہے ، یہ شخص بولا : جی نہیں ، اس پر مولانا نے برہم ہو کر کہا کہ تم اٹھ جاؤ ، مگر وہ نہیں اٹھا ، مولانا نے پھر کہا جاؤ مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا ، اس پر مولانا کے پاس ایک رسی کا بنا ہوا سونٹا رکھا رہتا تھا اس سے مولانا نے اس کو مارنا شروع کیا مگر یہ شخص اتنا ڈھیٹ تھا کہ پٹتا رہا مگر مجلس سے نہیں اٹھا ، مولانا نے اس کو اتنا مارا کہ ہم سب کو رحم آگیا ۔ اس وقت میرے دل نے کہا کہ مولانا تھانوی سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن صوفی نہیں ہو سکتے ۔

اس واقعے کو سنانے کے بعد مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ میری دل کی آواز عجیب و غریب تھی اس لیے میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا اور اپنا احساس اپنے ہی تک محدود رکھا لیکن اب تم نے حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا واقعہ جو سنایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس احساس میں تنہا میں ہی نہیں ہوں بلکہ حضرت مفتی صاحب بھی اس میں شریک ہیں ۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیاء کرام خلق خدا کے لیے سراپا رحم و کرم اور مجسمہ شفقت و محبت ہوتے تھے ، ان کی خانقاہوں کا دروازہ ہر وقت ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا ، ان کے یہاں آنے جانے والوں پر کسی قسم کی کوئی پکڑ دھکڑ یا دار و گیر کا

ضابطہ نہیں تھا، اس کے برخلاف حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مسترشدین کے لیے خاص خاص شرائط اور ضوابط تھے اور جو کوئی شخص ان شرائط وضوابط میں سے کسی ضابطے کی خلاف ورزی کرتا تھا وہ مورد عتاب بنتا تھا، اس فرق کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر لفظ صوفی کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت تھانوی نے متعدد جگہ لکھا ہے کہ میں نہ صوفی ہوں نہ پیر بلکہ میں ایک معلّم اور مصلح ہوں، جو شخص میرے پاس آتا ہے میں اس کے لیے اصلاح وتربیت کا کام کرتا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بحیثیت معلّم ومصلح اصلاح نفس، اصلاح عقائد، اصلاح معاملات ورسوم اور اصلاح عبادات واخلاق کے سلسلے میں جو نہایت عظیم الشان علمی اور عملی کارنامے انجام دئے ہیں ان کے پیش نظر ان کو اس صدی کا مجدد بے تکلف کہا جا سکتا ہے اس بنا پر حضرت مفتی عزیز الرحمن اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کو صرف ایک لفظی اصطلاح کا فرق سمجھنا چاہئے۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں ان کے کردار اور معیار کے مطابق نمبر جلد شائع ہونے جا رہا ہے۔ ایڈیٹر صاحب برہان کی طویل علالت کی وجہ سے اس میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ حضرت مفتی صاحبؒ کے سلسلے میں مضامین بلا تاخیر بھیجئے اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایڈیٹر رسالہ برہان کے لئے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

منیجر رسالہ برہان
عمید الرحمن عثمانی

سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام

سید کاظم نقوی، ریڈر شعبہ دینیات شیعہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اشتراکیت اور مارکسیت

کمیونزم اشتراکیت کی قسموں میں سب سے مشہور ہے۔ اس کی پوری عمارت "مادیت جدلی" (MATERLISTIC DIALECTICS) کے اصول اور نظریات پر تیار کی گئی ہے۔ باخبر اشخاص جانتے ہیں کہ یہ نظریات کارل مارکس اور ان کے رفقاء کار کے قیمتی اور قابل قدر، طویل غور و خوض کا نتیجہ نہیں ہیں۔ انھوں نے تاریخ، سماجیات اور اقتصادیات پر صرف ان کو منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔

فی الحال مختصر طور سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مارکسی نظام انسان کے سماجی اور مشکلات کو نہیں حل کر سکا۔ اس نے مرض کی صحیح تشخیص نہیں کی، اسی لیے وہ صحیح دوا تجویز نہیں کر سکا۔

نظام مارکسی کے مندرجۂ ذیل خصوصیات ہیں:

۱۔ شخصی ملکیت کا خاتمہ

شخصی ملکیت کو بالکل ختم کر کے تمام دولت قوم کی ملکیت قرار دیدینا چاہیے۔ حکومت

چونکہ قوم کی نمایندہ ہے لہٰذا دولت اس کے سپرد کردی جائے گی وہ پوری قوم کے سود وزیان کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں تصرف کرے گی۔ کمیونزم کے حامیوں کا کہنا ہے کہ سرمایہ داری کے دور میں انسانیت کو شخصی ملکیت کے جن تلخ نتائج سے دوچار ہونا پڑا وہ ہر شخص کے سامنے ہیں۔ ان سے بچاؤ کی یہی صورت ہے کہ حق مالکیت افراد سے چھین کر حکومت کو دیدیا جائے۔ اس کا مقصد طبقاتی تفریق مٹا کر پوری قوم کو ایک طبقہ کی شکل میں تبدیل کرنا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے لئے اس کا موقع نہیں رہے گا کہ ہر قسم کے جائز اور ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹیں۔ اپنے شخصی فائدے کی خاطر دوسروں کا خون چوسیں۔

۲۔ کارکردگی کے مطابق تقسیم

حکومت کے زیر اہتمام کارخانوں میں جو چیزیں تیار کی جائیں انھیں قوم کے افراد پر ان کی کارکردگی کے مطابق تقسیم کردیا جائے گا۔ ملک کا کوئی شخص بیکار نہیں رہ سکتا۔ ہر ایک اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کام کرے گا اور حکومت اس کی ضرورتوں کو پورا کرے گی۔ ظاہر ہے کہ ہر آدمی کی کچھ فطری ضروریات ہیں۔ بغیر ان کے پورا ہوئے ان کے واسطے زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے۔ وہ قوم کی فلاح وبہبود کی خاطر کوشش کرے گا اور قوم اس کی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرے گی۔

۳۔ لائحۂ عمل کی تعیین

حکومت کی طرف سے ایک اقتصادی پروگرام کا مرتب ہونا ضروری ہے، اسے قوم کی ضروریات کی مقدار اور نوعیت کو سمجھنا چاہیئے، تاکہ کارخانے اتنی اور ویسی ہی چیزیں تیار کریں۔ نظام مارکسی ان دونوں چیزوں کی کڑی نگرانی کرتا ہے۔ اگر ان کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ملک بعینہٖ انہی دشواریوں اور بیماریوں کا شکار ہو جائے گا جن میں نظام سرمایہ داری نے اسے مبتلا کیا تھا۔

یہ تین وہ نمایاں خصوصیتیں ہیں جو نظام مارکسی کو نظام سرمایہ داری سے جدا کرتی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مارکسیت کے علمبردار حکومت ہاتھ میں آنے کے بعد اس صحیح نظام کو مکمل طور پر کسی وقت بھی رائج نہیں کر سکے۔ انھیں یقین ہے کہ اس کا منطبق کرنا انسان کے تمام خیالات، جذبات اور محرکات میں انقلاب چاہتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عنقریب وہ خوشگوار زمانہ آئے گا جب انسان کے شخصی محرکات دم توڑیں گے اور جماعتی ذہنیت زندہ ہو کر چونکے گی۔ پھر یہی خود غرض آدمی ہمیشہ قومی مفادات کی بابت سوچے گا اور انہی کے لیے کوشش کرے گا۔ موجودہ ذہنیت سے انسان کو چھٹکارا دلانے کے لیے ضروری ہے کہ مارکسیت کے راستے پر لانے کی غرض سے پہلے اسے اشتراکی نظام کا پابند بنایا جائے۔ اس عبوری دور میں اس کے مزاج اور ذہنیت کو نظام مارکسی کے تحمل کے واسطے تیار کیا جائے گا۔ اشتراکیت' اسی مارکسیت کی اصلاح اور ترمیم شدہ دوسری شکل ہے۔ نظام مارکسی نے ہر چیز کا حق ملکیت قوم کا نمایندہ قرار دے کر حکومت کو دیدیا تھا۔ نظام اشتراکی نے اس میں ترمیم کی۔ اس نے ملک کے اندر بڑے پیمانے پر صنعت اور تجارت کا حق صرف حکومت کو دیا۔ اس کے علاوہ خارجی تجارت بھی بس حکومت کر سکتی ہے مگر چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور تجارتوں کے لئے لوگ آزاد ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اشتراکیت بڑی سرمایہ داری کو ختم کر کے چھوٹی سرمایہ داریوں کو باقی رکھتی ہے۔ اس ترمیم اور اصلاح کا اکیلا سبب یہ تھا کہ نظام مارکسی کا اصول انسانی فطرت سے ٹکرا گیا۔ شخصی ملکیت کے ختم کرنے کا انجام یہ ہوا کہ لوگ اپنے فرائض کے پورا کرنے میں پیچھے ہٹنے لگے۔ انھوں نے محنت اور تندہی سے کام کرنا چھوڑ دیا۔ مزدوروں نے خیال کیا کہ حکومت ہماری ضروریات زندگی پورا کرنے کی ذمہ دار ہو چکی ہے۔ ہم جتنی بھی محنت و مشقت کریں ہمیں کوئی مزید فائدہ نہیں ہو سکتا۔

اس صورت میں ہمیں جان کھپانے کی کیا ضرورت ہے ؟ جان دے کر کام کریں یا جان چرا کر دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے ۔

جس انسان کی نظر میں اخلاقی اور روحانی قدروں کی کوئی قیمت نہ ہو، جس کے دماغ میں خالص مادیت کے علاوہ کسی دوسری چیز کا تصور نہ ہو وہ دوسروں کے فائدہ کی خاطر اپنا خون پسینہ کیوں ایک کرے ؟

مارکسیت کے اقتصادی نظام میں دوسری ترمیم یہ ہوئی کہ مزدوروں کی اجرتوں میں فرق رکھا گیا تاکہ وہ دل لگا کر زیادہ کام کریں ۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بالکل وقتی اور عارضی فرق ہے ۔ سرمایہ داری کی پیدا کردہ ذہنیت بدلنے کے بعد یہ تفرقے ختم کر دیے جائیں گے ۔ بہت جلد وقت آئے گا کہ انسان بالکل نئے سانچے میں ڈھل جائے گا ۔

اپنا دل بہلانے کے لیے یہ خوش آیند توقعات بہت مناسب ہیں، لیکن عملی طور پر یہ ہو رہا ہے کہ نظام مارکسی کے حامی برابر اپنے اقتصادی اور اشتراکی اسلوب میں ترمیم کرتے چلے آرہے ہیں ۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ تبدیلیاں ملک اور قوم کو مارکسیت کے اصولوں سے قریب لا رہی ہوں، بلکہ ان کی رفتار دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دور سے دور تر لیے جا رہی ہیں ۔ مارکسیت کا جھنڈا اونچا کرنے والے سرمایہ داری کے بنیادی ستونوں کو نہیں ڈھا سکے ۔ سودی قرضوں کی لین دین حکومت نے ممنوع نہیں قرار دی، حالانکہ سرمایہ داری کے اقتصادی نظام میں تمام معاشرتی خرابیوں کی جڑ یہی ہے ۔

ایسا ہرگز تصور نہ کرنا چاہیئے کہ مارکسی رہنما کسی قسم کی کوتاہی کر رہے ہیں، مارکسی نظام کے جاری اور نافذ کرنے میں وہ پورے طور پر کوشاں نہیں ہیں یا اس کے صحیح ہونے میں انھیں شک ہو گیا ہے، ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے ۔ مارکسیت کے سربراہ اپنے عقائد اور نظریات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں مگر انسانی فطرت سے پوری قوت کے ساتھ ٹکراؤ ہو جاتا ہے ۔ اس کی مسلح فوجیں انقلاب کا راستہ روکے

سامنے کھڑی ملتی ہیں۔ اس زبردست ٹکر کی تاب نہ لاکر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے، پھر بھی آرزو یہی دل میں رہتی ہے کہ معاشرتی اصلاح کا یہ پرانا، فرسودہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے۔

مارکسیت کے سیاسی نظام میں حکومت کو دائمی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ جب انسان کے ذہن پر اجتماعی ذہنیت پورے طور سے چھا جائے گی، جب وہ اپنے ذاتی مفاد کے بجائے قوم کے اجتماعی مصالح اور مفادات کی بابت سوچنے لگے گا تو حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ نظام مارکسی میں حکومت بس اس وقت تک ہے جب تک انسان کی شخصی اور انفرادی ذہنیت بدلی نہیں ہے۔ جب تک طبقاتی تفریقیں بالکل ختم نہیں ہوئی ہیں، جب تک ملک میں سرمایہ دار اور مزدور دو الگ الگ طبقے موجود ہیں اس وقت تک حکومت کا حق مزدور طبقہ کو دیا گیا ہے۔ انتخابات اور الکشن جمہوری لائنوں پر ہوں گے۔ مگر ان کا دائرہ مزدوروں میں محدود رہے گا۔ عام لوگوں کو ان میں حصہ لینے کا حق نہیں ہے۔ یہ نظام حکومت محض اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ مزدوروں کے واجبی حقوق کا تحفظ ہو سکے، سرمایہ داری کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکے۔

نظام مارکسیت اور نظام سرمایہ داری کے درمیان امتیازی فرق یہ ہے کہ مارکسیت اور اشتراکیت کی بنیاد کھلم کھلا مادی فلسفے کے اوپر ہے۔ یہاں زندگی کا بالکل مادی تصور ہے۔ تمام روحانی امور کا صاف صاف انکار ہے۔ نیچر کی حدوں کے آگے نہ خالق کی ہستی ہے اور نہ اس دنیا کی محدود زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے۔ مارکسیت اور اشتراکیت انسانی زندگی کے مفہوم اور اس کے لیے کسی نظام زندگی کے تعین کے درمیان وابستگی کا اقرار کرتی ہے۔ اس کے نزدیک بغیر انسانی زندگی کو سمجھے ہوئے اس کے معاشی مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا۔

مارکسی نظام اپنی اس خصوصیت کی بنا پر اس کا حقدار ہے کہ اس کی بابت فلسفیانہ انداز سے گفتگو کی جائے۔ جن علمی ستونوں پر اس کی عمارت بلند ہوئی ہے ان کا جائزہ لیا جائے۔ کسی نظام کے صحیح یا غلط ہونے کا تعلق ان بنیادی مفاہیم اور نظریات کی صحت اور عدم صحت سے ہے جن کی روشنی میں اسے مرتب کیا گیا ہے۔ نظام مارکسی پر ایک ہلکی اور سرسری نگاہ بھی یہ بتا دیتی ہے کہ یہاں افراد اور اشخاص کو جماعتوں میں گم کر دیا گیا ہے۔ قومی مصلحتوں کے مقابل شخصی مصلحتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ نظام مارکسی کی رفتار سرمایہ دارانہ نظام کی بالکل مخالف سمت میں ہے۔ وہاں لوگوں کے خصوصی مفادات پر نظر ہے اور یہاں قوم کے اجتماعی فائدوں پر۔ ان دونوں نظاموں میں فرد اور قوم کو ایک دوسرے کا دشمن فرض کیا گیا ہے جن کے درمیان کسی نقطہ پر اتحاد اور صلح ممکن نہیں ہے۔ نظام سرمایہ داری نے فرد کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ نظام اور قانون کی تشکیل و تدوین میں اس کے ذاتی فائدوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس بیجا طرفداری نے پوری قوم کو زلزلہ خیز اقتصادی دشواریوں میں مبتلا کر دیا۔ نظام مارکسی نے قوم کو سارے حقوق دیدیے۔ اس کے نزدیک افراد اور اشخاص کسی احترام اور رعایت کی حقدار نہیں ہیں۔ ان کی تمام آزادیاں پامال ہوگئیں۔ ان کے قلم اور زبان تک پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ وہ اپنے افکار و تصورات کے پرچار کے لیے بھی آزاد نہیں ہیں۔

کمیونزم کی غلط اندیشیاں

یہ صحیح ہے کہ کمیونزم نے شخصی مالکیت کو بالکل ممنوع قرار دے کر سرمایہ داری کے پیدا کردہ بہت سے امراض کو دور کر دیا، لیکن بدقسمتی سے یہ علاج اور دوسری حیثیتوں سے انسانیت کے لیے بڑا مہنگا اور نقصان رساں ثابت ہوا۔ اس نے انسان کے قلب اور روح کے تقاضوں کو بڑا صدمہ پہونچایا۔ اس کے ہاتھ پیروں

کو جکڑ کر بالکل اپاہج اور مجبور بنا دیا۔ شخصی ملکیت کی جگہ جماعتی ملکیت نے لے کر انسان کی ساری آزادیوں کا سر کچل ڈالا۔ علم النفس کے ماہرین کے فیصلے کے مطابق یہ ہولناک زبردست معاشی تبدیلی انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ مادہ پرست انسان ہمیشہ اپنے شخصی مفاد کے بارے میں سوچتا اور ہر چیز اسی محدود انفرادی عینک سے دیکھتا ہے۔ کمیونزم ایک ایسا معاشی نظام ہے جس میں افراد کو جماعتوں کے اوپر بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ اس کے جاری اور نافذ کرنے کے لئے ایک زبردست اور دبنگ طاقت کی ضرورت ہے جس کے فولادی ہاتھوں میں باگ ڈور رہے۔ وہ اس نظام کی ہر مخالف آواز کو دبائے۔ اس کے مقابل اٹھنے والی ہر تحریک کو قوت سے کچلے۔ نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے تمام ذرائع اپنے قابو میں رکھے۔ عام افرادِ ملک کے لیے ایک مختصر دائرہ بنا دے جس سے باہر نکلنا جرم ہو۔ اگر کسی کے متعلق مخالفت کا کمزور سا شبہ بھی ہو تو سخت سے سخت سزا دینے میں پس و پیش نہ کرے، ورنہ ممکن ہے کہ اچانک زمام اقتدار اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ ظاہر ہے کہ جو نظام لوگوں کے فطری رجحانات کے خلاف، زبردستی ان پر لادا جائے گا وہ ایسی ہی باتوں کا تقاضہ اور مطالبہ کرے گا۔

بے شک اگر یہی مادہ پرست انسان سماجی مصلحتوں کی لائنوں پر سوچنے لگے، اگر اس کے تمام ذاتی رجحانات، شخصی میلانات، انفرادی محرکات دب جائیں تو آسانی سے اسے ایک ایسے نظام کا پابند بنایا جاسکتا ہے جس کی جہنمی بھٹی میں انسان کے شخصی مفادات کو پگھلا ڈالا گیا ہو۔

سوچیے کہ خالص مادہ پرست انسان جو دنیا کی اس محدود زندگی کے سوا کسی دوسری زندگی کا قائل نہیں ہے جس کی نظر میں ان مادی قوتوں کے علاوہ لذت کا کوئی اور مفہوم نہیں ہے، کیونکر ایک خالص جماعتی نظام کو بآسانی قبول کر سکتا ہے؟

مارکسیت کے حامی اس دن کے انتظار میں وقت کی گھڑیاں گن گن کر گذار رہے ہیں جب انسان اپنے شخصی رجحانات کی کیچلی اتار کر جماعتی تصورات کا چولا پہن کر دوبارہ پیدا ہوگا۔ یہ انتظار ان روشن دماغ مفکرین سے کتنا تعجب خیز ہے جو اخلاقی اور مذہبی اقدار کو ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتے بلکہ سرے سے ان کے حقیقی اور مستقل وجود ہی کے منکر ہیں ؟!

بہرحال جب تک انسان کی خود غرضانہ ذہنیت نئے سانچوں میں نہ ڈھلے اس وقت تک نظام مارکسی کا نافذ ہونا یہ چاہتا ہے کہ اس کی تحریر اور تقریر پر مکمل پابندی عائد کر دی جائے۔ ہمیشہ ایسا طبقہ برسر اقتدار رہنا چاہیے جو اس نظام کے صحیح ہونے پر ایمان رکھتا ہو۔ جو انسان کے موجودہ فطری اور نفسانی محرکات کو اپنی من مانی کارروائیوں کے لیے آزاد نہ چھوڑے۔

یہ صحیح ہے کہ اس نظام کے سایہ میں تمام لوگوں کی ضروریات زندگی اطمینان سے پوری ہو جائیں گی، لیکن زندگی کے اور دوسرے حقوق سے انھیں محروم کر دیا جائے گا۔ بہتر ہوتا کہ اس معاشی خوش حالی کے ساتھ انھیں آزادی کی کھلی فضا میں سانس لینے کا بھی موقع مل جاتا۔ انھیں اپنی شخصیت اور انفرادیت کو جماعت کے بھاڑ میں مجبوراً نہ جھونکنا پڑتا۔ انھیں ہاتھ پیر باندھ کر زبردستی قومی مصلحتوں کے تھپیڑے مارتے ہوئے سمندر میں نہ ڈبو دیا جاتا۔ بھلا وہ آدمی زندگی کے کسی شعبے میں کیا آزادی محسوس کر سکتا ہے جس کی معیشت اور گذر بسر ایک معین اور مخصوص جماعت کے ہاتھوں میں ہو؟ حالانکہ معاشی اور اقتصادی آزادی ہی تمام دوسری آزادیوں کا سنگ بنیاد ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لوگ زبردست اقتصادی بدحالی اور تباہ کن معاشی مشکلات میں مبتلا رہ کر تحریر اور تقریر کی آزادی لے کر کیا کریں گے؟ انھیں کھانے کے لیے

خوراک، پہننے کے لیے پوشاک، رہنے کے لیے گھر چاہیئے۔ قلم اور زبان کی آزادی کا بس یہ نتیجہ ہے کہ وہ حکومت پر سخت سے سخت نکتہ چینی اور اپنے خیالات کی تبلیغ اور اشاعت کر سکیں گے۔ اس سے انھیں کونسا بڑا فائدہ پہونچ جائے گا؟

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے روشن خیال کمیونسٹ طبقہ کی نظر بس سرمایہ داری پر ہے۔ وہ یہ گمان کر رہے ہیں کہ نظام مارکسی کے مقابل معاشی میدان میں صرف سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ انھوں نے اس حقیقت سے آنکھیں بند کر لی ہیں کہ ان دونوں سے مکمل اور ہمہ گیر ایک تیسرا نظام اسلام موجود ہے۔ کمیونسٹوں نے لوگوں کے شخصی حقوق کو قومی مفاد کے لیے خطرناک سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔ انصاف اور دانشمندی کا تقاضا تھا کہ حتی الامکان کسی انسانی حق کو ضائع نہ کیا جائے۔ انسان کے مادی حقوق کے علاوہ کچھ خالص غیر مادی حقوق بھی ہیں۔ کامیاب معاشی نظام وہ ہے جس میں ان دونوں کا لحاظ کیا جائے۔

کمیونزم، سرمایہ داری اور اسلام اپنے اپنے نظام کی روشنی میں انسان کے تین مختلف الشکل خاکے پیش کرتے ہیں۔ ایک وہ انسان جس کی تمام ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں سے دوسرے فائدے اٹھا رہے ہیں۔ اسے اپنے کام کا صحیح، منصفانہ معاوضہ نہیں ملتا۔ اس کی آمدنی ضروریات زندگی کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ وہ ایک غیر مطمئن، ناخوشگوار، محرومی اور مایوسی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اسی کے مقابل دوسرا انسان کھڑا ہوا ہے جس سے بات بات پر بازپرس ہو رہی ہے۔ ہر ہر منٹ پر دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ ہر وقت بغیر کسی پوچھ گچھ کے پھانسی، جلا وطنی اور جیل جانے کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ ہمہ وقت کے خوف و ہراس نے اس کی زندگی تلخ کر دی ہے۔ ان دونوں کے مقابل ایک تیسرا انسان تصور کے گوشۂ دکنار میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر معاشی اطمینان کی رونق ہے۔ اس کے دامن میں

انفرادی حقوق کی دولت ہے۔ اس کی فکر آزاد، اس کا قلم آزاد، زبان آزاد ہے۔
یہ ہے وہ خوش قسمت انسان جو اسلامی نظام کے سایہ میں زندگی بسر کر رہا ہے۔

حقیقی سرچشمہ تلاش کیجئے

یہ بات بڑی مایوس کن ہے کہ نظام مارکسی انسان کے ان شخصی حقوق کا بری طرح گلا گھوٹنے کے بعد بھی اس کی معاشی مشکلات کو پورے طور پر حل نہیں کر سکا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نظام کی پشت پر بلند ترین انسانی احساسات اور جذبات کارفرما ہیں جنھیں سرمایہ داری کی عام تباہ کاریوں نے ابھارا ہے۔ انہی احساسات کی تحریک سے بعض مفکرین نے معاشی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی، لیکن افسوس انھوں نے مرض کی تشخیص میں غلطی کی، وہ صحیح اسباب مرض نہیں معلوم کر سکے۔ لہذا علاج میں کامیاب نہیں ہوئے۔

سرمایہ داری کی تباہ کاریوں کا سرچشمہ شخصی ملکیت نہیں ہے۔ دنیا کے امن و امان، انسان کی خوش حالی اور راحت و آسائش کو شخصی ملکیت نے نہیں لوٹا ہے۔ لاکھوں مزدوروں کو شخصی ملکیت نے بیکار اور بے روزگار نہیں بنایا ہے۔ صنعتی انقلاب کے موقع پر ہزاروں چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کو جدید صنعتی آلات سے کام لے کر شخصی ملکیت نے تباہ نہیں کیا ہے۔ مزدوروں کی اجرتوں میں ناانصافی، ان کی محنتوں اور مشقتوں کی ناقدری انفرادی ملکیت نے نہیں کی ہے۔ ہمیں پتہ ہے کہ سرمایہ دار بازار کا بھاؤ نہ گرنے کی غرض سے اپنے کارخانوں کی تیار کی ہوئی چیزوں کا بڑا حصہ تلف کر دیتے ہیں۔ وہ بلا محنت و مشقت کے سودی قرضوں کے ذریعہ اپنی دولت بڑھاتے اور بیدردی سے ضرورتمند قرضداروں کا خون چوستے ہیں۔ سرمایہ دار ضرورت کی تمام چیزوں کو بازار سے خرید کر اپنے پاس اکٹھا کر لیتے اور قیمتیں چڑھا کر فروخت کرتے ہیں، وہ اپنے جذبۂ حرص و ہوس کی تحریک سے زیادہ مال تیار کرتے اور ملک کے اندر اس کی کھپت

نہ ہونے پر انھیں دوسرے ملکوں میں نئے بازاروں کی فکر ہوتی ہے۔ یہ تمام حقیقتیں ناقابل انکار ہیں، لیکن ان کا سبب شخصی ملکیت نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ظالم کسی مظلوم کا گلا چھری سے کاٹتا ہے مگر قانون مجرم چھری کو نہیں قرار دیتا، مستوجب سزا وہی سنگدل ظالم سمجھا جاتا ہے۔

یہ تمام ہولناک، تباہ کن مصیبتیں انفرادی ملکیت کی لائی ہوئی نہیں ہیں۔ ان کی پیدائش اس مادی اور خالص مادی مصلحت کے پیٹ سے ہوئی ہے جسے سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کی زندگی کا مقصد قرار دیا ہے۔ اس کی نظر میں ہر قسم کے اقدامات اور تصرفات کے جواز کا معیار مادی مصلحت اور فائدہ ہے۔ جس معاشرے کی عمارت مادی فائدوں کی بنیاد پر بلند ہوئی ہو اس میں انہی نتائج کی توقع ہے۔ یہ ناانصافیاں اور بربادیاں صرف مادی فائدوں پر نظر سے پیدا ہوئی ہیں، شخصی ملکیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انسان کی تمدنی اور سیاسی مشکلات کا حل اسی وقت نکل سکتا ہے جب اس کے اقدام اور عمل کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار بدل دیا جائے۔ مادیات کی چہار دیواری سے باہر انسانی فطرت کے مطابق ایک جدید مقصد معین کرنے کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری نے جس خیال کی بنیاد پر مادی مصلحت کو معیار اور زندگی کا حقیقی مقصد قرار دیا ہے وہی تمام معاشرتی اور اقتصادی مصیبتوں کی جڑ ہے۔ اسی نے سرمایہ داری کو انسان کے خوش حال اور مطمئن بنانے میں ناکامیاب کیا ہے۔ اس خیال اور تصور کے ذہن انسانی سے نکال کر دور پھینک دینے کے بعد قوم کے حق اور اس کی آزادی کا تحفظ ہوجائے گا۔ پھر شخصی ملکیت، ایک تمدنی اور اقتصادی لعنت کے بجائے انسان کے فلاح و بہبود کا ذریعہ اور صنعتی، تجارتی میدانوں میں اس کی ترقی کا ذریعہ بن جائے گی۔

سرمایہ داری کے اس زبردست قلعہ کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ انسانی زندگی ایک محدود مادی چیز ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہر شخص اسی مادی اور دنیوی زندگی کو اپنی دوادوش کا اکیلا میدان سمجھے گا۔ جب اس کا مقصد یہ ہوگا کہ میں اپنے تمام اقدامات اور تصرفات کے لیے مکمل آزادی کا حقدار ہوں، جب وہ اس بات کا یقین رکھے گا کہ میری زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ مادی لذتوں کا سامان مہیا کرنا ہے، جب ان خالص مادی خیالات پر انسان کے جذبۂ حب نفس کا اضافہ ہو جائے گا تو وہ بعینہٖ انہی راہوں پر بڑھے گا جن پر سرمایہ دار چل چکے ہیں۔ وہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے وہی وسائل اختیار کرے گا جو سرمایہ داروں نے اختیار کیئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی جابر اور زبردست طاقت اس کو ان آزادیوں سے محروم رکھے اور کسی مخصوص لائحۂ عمل کا زبردستی پابند بنا دے۔

جذبۂ حب نفس کیا کہتا ہے؟

حب نفس کے جذبے سے زیادہ ہمہ گیر، قدیم اور طاقتور کوئی دوسرا فطری جذبہ موجود نہیں ہے۔ تمام دوسرے جذبات اسی کی پھیلی ہوئی مختلف شاخیں ہیں۔ حب نفس سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے لیے راحت و آسائش کو پسند کرتا اور زحمت و تکلیف کو ناپسند کرتا ہے۔ یہی حب نفس اس کو روزی کمانے اور غذائی مادی ضروریات کی فراہمی پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی حب نفس کے اشارے سے انسان کبھی خودکشی کر ڈالتا ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اس کی نظر میں موت کی تکلیف سہہ لینا آسان اور آلام زندگی کا برداشت کرنا دشوار ہوتا ہے۔

اس وضاحت سے پتہ چلا کہ تمام انسانی افکار و اعمال کا حقیقی محرک حب نفس ہے جس کی تعبیر حب لذت اور بغض الم سے بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان دوسروں کو خوش حال اور مطمئن بنانے کی خاطر خود محنت و مشقت کی تلخیوں سے اپنا منہ

بدمزہ کرے۔ ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے جب اس کی انسانیت کو اس سے چھین لیا جائے، جب اس کی فطرت، اس کی افتادِ طبع کو منقلب کر دیا جائے۔ اس کو ایسا بنا دیا جائے کہ وہ نہ شخصی لذت پسند کرے اور نہ ذاتی تکلیف ناپسند کرے۔

انصاف کیجئے کہ جب حبّ نفس اور حبّ لذّت کو انسان کی نظر میں پوری پوری اہمیت حاصل ہے، جبکہ وہ اپنی ذات کو ایک خالص محدود مادی چیز سمجھتا ہے، جبکہ لذّت ان فائدوں اور مسرتوں کا نام ہے جنھیں مادہ مہیّا کرتا ہے تو کیا فطری طور پر انسان یہ نہیں سوچے گا کہ میری جدوجہد اور کدوکاوش کا میدان یہی محدود دنیا ہے؟ میرا مقصد زندگی یہیں کی مادی لذتوں سے لطف اندوز ہونا ہے؟ صاف بات ہے کہ اس مقصد تک پہونچنے کا صرف ایک راستہ ہے، وہ یہ کہ آدمی کے پاس زیادہ سے زیادہ دولت ہو۔ روپیہ انسان کے سامنے تمام خواہشوں کے پورا کرنے اور تمام لذتوں کے حاصل کرنے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

زندگی کے مادی تصورات کی یہی زنجیر ہے جو انسان کے ہاتھ پیر باندھ کر سرمایہ دارانہ ذہنیت اور اس کے افعال کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ کتنا طفلانہ خیال ہے کہ اس مادی ذہنیت کو باقی رکھتے ہوئے محض شخصی ملکیت کے ختم کر دینے سے تمام مشکلات زندگی حل ہوجائیں گی۔ آخر جو بیماریاں انہی مادی خیالات نے پیدا کی ہیں انھیں انفرادی ملکیت کا ممنوع قرار دینا کیونکر دور کر دے گا؟

آخر اس کی ضمانت کیا ہے؟

اچھا ہم مانے لیتے ہیں کہ ساری تباہیاں اور خرابیاں شخصی ملکیت کی پیدا کردہ ہیں۔ نظام مارکسی نے دنیا کے سامنے معاشی اور اقتصادی مشکلات کا حل پیش کر دیا ہے لیکن عوام میں خوش حالی، ملک میں امن وامان محض کاغذ پر نظام مارکسی لکھے رہنے سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس کے لیے اس کے مکمل طور سے جاری اور نافذ کرنے کی

ضرورت ہے۔ فرمائیے کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ ذمہ داران حکومت عملی طور پر اپنے معینہ تجویز کردہ مقاصد سے دستبردار نہیں ہوں گے؟ جبکہ ان لوگوں کے ذہن میں بھی زندگی کے وہی خالص مادی تصورات راسخ ہیں جبکہ حبّ نفس کے فطری جذبہ سے ان کے قلب و دماغ بھی خالی نہیں ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے معاشی اور اقتصادی لائحۂ عمل سے منحرف ہو جائیں۔ روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ اکثر اپنی انفرادی مصلحت اور جماعتی مصلحت میں تصادم ہو جاتا ہے۔ ایسے مواقع بکثرت سامنے آتے ہیں کہ دوسروں کا فائدہ اپنے خسارے میں رہنے کا سبب بن جاتا ہے اس طرح کے نازک اور خطرناک آزمائشی لمحوں میں قومی حقوق اور نظام و قانون کے لیے حکام وقت سے کیا توقع کی جاسکتی ہے؟ ذاتی مفاد صرف شخصی ملکیت کے دائرے میں محدود نہیں ہے تاکہ اسے ختم کر کے ان خطروں کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کمیونزم کے موجودہ لیڈر برابر سابق حکام کی غداریوں کا انکشاف کیا کرتے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مسلک اور مذہب سے کیا کیا غداریاں کیں؟!

وہ دولت و ثروت جس پر نظام سرمایہ داری نے سرمایہ داروں کو مسلط کر دیا تھا شخصی ملکیت ختم ہونے کے بعد حکومت کے ہاتھ میں آجائے گی۔ بدقسمتی سے یہ حکومت انہی افراد پر مشتمل ہے جن کے دماغ میں بھی خالص مادی ذہنیت بھری ہوئی ہے۔ یہ مادی ذہنیت حبّ نفس کی تحریک سے انھیں آمادہ کرتی ہے کہ وہ شخصی مصلحتوں کو قومی مصلحتوں پر مقدم کریں۔ حبّ نفس کا فطری جذبہ انکار کرتا ہے کہ انسان بلا کسی معاوضہ کے اپنی شخصی مصلحتوں کا لحاظ نہ کرے۔ زندگی کے مادی تصورات کی روشنی میں جب تک شخصی مفاد انسان کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے یہ قومی دشواریاں، سیاسی کشمکشیں، اقتصادی پریشان حالیاں ہرگز دور نہیں ہو سکتیں۔

انسانیت کی ان تمام پریشانیوں اور تباہیوں کا سرچشمہ مادی تصورات ہیں۔ بغیر انسانی ذہنیت کو منقلب کیے ہوئے ان شخصی چھوٹی اور بڑی سرمایہ داریوں کو توڑ کر ایک بہت بڑے سرمایے کی شکل میں تبدیل کرکے حکومت کو اس کا متولی بنا دینے سے انسان کو مکمل اطمینان نصیب نہیں ہوسکتا۔ اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ تمام باشندگان ملک ایک بہت بڑے کارخانے کے مزدور ہیں جن کی معاشی اور سیاسی زندگی اس کارخانے کے ذمہ داروں کے رحم وکرم پر ہے۔ ہاں اس کارخانے اور سرمایہ داری کے کارخانوں میں ایک فرق ضرور ہے۔ وہاں کارخانہ دار منافع کے خصوصی مالک تھے، جس طرح چاہتے ان منافع کو اپنے صرف میں لاتے تھے۔ کمیونزم کے زیر سرپرستی قائم شدہ کارخانہ کے چلانے والے اصولاً ایک پائی کے مالک نہیں ہیں، لیکن شخصی طور سے فائدہ اٹھانے کے تمام میدان ان کے قدموں کے نیچے ہیں۔ پھر مادہ پرستی نے اس کام کو سند جواز بھی دیدی ہے۔

پھر صحیح راستہ کونسا ہے؟

دنیا کے سامنے انسانی مشکلات کو دور کرنے کے دو راستے ہیں: ایک یہ کہ انسانی فطرت اور افتاد طبع کو بالکل بدل دیا جائے۔ اس کے واسطے ایک نیا مزاج ڈھالا جائے کہ انسان جماعتی مفادات کی خاطر اپنی محدود مادی زندگی کی مصلحتوں کو ہنسی خوشی نظرانداز کر دے۔ وہ اس بات کا یقین رکھے کہ اس دنیا کے علاوہ دوسرا کوئی عالم نہیں ہے۔ یہاں کے فائدے کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہے، مگر پھر بھی اپنی جان قومی مفاد پر قربان کر دے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب اس کی ذات سے حب نفس کو نکال کر حب جماعت اور حب قوم رکھ دیا جائے، وہ اپنے سے اس لیے محبت کرے کہ وہ قوم کی ایک فرد ہے، اسے اپنی خوش حالی پر نظر کرکے اس لیے لطف محسوس ہو کہ یہ اجتماعی فارغ البالی کا ایک ٹکڑا ہے۔ یقیناً اس کے بعد انسان جماعتی محبت کے

اشاروں سے ملکی اور قومی مفادات کے لیے بسرو چشم کوشش کرے گا۔ شخصی اور اجتماعی مصلحتوں کا ٹکراؤ ختم ہو جائے گا۔

دوسرا راستہ جس پر چلنے سے انسانیت کے موجودہ اور آیندہ تمام مشکلات دور ہو سکتے ہیں یہ ہے کہ انسان کے ذہن سے زندگی کا تصور نکال دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسی کے ساتھ ساتھ فوراً اس کے مقاصد زندگی بھی بدل جائیں گے۔ اس کے واسطے انسان کی فطرت میں کسی انقلاب کے لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف مضبوط دلائل کی مدد سے اسے یقین دلا دینے کی ضرورت ہے کہ زندگی کا مادی تصور صحیح نہیں ہے۔

پہلے راستے کی بابت کمیونسٹوں کی پیشین گوئی ہے کہ مستقبل میں انسان خوشی سے اسی کو اختیار کرے گا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انسان کے جذبات اور احساسات کو وہ اس طرح بدل دیں گے کہ وہ ایک مشین کے مانند ملک اور قوم کی خدمت میں حرکت کرے گا۔ بے شک اس زبردست تبدیلی کے بروئے کار آنے کے لیے ضروری ہے کہ سارے عالم کی قیادت اسی طرح بے چون وچرا ان کے سپرد کر دی جائے جس طرح ایک مریض اپنے کو کسی تجربہ کار ڈاکٹر کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ جو دوا ہیں چاہے استعمال کرائے۔ جن اعضاء کو چاہے قطع وبرید کرے، کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس قومی آپریشن کی مدت کتنی طولانی ہوگی، مریض انسانیت کو کب مکمل شفا نصیب ہوگی!

دوسرا راستہ وہ ہے جو اسلام نے انسان کے لیے تجویز کیا ہے، اس نے انفرادی ملکیت کو اپنے قانون میں ممنوع نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس نے زندگی کے مادی تصور کے خلاف قدم اٹھایا ہے۔ اس نے زندگی کا ایک روحانی تصور دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کے معاشرتی نظام کی پوری عمارت زندگی کے اسی حقیقی مفہوم کی بنیاد پر بلند ہوئی ہے۔ اسلام نے نہ فرد کو جماعت پر بھینٹ چڑھایا ہے اور نہ قوم کو فرد پر۔

ہر ایک کے لیے مخصوص حقوق کی حد بندی کردی ہے، اس نے انسان کے مادی اور روحانی دونوں طرح کے مطالبات کا لحاظ رکھا ہے۔ اسلام کی نگاہ معاشرتی بیماریوں کے حقیقی اسباب پر ہے۔ اس نے ان اسباب کی اس طرح بیخ کنی کی جو انسانی فطرت کے ساتھ سازگار ہے۔ ان طرح طرح کی بد بختیوں اور رنگ برنگ مصیبتوں کا مرکزی نقطہ زندگی کا مادی نظریہ تھا۔ اس کی تعبیر مختصر لفظوں میں یہ ہے:

"حیات انسانی کو اسی دنیا میں محدود سمجھ لینا، اپنے ہر اقدام اور عمل کا مقصد اپنی ذاتی مصلحت کو قرار دینا۔"

اسلام نے اسی نظریہ کے غلط ثابت کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کی۔ یقیناً نظام سرمایہ داری اسلام کے نزدیک ناقص اور ناکام ہے، وہ بھی اس کے فنا ہونے کا یقین رکھتا ہے، لیکن اس کے وہ اسباب نہیں ہیں جنھیں کمیونزم نے پیش کیا ہے۔ اسلام اس کا قائل نہیں ہے کہ سرمایہ داری اور شخصی ملکیت میں خود باقی اور فنا ہونے کے دو متضاد سبب موجود ہیں جو برابر مصروف جنگ رہتے ہیں۔ اسلام کی نظر میں نظام سرمایہ داری کی ناکامی ان خالص مادی رجحانات کی وجہ سے جو اس کی ترتیب اور تدوین میں از خود کارفرما ہیں۔

گذشتہ توضیحات نے بتایا کہ انسان کے دل و دماغ میں غیر مادی ذہنیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ معاشرتی نظام کی تشکیل اسی کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ دنیا کے تمام مسائل کو اسی نقطۂ نظر سے حل ہونا چاہیئے۔ مادی ذہنیت کے ختم ہوجانے کے بعد انسان ایک روحانی اور نورانی، امن و امان سے لبریز ماحول میں زندگی بسر کرسکے گا۔

اسلام کا بنیادی مقصد انسان کی نظر کو بلندی اور وسعت دینا ہے۔ اس کے سماجی نظام کا خاکہ حیات و کائنات کی بابت جدید تصورات نے بنایا ہے۔

اس نے انسان کے دل و دماغ میں اس بات کو راسخ کیا ہے کہ اس کی زندگی ایک بالاتر، قادر و مختار طاقت کے ارادے کا نتیجہ ہے۔ یہ زندگی ایک دوسرے باقی اور ابدی عالم تک پہونچنے کا راستہ ہے۔ اسلام نے انسان کے تمام عقائد اور اعمال کا ایک نیا معیار مقرر کیا ہے، وہ انوکھا معیار اس کے خالق کی مرضی ہے۔ اسلام شخصی مصلحتوں کی تمام مانگوں کو جائز نہیں سمجھتا، ہر مادی لذت اس کی نظر میں مباح نہیں ہے۔ یونہی ہر دنیوی ذاتی نقصان کے برداشت کرنے کو وہ حرام نہیں قرار دیتا ہے۔ اسلام نے انسان کا مقصد زندگی رضائے الٰہی کو معین کیا ہے۔ انسان کے اعمال اور عبادات کی اخلاقی میزان یہ ہے کہ انھوں نے خدا کی رضا کا کتنا حصہ پایا۔ سلیم الفطرت انسان وہ ہے جو اس پاکیزہ مقصد تک پہونچنے کی کوشش کرے۔ صحیح مسلمان وہ شخص ہے جو اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اسی مقصد کے مطابق رفتار اور رویہ اختیار کرے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے اخلاقی اور کائناتی تصورات کی تبدیلی اس کی فطرت میں کسی انقلاب کے لانے کی طلبگار نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ انسان از سر نو دوبارہ پیدا ہو۔ اپنی ذات سے محبت اور اس کی خصوصی خواہشوں کے پورا کرنے کی کوشش انسانی فطرت کا تقاضا ہے، کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ تجربہ اور آزمائش کے حلقہ بگوش حب نفس کے جذبۂ فطری ہونے کا انکار کرتے ہیں! حالانکہ ایسا مکمل اور طویل تجربہ کسی دوسری چیز کے لیے موجود نہیں ہے۔ کروڑ ہا سال پرانی انسانی زندگی کی تاریخ حبّ نفس کے فطری جذبہ ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ اگر حبّ نفس کا جذبہ فطری نہ ہوتا تو وہ غیر متمدن، غیر مہذب، سادہ لوح پہلا انسان طرح طرح کے خطروں کو اپنے سے دور کرنے کی ہرگز کوشش نہ کرتا۔ اسے اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کے پورا کرنے کی ہرگز فکر نہ ہوتی۔ انسانی فطرت میں حبّ نفس کا درجہ جب اتنا اہم ہے

توسماجی دشواریوں کا صحیح اور کامیاب حل وہی ہوگا جو اس حقیقت کو مانتے ہوئے تشکیل پائے جس نظام کی بنیاد اس جذبہ کو منقلب اور تبدیل کرنے پر موجودہ عملی طریقے کبھی وقت کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔ وہ کمیونسٹ حضرات کے دل میں ایک خوش آیند تمنا اور دماغ میں ایک تصور بن کے رہے گا۔

اسلام کا حکیمانہ پیغام

اسلام اپنے کاندھوں پر جو عظیم بوجھ لے کر اٹھا ہے اس کی طاقت اسلام کے علاوہ کسی میں نہیں ہے۔ اس کے دانشمندانہ اغراض و مقاصد اسی کے کھینچے ہوئے خطوط پر چلنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسلام نے اپنے بنائے ہوئے اخلاقی معیار اور حب نفس کے فطری جذبہ کے درمیان ارتباط قائم کیا۔ حب نفس انسان کے خیالات اور افعال کی فطری ترازو ہے، لیکن اسلام کے نزدیک تمام انسان کے افکار و اعمال کا محور خدا کی مرضی کو ہونا چاہیئے۔ اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے الگ الگ دو معیاروں کو سمو دیا۔ ان کی دوئی کو مٹا کر ان کے درمیان وحدت پیدا کر دی۔ اسلام کی یہ عظیم کارگزاری ہمہ گیر عدل و انصاف، عمومی سکون و اطمینان کے وجود میں لانے کی ذمہ دار ہے۔

حب نفس کے جذبۂ فطری کا مطالبہ ہے کہ انسان اپنی شخصی منفعت کا لحاظ کرے۔ اسلام کا اخلاقی معیار طلبگار ہے کہ قوم اور افراد قوم کے مطالبوں کے درمیان اعتدال و توازن رہنا چاہیئے۔ ان دونوں مطالبوں میں کیونکر اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے؟ ان دونوں معیاروں کو کس طرح ایک دوسرے میں سمو دیا جائے؟

یہ صحیح ہے کہ اس امتزاج کے بعد انسان کی وہ شخصیت پرستی جو کرہ ارض سے طرح طرح کے مصائب اور مظالم کی ذمہ دار رہی ہے ملک و قوم کی خیر خواہی اور بہبودی کا سبب بن جائے گی، لیکن یہ مرحلہ سر کیونکر ہو؟ اسلام نے اس مرحلے کو جس دانشمندی اور حکیمانہ انداز سے طے کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔

اس نے زندگی کے حقیقی مفہوم کو ذہن انسانی میں پیوست کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ یہ دنیوی زندگی ایک دوسری جاودانی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ انسان اپنی اس محدود زندگی میں مرضی خدا کے مطابق چلنے کی جتنی کوشش کرے گا اسی کے تناسب سے اس حیات اخروی میں اسے راحت و اطمینان نصیب ہوگا۔ تصورِ آخرت جہاں بلند ترین قومی، ملکی، مذہبی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے وہاں شخصی فائدوں کے پورا ہونے کا بھی وسیلہ ہے۔ اسلام انسان کو سمجھاتا اور نصیحت کرتا ہے کہ وہ جماعتی سود و بہبود کے لیے پوری کوشش کرے۔ وہ ہر معاملے میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھے۔ ان سماجی اور اجتماعی خدمات سے اس کو براہ راست شخصی فائدہ بھی پہونچے گا۔ اس کی ہر خدمت کا کئی گنا معاوضہ اسے عالمِ آخرت میں دیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ اگر وہ قومی، ملکی اور مذہبی مصلحت کے بجائے اپنی دنیوی اور ذاتی مصلحت کا لحاظ کرے تو نسبتاً اسے زیادہ فائدہ پہونچ جائے، لیکن یہ فائدہ اخروی فائدے کے مقابلہ میں نہیں آسکتا، کیونکہ نہ محض یہ کہ وہ مقدار میں کئی گنا زیادہ ہے، بلکہ یہ عارضی اور فانی ہے، مگر وہ باقی اور جاودانی۔

اسلام نے ابدی زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے بعد جماعت کا مسئلہ فرد کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ یہ اتحاد و اتفاق اور وحدت و یگانگی زندگی کے مادی تصورات کی سرپرستی میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی۔ مادی ذہنیت انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ مفاد پر نظر رکھے۔ اس کے برخلاف اسلام نے زندگی کے جس تصور سے دنیا کو روشناس کیا ہے اس نے انسان کی نگاہ میں وسعت پیدا کر دی۔ اسلام انسان کو نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنے مفادات کے پھیلاؤ پر ذرا گہری نگاہ ڈالے۔ اس کی باریک بینی اور دور اندیشی فیصلہ کرے گی کہ دنیا کے عارضی خسارے میں اس کا حقیقی فائدہ اور یہاں کے عارضی فوائد

میں دائمی نقصانات ہیں۔

ملکی، قومی اور معاشرتی مصلحتوں کے تحفظ کے اس اسلوب میں یقیناً ان افراد پر نظر ہے جو ہر کام اپنے ذاتی مفاد کی خاطر انجام دیتے ہیں۔ بلاشبہ اس ذہنیت کے اشخاص اکثریت میں ہیں لیکن اس کے علاوہ اسلام نے اخلاقی تربیت کا بھی اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا ہے۔ اسلام نے چاہا ہے کہ انسان کے دل میں خیر مطلق کی محبت پیدا کر دے۔ کوئی شک نہیں کہ محبت اور نفرت کے جذبے انسان کی فطرت میں از خود موجود ہیں۔ اخلاقی تربیت کا کام انہی جذبات کو صحیح راستے پر لگا دینا ہے۔

خیرِ مطلق کی محبت انسان میں بلند ترین اوصاف پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ وہ اس کے لیے تمام اخلاقی اقدار کو محبوب بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ان صفات کو عملی جامہ پہنانے کی راہ میں خود اس کی جو ذاتی مصلحتیں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں وہ انھیں نہایت جرأت مندانہ طریقے سے ڈھکیل دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حبّ نفس کا جذبہ انسان کے صفحۂ فطرت سے مٹا دیا گیا۔ ہوا یہ کہ اسلام کی اعلیٰ تربیت نے حسن اخلاق کو انسان کی محبتوں کا مرکز بنا دیا۔ یقیناً محبوب کی فرمائشوں کی تعمیل میں ہر شخص لذت محسوس کرتا ہے۔ خود حبّ نفس کا جذبہ شدّت سے مطالبہ کرتا ہے کہ انسان اپنے محبوب کے اخلاقی اقدار کے تقاضوں کو پورا کرے، فلسفۂ مارکسی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ قومی مصلحتوں کے لحاظ کرنے کو وہ انسان کا محبوب بنا دے۔ وہاں جب اخلاقی اقدار ہی کا کوئی درجہ نہیں ہے تو اخلاقی تربیت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ مارکسیت جب دنیا کی کسی چیز کو ثابت قدم، ابدی اور مستقل نہیں مانتی ہے تو حبّ نفس کے جذبے کو کیوں ناقابلِ تغیّر و تبدّل سمجھنے لگی؟!

معاشرتی تعمیر اور اصلاح کا یہ وہ حکیمانہ طریقہ ہے جو قومی اور شخصی مصلحتوں کے درمیان اتحاد اور یگانگی پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اسلام نے انسان کے ذہن کو ابدی زندگی کے تصور سے آشنا بنا کر اسے ہدایت کی کہ وہ اخروی عوض کی امید پر ہر قسم کے ظلم، حق تلفی اور ناانصافی کو برداشت کرتا رہے۔ اس تصور کو انسانی دل و دماغ میں پیوست کرنے کا مقصد محض اس کے کاموں میں انضباط اور توازن قائم کرنا ہے۔

نظام اسلامی کا بنیادی امتیاز ابدی زندگی کا تصور اور اخلاقی تربیت کا مخصوص بندوبست ہے۔ اس نظام کی نظر فرد اور قوم دونوں کے اوپر ہے۔ اسلام ان کے حقوق کا اعتراف کرتے ہوئے ان میں اعتدال اور توازن پیدا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نہ فرد کو قانون سازی اور حکام کے تقرر کا حق ہے اور نہ جماعت کو۔ دونوں اپنے خالق کے بنائے ہوئے قانون کے پیرو اور اس کے انتخاب کردہ حکام کے فرماں بردار ہیں۔

ہر وہ معاشی نظام جس کی تشکیل زندگی کے ابدی تصور اور انسان کی اعلیٰ اخلاقی تربیت کو نظر انداز کر کے ہوگی وہ ہمیشہ مشکلات عالم کے حل کرنے میں ناکامیاب ہوگا۔ وہ کبھی لوگوں کے ذاتی جذبات کا ساتھ دے کر جماعت کے حقوق کو پامال کر دے گا اور کبھی جماعت کے مفادات کے تحفظ کے لیے لوگوں کی فطرت کا گلا گھونٹ دے گا۔ ان کے ساتھ ناانصافی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس نظام اور ان کے جذبات کے درمیان مسلسل کشمکش رہے گی۔ یہی نہیں بلکہ خود معاشرتی نظام کا وجود ہر وقت خطرے میں رہے گا کہ کہیں اس کے چلانے والے ہی اسے منقلب نہ کر دیں، کیونکہ فطری جذبات سے ان کے دل و دماغ بھی خالی نہیں ہیں۔ پھر خوش قسمتی سے ان کی من مانی کارروائیوں کے واسطے میدان بالکل خالی ہے۔ ان کی حرف گیری اور نکتہ چینی کے لیے کوئی موجود نہیں ہے۔ نظام مارکسی نے انہیں کل وجز کا اختیار دیدیا ہے۔ کسی کو چون و چرا کرنے کا حق نہیں ہے۔

زندگی کا مادی تصور پیش کرکے، انسان کو تمام اخلاقی حدود سے نکال کے، روحانی اقدار، مادی مصلحتوں اور اقتصادی ماحول کی پیداوار قرار دے کے انسانیت کے سکون واطمینان کی آرزو بڑی نادانی ہے۔

ابدی زندگی کا تصور انسان کے ذہن نشین کرنا اور اخلاقیات کے تقاضوں کا اسے پابند بنانا کوئی غیر ممکن کام نہیں ہے۔ انسانی تاریخ کا فیصلہ ہے کہ تمام مذاہب و ادیان اپنے بے شمار اختلافات کے باوجود اخلاقیات کے نقطہ پر متفق ہوکر اس سلسلے میں متحدہ کوشش کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ وہ کسی مرتب لائحۂ عمل اور طے کردہ منصوبے کے ماتحت نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں جو اخلاقی احساسات اور بلند انسانی اوصاف دکھائی دے رہے ہیں وہ انہی ادیان و مذاہب کی زبردست کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

انسانیت جب فہم وفراست کے مخصوص درجہ پر پہونچ گئی تو اسلام نے اسے اپنا پیغام سنایا۔ قومی اور ذاتی فلاح وبہبود کے پیش نظر اس نے وجودِ خدا، اس کے علم واقتدار، عقیدۂ آخرت اور اخلاقیات پر بڑا زور دیا۔ جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے پیغمبر اسلامؐ نے اپنی رسالت کا مقصد اخلاقی اصلاح کو بنادیا۔ انسان کے ارادے کی امتیازی خصوصیت کو محفوظ رکھتے ہوئے معاشی اور اقتصادی مشکلات کے حل کرنے کا یہی ایک اور صرف ایک راستہ تھا۔

اسلام میں معاشرتی اخلاق پر زور

دنیا اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ معاشرتی اخلاق کی تربیت بیسویں صدی کی سوغات ہے، حالانکہ چودہ سو برس پہلے اسلام نے اس سلسلے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے، گھریلو زندگی سے لے کر ملکی اور قومی بلکہ بین الاقوامی زندگی تک ہر چیز کے بارے میں واضح راہنمائی کی ہے۔

- اسلام نے اپنے ماننے والوں کو ہدایت کی کہ تم سب آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہو، کیونکہ تمھاری خلقت ایک باپ اور ایک ماں سے ہوئی ہے۔ تمہیں بھائیوں کی مانند ایک دوسرے کے معاملات کی اصلاح کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے۔
- تمام صاحبانِ ایمان ایک گھرانے کے افراد کے مانند ہیں، بوڑھے باپ کے مثل، جوان بھائی کے مثل، بچے اولاد کی مثل ہیں۔
- ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ جو اپنے لیے پسند کرے وہی دوسروں کے لیے پسند کرے اور جو اپنے واسطے ناپسند کرے وہی دوسروں کے واسطے ناپسند کرے۔
- اسلام چاہتا ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمانوں کے معاملات سے پوری پوری دلچسپی لے، ان کے درد دکھ میں شریک رہے، تمام اہل اسلام کو باہمی ہمدردی اور خیر خواہی کے لحاظ سے ایک جسم کے اعضاء کے مانند ہونا چاہیئے، اگر کسی کو کوئی پریشانی ہو تو سب بے چین رہیں۔
- اسلام نے عام اعلان کر دیا کہ خدا اس شخص کو بہت پسند کرتا ہے جس کی وجہ سے خدا کے بندوں کو زیادہ فائدہ پہونچے۔
- اسلام کے نزدیک خدا پر ایمان اور لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے بہتر کوئی دوسری صفت نہیں ہے، یونہی وہ شرک اور لوگوں کی ضرر رسانی کو سب سے پست اور ذلیل خصلت قرار دیتا ہے۔
- اسلام اخوت ایمانی کا تقاضہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کریں، جو شخص مسلمانوں کے قومی کاموں سے کوئی سروکار نہ رکھے وہ مسلمان نہیں ہے۔
- اسلام نے صاف لفظوں میں متنبہ کر دیا کہ جو شخص اپنے برادر مومن کو نقصان پہونچانے کی نیت کرے خدا اس کے اعمال خیر کو قبول نہیں کرے گا۔

- اس نے انکشاف کیا کہ غریب، ضرورت مند سوال کرنے والا خدا کا فرستادہ ہے جس نے اس سے ہاتھ روکا اس نے اللہ سے ہاتھ روکا اور جس نے اسے کچھ دیا اس نے خدا کو دیا۔
- اسلام نے بتایا کہ خدا نے مالداروں کے مال میں فقیروں کا حصہ قرار دیا ہے، اگر کوئی بھوکا رہتا ہے تو اس لیے کہ مالداروں نے اس کا حصہ غصب کر رکھا ہے۔
- خدا نے مالداروں کو دولت، غریبوں کی فائدہ رسانی اور حاجت روائی کے لیے دی ہے۔ جب تک وہ دیتے دلاتے رہتے ہیں، اللہ ان کے ہاتھوں میں باقی رکھتا ہے اور جب وہ ہاتھ روک لیتے ہیں تو خدا ان سے چھین کر دوسروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔
- مومن کو اپنے برادر مومن کی ہر معاملے میں راہنمائی کرنا چاہیئے۔ وہ کبھی اس کے ساتھ مکاری، غداری اور زیادتی نہیں کر سکتا۔ وعدہ کر کے بدل جانا اس کی شان کے خلاف ہے۔
- ایمان، ایک ایسا مضبوط رابطہ ہے جو مومنین کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیتا ہے، وہ ایک روح اور دو قالب کے مثل ہو جاتے ہیں۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی، ایک کا غم دوسرے کا غم بن جاتا ہے۔
- اسلام نے مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے کے کچھ حقوق قرار دیے ہیں۔ ان کا لحاظ کرنا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ اگر کوئی مومن بھوکا ہو تو اسے کھانا کھلانا چاہیئے، کپڑے نہ پہنے ہو تو اس کے لیے لباس فراہم کرنا چاہیئے، کسی رنج اور دکھ میں مبتلا ہو تو اسے دور کرنا چاہیئے، قرضدار ہو تو اس کا قرضہ ادا کرنا، مرجائے تو اس کے پسماندگان کی خبر گیری کرنا دوسرے مومنین کا فریضہ ہے!

(اخذ و اقتباس از کتاب "اقتصادنا")

حضرت شاہ اہل اللہ پھلتی قدس سرہٗ

جناب مسعود انور علوی کاکوروی

ارشادات و افادات

صاحب "القول الجلی" نے آپ کے افادات و ارشادات بھی بالتفصیل لکھے ہیں، بخوف طوالت یہاں بہ اختصار نمونہ کچھ درج ذیل ہیں:

طریقہ کمال موقوف بر ایں خصال است تزکیہ و تصفیہ و تخلیہ و تجلیہ۔ اما تزکیہ پس عبارت است از آراستن و پیراستن ظاہر اعمال و افعال خود را بہ پیرایہ شریعت مصطفویہ کما قال اللہ تبارک و تعالیٰ ﴿لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾ الخ

طریقۂ کمال ان خصلتوں پر موقوف ہے۔ تزکیہ، تصفیہ، تخلیہ، تجلیہ۔ تزکیہ سے مطلب ہے اپنے اعمال و افعال ظاہری کو شریعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے آراستہ پیراستہ کرنا جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں اسوۂ حسنہ ہے اس کے لئے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور یوم آخرت کی امید کرتا ہے۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

(پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کے خلاف جو چلے گا وہ ہرگز منزل مقصود پر نہ پہنچ سکے گا۔)

وتصفیہ اشارت است بہ طبعًا بہ صاف کردن وپاک، پاکیزہ ساختنِ دل از صفات ذمیمہ ومتصف گردانیدنش باوصاف کریمہ چناں رباعیینِ حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس اللہ سرہٗ العزیز کافی ووافی ست

تصفیہ سے مراد طبیعت کی صفائی اور دل کو صفاتِ ذمیمہ سے پاک و صاف کرنا اور تجلیہ سے مطلب ہے اوصاف کریمہ سے اسے متصف کرنا۔ حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس اللہ سرہٗ کی یہ دونوں رباعیاں اس سلسلے میں کافی ووافی ہیں۔

خواہی کہ شود دلِ تو چوں آئینہ
دہ چیز بروں کن از درون سینہ
حرص و امل و غضب دروغ و غیبت
بخل و حسد و ریا و کبر و کینہ

اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھارا قلب آئینہ کی طرح صاف ہوجائے تو اپنے سینہ سے دس[10] چیزیں نکال دو لالچ[1]، بے جا امید[2]، غصہ[3]، جھوٹ[4]، غیبت[5]، کنجوسی[6]، حسد[7]، ریا[8]، غرور[9]، کینہ[10]۔ اور اگر یہ چاہتے ہو کہ مقام قرب میں مقیم ہوجاؤ تو اپنے آپ کو نو[9] چیزوں کی تعلیم دو (یعنی اپنے کو ان کا عادی بناؤ) صبر[1]، شکر[2]، قناعت[3]، بردباری[4]، یقین[5]، خود سپردگی[6] (اپنی مرضی کو حق کا تابع کرنا) توکل[7]، رضامندی[8] اور تسلیم[9]۔

خواہی کہ شوی بہ منزل قرب مقیم
نہ چیز بہ نفس خویش فرما تعلیم
صبر و شکر و قناعت و حلم و یقین
تفویض و توکل و رضا و تسلیم

چوں قلب و قالب از لوث رذائل مطہر و مصفا باشد شایانِ لمعانِ انوارِ حقیقت

جب قلب و قالب رذائل کی آلودگی سے پاک و صاف

الحقائق تواند گردید وتخلیہ کنایت از خالی
ساختن و روفتنِ دل است از خس و
خاشاک محبتِ ماسوی اللہ کہ ہیچ مطلوبے
ومحبوبے بہ جز ذاتِ حضرت بیچون در
خاطرش قرار نگیرد و ہرچہ از ضروریت
کارگاہ بشریت نگاہ تامل کند بہ سوائے
قدر لابدی راغب و مائل نگردد و للہ
در من قال ؎

حرص قانع نیست بیدل ورنہ ز اسبابِ معاش
انچہ ما در کار داریم اکثرے در کار نیست

ہو جاتے ہیں تو وہ حقیقۃ الحقائق کی
تجلیات کے قابل ہو جاتے ہیں اور تخلیہ
سے اشارہ ہے دل کا ماسوی اللہ کی محبت
کے خس و خاشاک سے خالی کر دینا
اور جھاڑ کر صاف کر دینا تاکہ کوئی مطلوب و
محبوب بہ جز ذات حضرت بے چون اس کے
دل میں جاگزیں نہ ہو اور کارگاہ بشریت
میں جن ضروریات پر نگاہ پڑے سوا
ایسی چیزوں کے جو لابدی ہوں (بقدر کفاف)
دوسری چیزوں کی طرف مائل و راغب نہ
ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

بیدل حرص قانع نہیں ہے ورنہ اسباب
معاش جس قدر ہم کو حاصل ہیں بہتوں کو
حاصل نہیں ہیں۔

وتجلیہ درایت ذات حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ
است بہ صفت تعظیم و محبت ہرچہ تمام تر
مقدور گردد وحصول این دولت با صحبت
صاحبِ قلبے دست دہد کہ از اشعۂ آفتاب
خاطرش این ذرہ وار ہم تابان و درخشان
گردد یا بہ مداومت ذکر مع لزوم الفکر کہ طریقہ
اسم ذات و نفی و اثبات حاصل شود و موہبت

تجلیہ سے مراد حضرت حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی
ذات کی درایت تعظیم و محبت کے ساتھ جہاں
تک ممکن ہو، ہے۔ اس دولت کا حصول
یا تو اہل دل کی صحبت سے ہوتا ہے جو
اس کے آفتاب دل کی شعاعوں سے
ذرہ وار تاباں و درخشاں ہو جاتا ہے یا
مداومت ذکر مع لزوم الفکر سے (ہمیشہ

الٰہی در بارہ ہر نا قابلے کہ توجہ فرماید بلا سبق استعداد گشتے قوی و انجذابے محکم بدلش ریزد کہ خواہ مخواہ بطوع خاطر یا بالاکراہ سر از گریبانِ حضور نہ تواند برداشت [۱۶]

ذکر و فکر کرنے سے) جو اسم ذات یا نفی و اثبات کا طریقہ ہے حاصل ہوتا ہے عطائے الٰہی جس نا اہل پر بھی توجہ فرمائے اس کے دل میں ایسی قوی کشش اور محکم انجذاب ڈال دیتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ بہ طوعِ خاطر یا بالاکراہ اپنا سر گریبانِ حضوری سے اٹھا ہی نہیں سکتا۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنی کتاب "چہار باب" کے آخری باب میں جو نصائح و ارشادات درج فرمائے ہیں ان میں سے بھی چند ہدیۂ قارئین ہیں:

زندگانی چند روزست بدانند کہ آخر گزشتنی است، از بہر دنیا با کسے عداوت و دشمنی نگیرند و کسے را عیب نہ کنند و بد نہ گویند خصوصاً عیب یک فرقۂ خاص را علانیہ ذکر نہ کنند و تا توانند بر کسے حسد نبرند و دروغ بے فائدہ بر زبان نیاورند سخن بد کسے بہ کسے نرسانند و خود را از بخل و جبن تا توانند پاک گردانند و بر آنچہ رضائے اللہ تعالیٰ ست راضی باشند و خود را بزرگ ترین و کلاں نشمارند و فخر و

جان لیں کہ یہ دنیاوی زندگی چند روزہ ہے جو آخر کار ختم ہو جائے گی۔ اس لئے دنیا کے لئے کسی سے دشمنی نہ رکھیں، کسی سے کسی دوسرے کا عیب نہ کہیں (غیبت نہ کریں) اور اُسے بُرا نہ کہیں خاص طور پر کسی خاص فرقے کا عیب بھری محفل میں نہ کہیں، جہاں تک ممکن ہو کسی سے حسد نہ کریں اور بلا وجہ و بے فائدہ جھوٹ نہ بولیں۔ کسی کی بُری بات کسی سے نہ کہیں۔ جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو کنجوسی اور

۱۶۔ القول الجلی: ۲۳-۲۲۴

نخوت را در دل راه ندہند و تا توانند در
اصلاح عالم بکوشند و درمیان ہیچ کس
نقیض و فساد نیندازند و در اکل حلال و
صدق مقال و استقامت احوال سعی کلی
نمایند کہ سرجمیع طاعات و رئیس جملہ عبادات
ست و از کلمۂ خیر در حق خویش و بیگانہ باز
نمایند و در امر معروف و نہی عن المنکر سعی بلیغ
گمارند و اگر نتوانند بہ دل ناخوش دارند
و خود مرتکب آں نشوند ....
در شادی و غم و غصہ چناں فعلے نہ کنند
کہ بار دیگر ندامت آں کشند و در وقت
غضب عناں خود بگیرند چناں حرف
سخت نہ گویند کہ اگر باہم موافقت شود
خجلت ازاں کشند .... در غنائے
وافر و فقر مفرط تا توانند از اخلاق قدیم
خود نگردند و بر دولت خود چنداں
ننازند و از غربت و فقر خویش چنداں
نہ نالند کہ گردوں گرداں ست و
جہاں

بزدلی سے محفوظ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کی
مرضی و خوشی پر راضی رہیں۔ اپنے کو بڑا
نہ سمجھیں۔ دل میں بے جا فخر و گھمنڈ نہ پیدا
ہونے دیں۔ جہاں تک ہوسکے دنیا کی
اصلاح کی کوشش کریں۔ کسی شخص کے
درمیان لڑائی جھگڑا اور فساد نہ پیدا
کریں۔ حلال روزی کمانے، سچ بولنے
اور راست روی کی پوری کوشش کریں
اس لئے کہ یہی تمام اطاعات کی روح اور
جملہ عبادات کی اصل ہے۔ اپنے اور پرائے
کو اچھی بات کے واسطے نصیحت کرنے
میں دریغ نہ کریں۔ اچھی باتوں کی ترغیب
اور بری باتوں پر ٹوکنے کی پوری کوشش
کریں اور اگر ایسا نہ کرسکیں تو ان برائیوں
کو اپنے دل میں برا سمجھیں اور خود اس کے
مرتکب نہ ہوں .... خوشی رنج
اور غصہ کی حالت میں کوئی ایسا کام نہ
کریں کہ دوسرے وقت اس کی شرمندگی
اٹھانا پڑے۔ غصہ کے وقت اپنے آپ پر
پورا قابو رکھیں۔ اور اپنے مقابل سے
کوئی بھی ایسی سخت سست بات نہ کہیں

زرنج و راحت گیتی مرنجاں دل مشو خرم
کہ آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد[۱۶]

کہ اگر دوبارہ موافقت و صلح ہوجائے تو اس پہلی سخت بات کہدینے پر اب شرمندگی و ندامت ہو . . . . . دولت کی ریل پیل اور فقر و فاقہ کی حالت میں جہاں تک ہوسکے اپنے سابقہ طور طریقے اور عادات میں فرق نہ آنے دیں اور نہ اپنی دولت پر ناز کریں اور اترائیں اپنی غربت و پریشان حالی سے پریشان نہ ہوں اس لئے کہ آسمان ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اور زمانے میں انقلاب آتے ہی رہتے ہیں۔ (رنج و آرام دنیوی سے پریشان اور خوش نہ ہو اس لئے کہ دنیا کا قانون ہی یہ ہے کہ کبھی یہ کبھی وہ)

تالیفات:

شاہ صاحب نے کئی کتابیں تالیف فرمائیں ۔ شاعری سے بھی ذوق تھا ۔ فارسی نثر نگاری کی مثال درج ہو چکی ہے ۔ صاحب القول الجلی آپ کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

در انشاء و شعر بدیع البیان اند نظم نہایت دل پذیر و نثر پر از لطائف و ظرائف بہ غایت متین و بے نظیر می نویسند و قصیدہ فارسیہ نظم فرمودند مشتمل بر بیان بسیارے از معجزات

شاعری و انشاء پردازی میں نادر البیان ہیں۔ نظم انتہائی دلپذیر اور نثر لطائف و ظرائف سے پُر بہ غایت متین و بے نظیر ہیں۔ ایک قصیدہ فارسی زبان میں معجزات کے بیان پر

۱۶؎ "چہار باب" مخطوطہ ۔ کتب خانہ انوریہ کاکوری۔

و دیگر رسالہ عقائد منظوم نوشتند؎[۱] مشتمل نظم فرمایا اور دوسرا رسالہ عقائد منظوم لکھا۔

انفاسِ رحیمیہ: جیساکہ نام سے ظاہر ہے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ یہ طبع بھی ہو چکا ہے۔

تخریج احادیث ہدایہ: یہ کتاب ہدایہ کی احادیث کی تخریج کے سلسلے میں مرتب فرمائی۔ صاحب الیانع الجنی لکھتے ہیں:

> لہ کتابًا لطیفًا فی تخریج احادیث الہدایۃ
>
> ہدایہ کی احادیث کی تخریج کے سلسلے میں ان کی ایک عمدہ کتاب تھی۔

لیکن غالبًا اب اس کتاب کا وجود نہیں ہے۔

تلخیص ہدایہ: یہ ہدایہ کا خلاصہ ہے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ حبیب گنج، آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ہے۔

تفسیرِ قرآن: عربی زبان میں یہ تفسیر قدیم مفسرین کے طرز پر اور صوفیہ کے مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے تالیف فرمائی۔ غیر مطبوعہ ہی رہی۔

چہار باب: فارسی زبان میں چار ابواب پر مشتمل ایک رسالہ مرتب فرمایا جس میں پہلا باب ان عقائد کے بیان میں ہے جن کا جاننا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ دوسرا اس سلسلہ میں کہ ان پر عمل کرنا فرض، واجب، سنت یا مستحب ہے۔ تیسرا باب اعمال کے فضائل پر مشتمل ہے۔ چوتھے باب میں مواعظ و نصائح ہیں جن کا اقتباس درج کیا جا چکا ہے۔

کنزالدقائق: فقہ کی اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ فرمایا تھا۔ یہ بھی غیر مطبوعہ

---

[۱] القول الجلی: ۴۲۱

رہی۔

فوائد: ایک رسالہ معنون بہ فوائد ہے جس میں طریقت کے معارف اور حقیقت کے اسرار و رموز کا بیان ہے۔ شیخ محمد عاشق پھلتی رح فرماتے ہیں۔۔۔ ور رسالہ معنون بہ فوائد از مصنفات ایشان ست کہ دراں لبسے معارف طریقت و اسرار حقیقت بیان نمودند۔[19]

اخلاف:

چونکہ شاہ صاحب قدس سرہٗ کے حالات بھی اب تک مستور رہے ہیں لہٰذا آپ کے صاحب زادگان کے بارے میں بھی کچھ زائد تفصیل نہیں ملتی ہے۔

ایک صاحب زادے شاہ مقرب اللہ تھے جن کے بارے میں راقم الحروف کو باوجود تلاش بسیار کے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ مؤلف قول جلی بھی اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ آپ کے ایک دوسرے صاحب زادے شاہ محمد عمر تھے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے ایک مکتوب سے جو آپ نے اپنے عم مکرم کی خدمت میں بھیجا پتہ چلتا ہے کہ جن مولود کی آمد پر انھوں نے چچا کو مبارکباد دی وہ یہی شاہ مقرب اللہ تھے۔

... هناكم الله تعالىٰ مولده وقرن بالخير مورده
واطال عمره واسعده وجعله مقرب جناب
الاله وربّاه فى ظلال اهل الله آمين[20]

شاہ محمد عمر کا وصال پھلت میں ہوا تھا وہیں شاہ محمد عاشق صاحب قول جلی اور آپ کے صاحبزادہ شاہ محمد فائق کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

---

[19] القول الجلی : ۱۲۳ھ۔

[20] حیات ولی : ۳۳۵۔

احقر کو اس سلسلہ میں مزید کچھ علم نہ ہو سکا ہے۔

وصال :

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے وصال کے بعد کچھ عرصہ شاہ صاحب دہلی میں رہے پھر اپنے نانہیال پھلت منتقل ہو گئے اور وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار فرمالی۔

۱۱۸۷ھ میں پھلت ہی میں آپ نے وفات پائی اور وہیں اسی احاطہ کے باہر جس میں آپ کے صاحبزادے شاہ محمد عمر اور شاہ محمد عاشق و ان کے صاحب زادے شاہ محمد فائق ہیں آسودۂ خواب ہوئے۔

۱۱۸۷ھ وہی سال ہے جس میں حلقۂ ولی اللہی کی ان اہم شخصیتوں نے سفرِ آخرت فرمایا:

(۱) شاہ اہل اللہ

(۲) شیخ نور اللہ بڈھانوی

(۳) شیخ محمد عاشق پھلتی

(۴) خواجہ محمد امین کشمیری رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔

الواح الصنادید

پروفیسر محمد اسلم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

حکیم نیّر واسطی کا شمار پاکستان کے نامور حکماء اور ادباء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے پروفیسر ای، جی، براؤن کی عربیین میڈیسن کا اردو ترجمہ طب العرب کے نام سے کیا تھا۔ یہ ترجمہ اپنے حواشی کی بنا پر اصل تصنیف سے زیادہ اہم ہوگیا ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "شعر و حکمت" کے عنوان سے زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ ان کی ایک تصنیف "تاریخ روابط پزشکی ایران و پاکستان" بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ موصوف قلعۂ لاہور کی شمالی دیوار کے ساتھ شیر شاہ ولی کی درگاہ میں محو خوابِ ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یا اللہ　　مرقد منوّر　　یا محمدؐ

علامہ حکیم سیّد علی احمد نیّر واسطی

نور اللہ مرقدہ الشریف

تاریخ وفات

۲۶ مئی ۱۹۸۲ء بمطابق ۲ شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ

قطعۂ تاریخ

داد داغ فراق مارا ہائے — نیرؔ واسطی ز دھر نہفت
فکر کردم برائے سال وفات — "ہائے داغ فراق" ہاتف گفت

۱۴۰۲ھ

دیگر

نیرؔ سعد بخت آہ زما — روئے خود در نقاب گور نہفت
از پئے سال رحلتش ہاتف — "نیرؔ سعد بخت" آہ گفت

۱۴۰۲ھ

(عرشی امرتسری)

گورستان میانی میں سید نذر محی الدین قادری کے مزار سے عین جانب مغرب تیس میٹر کے فاصلے پر مشہور ماہر تعلیم سید عابد احمد علی محوِ خواب ابدی ہیں۔ مرحوم کا تعلق سرسید احمد خاں کے خاندان سے ہے۔ آزادی سے قبل مرحوم مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں شعبۂ عربی میں استاد تھے۔ قیام پاکستان کے بعد موصوف پاکستان چلے آئے اور بڑے عرصہ تک گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل رہے۔ گورنمنٹ سروس سے ریٹائرمنٹ کے بعد موصوف بیت القرآن پنجاب پبلک لائبریری سے منسلک ہو گئے تھے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ

محمدؐ

سید عابد احمد علی

ابن سید احمد علی

۳۷۶

تاریخ وفات ۱۷ ربیع الثانی ۱۳۹۴ھ

مطابق ۱۰ مئی ۱۹۷۴ء بروز اتوار عمر ۶۹ سال

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں

یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

اسی قبرستان میں جو سڑک اختر شیرانی کی قبر سے باغ گل بیگم کی طرف جاتی ہے، اس پر بابا فیروز الدین کے مقبرے کی طرف جانے والے راستے پر لب سڑک مشہور شاعر نصرت جالندھری کی قبر ہے۔ اس کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

جل جلالہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیر بیگ مرزا نصرت جالندھری

ولد

مرزا رستم بیگ

پیدائش جالندھر چھاؤنی ۳۱ر جنوری ۱۸۹۴ء

وفات لاہور ۷ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

کون کہتا ہے کہ نصرت مر گیا

کیوں نہیں کہتے کہ اپنے گھر گیا

اس شعر میں مرحوم نے حضرت مرزا مظہر جانجاناں کا تتبع کیا ہے۔

نصرت جالندھری کی پائنتی امرتسر کے معروف شاعر شاد امرتسری آسودہ خاک ہیں۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت درج ہے:

یا اللہ　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　یا محمدؐ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

زندگی بھر ہمیں ناشاد کرے گی دنیا

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

پیدائش　۷ر اکتوبر ۱۹۲۴ء

وفات　۱۲ر اکتوبر ۱۹۶۶ء

شادؔ کے دو شعر پیشِ خدمت ہیں:

اور تو کچھ بھی محبت میں ہمیں مل نہ سکا

اک خلش ایک کسک صورتِ الزام رہی

مہرِ رخسار نہ اب سایۂ گیسوئے دراز

اب نہ وہ صبح رہی اپنی نہ وہ شام رہی

ولہٗ

نالۂ درد میں پہلا سا وہ آہنگ نہیں

اب کسی طور بھی جینے کا کوئی ڈھنگ نہیں

اس قدر تنگ کیا گردشِ دوراں نے کہ اب

سر میں سودائے خیالِ دہنِ تنگ نہیں

شادؔ کا مجموعۂ کلام "داغِ فراق" کے عنوان سے ۱۹۶۳ء میں لاہور سے طبع ہو چکا ہے۔ داغِ فراق کے اعداد ۱۳۸۶ بنتے ہیں اور اسلامی کلینڈر کے حساب سے بھی اس کا سالِ وفات ہے۔

شادؔ امرتسری کی قبر سے اندازاً سو گز کے فاصلے پر سڑک کے کنارے کرنل خواجہ عبدالرشید کے برادر بزرگ خواجہ عبدالمجید محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ موصوف جامع اللغات

کے مصنف ہیں اور اس کے علاوہ انھوں نے حالی پر بھی ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یا اللہ　　مرقد مبارک　　یا محمدؐ

خواجہ عبدالمجید

ولد خواجہ کریم بخش ولد محمد بوٹا

ڈی۔ایس۔پی ۔ و مصنف جامع اللغات

راستباز، راست گو، امین منصف،

تاریخ وصال ۲۴ر جون ۱۹۳۷ء

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

انا للہ وانا الیہ راجعون

موجودہ صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں اردو زبان میں چھپنے والے رسائل میں "شبابِ اردو" سرفہرست تھا۔ اس مؤقر جریدہ کے مدیر احمد حسین گورستان میانی صاحب میں سید فدا حسن کی قبر سے بیس میٹر جانب شمال آسودۂ خاک ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

۷۸۶

اللہ　محمدؐ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

۳۷۹

آخری آرام گاہ

خان احمد حسین خاں صاحب

خلف اکبر جناب خان بہادر محمد حسین خاں

خطِ لوحِ مزار

نوشتہ خود

کونے میں اس مزار کے سکھ اور چین ہے
یہ خواب گاہِ حضرتِ احمد حسین ہے
ہر چند اس کا نامۂ اعمال ہے سیاہ
لیکن خدا کے رحم کا وہ نورِ علین (کذا) ہے

تاریخ ولادت	تاریخ وفات
۱۲ر جولائی ۱۸۶۷ء	یکم جنوری ۱۹۵۷ء

مولانا غلام محمد ترنم امرتسری کی قبر بھاول پور روڈ پر لب سڑک واقع ہے۔ ان کی قبر سے اندازاً انتیس میٹر جانب شمال کرنل خواجہ عبدالرشید کی آخری آرام گاہ ہے قارئین برہان خواجہ صاحب کے علمی کارناموں سے خوب واقف ہیں۔ ان کی علمی یادگاریں میں تذکرہ فارسی، شعرائے پنجاب، دیوان طالب آملی، معارف النفس اور انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

یا اللہ — یا محمدؐ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

انا للہ وانا الیہ راجعون

لیفٹیننٹ کرنل (ریٹائرڈ) خواجہ عبدالرشید

خلف الرشید

خواجہ عبدالحمید

پیدائش ۱۲ رمئی ۱۹۱۲ء وفات ۱۳ مارچ ۱۹۸۳ء

حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی المعروف بہ حضرت ایشاںؒ کا شمار شاہجہانی عہد کے نامور اولیاء اللہ میں ہوتا ہے۔ ان کے فرزند خواجہ معین الدین نے مرآۃ طیبہ کے عنوان سے ان کے ملفوظات اور سوانح قلمبند کیے تھے، جس کا ایک مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے اس مخطوطے کے بارے میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جو سہ ماہی اردو کراچی (بابت ماہ مارچ ۱۹۸۰ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

حضرت ایشاں کا مزار بیگم پورہ لاہور میں مرجع خلائق ہے اور ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ھو الباقی

مزار معلیٰ

جناب زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حجۃ الکاملین امام العارفین

حضرت سید خواجہ خاوند محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ

المشہور (بہ) حضرت ایشاں صاحب

تاریخ وفات

۱۲ رشعبان المعظم ۱۰۵۲ھ

درگاہ کی مسجد کے عقب میں چند قبریں ہیں، جن میں سے ایک قبر ڈاکٹر اللہ جوایا کی ہے۔ موصوف موجودہ صدی کے ربع اول میں امیر حبیب اللہ خاں والیٔ کابل کے معالج خاص تھے۔ کابل میں قیام کے دوران میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رح کی ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ ڈاکٹر اللہ جوایا کے لوحِ مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون

مرقد

عزت نشان کرنل ڈاکٹر اللہ جوایا

ولد میاں عبدالصمد

تاریخ وفات

۷ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق یکم اپریل ۱۹۴۴ء

تاریخ پیدائش ۲۱ دسمبر ۱۸۶۹ء ، سن ۷۴ سال

ڈاکٹر اللہ جوایا کی اہلیہ سکینہ بیگم اور ان کے چھ فرزند بھی اسی خاندانی احاطہ میں محو خواب ابدی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے فرزندوں میں سے ایم انور بار ایٹ لا ر نامور قانون داں تھے اور وہ بھٹو کیس میں سرکاری وکیل تھے۔ دوسرے فرزند محمد صفدر پنجاب یونیورسٹی میں، شعبۂ ٹیکنالوجی کے سربراہ تھے اور تیسرے فرزند محمد سرور نے پاک بھارت جنگ میں پاکستان کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز حاصل کیا تھا۔

حضرت ایشاں رح کی درگاہ سے اندازاً دو فرلانگ کے فاصلے پر شاہ بلاول کی خانقاہ ہے۔ موصوف عہد شاہجہاں میں مشہور صوفی ہو گذرے ہیں۔ شاہجہاں،

دارا شکوہ اور جہان آرا بیگم اُن سے ملے تھے۔ شاہ بلاول کی درگاہ کا ذکر احمد شاہ ابدالی کے حملوں میں بار بار آتا ہے اور سر جدو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر گنڈا سنگھ نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے

سر جدو ناتھ سرکار نے کسی غلط فہمی کی بنا پر بلاول کو ہر جگہ بلاوِل ہی لکھا ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے۔

الله اکبر

بسم الله الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یا اللہ — یا محمد ؐ

حضرت شاہ بلاول قادری ؒ

وقت عشار شب دوشنبہ ۲۸ ماہ شعبان ۱۰۴۶ھ/ ۱۶۳۶ء

بعہد شاہجہاں

"نور معرفت" اور "نیکو سرشت" سے شاہ بلاول کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شاہ بلاول کے مزار سے اندازاً ایک فرلانگ کے فاصلے پر سرخ رنگ کی ایک مسجد لب سڑک نظر آتی ہے۔ اس مسجد کے شمال میں ایک چبوترے پر دو قبریں ہیں۔ ان میں سے ایک قبر مؤرخ لاہور مولوی نور احمد چشتی، صاحب تحقیقاتِ چشتی کی ہے اور دوسری قبر اُن کے والد مولوی احمد بخش یکدل کی۔ نور احمد کی قبر کا کتبہ کوئی اکھاڑ کر لے گیا ہے اور مولوی احمد بخش یکدل کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے:

بسم الله الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد منور زبدۃ العارفین فضیلت پناہ یکدلی آگاہ فخر الشعراء

حضرت قبلہ وکعبہ مولانا مولوی احمد بخش چشتی یکدل رحمۃ اللہ علیہ

سنہ وفات ۱۸۶۷ء

مولوی احمد بخش شاعر تھے اور ان کی بیاض مل گئی ہے۔ نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی میں اپنے والد کی بہادر شاہ ظفرؔ کے حضور میں باریابی اور خلعت پانے کا ذکر کیا ہے۔

مشہور ناول نگار اور افسانہ نویس ایم اسلم بڑے نیک انسان تھے۔ ان کے آخری ایام حیات میں نواب مشتاق احمد خاں، اشرف صبوحی، سید شریف حسن، عابد نظامی خالد بزمی، سلیم واسطی اور راقم الحروف ان کے بہت قریب رہے۔ سالہا سال تک ہمارا یہ معمول رہا کہ چھٹی کے دن ناشتہ ان کے ہاں کیا کرتے تھے۔ ناشتہ کے بعد محفل جمتی تو وقت گذرنے کا احساس نہ رہتا۔

میاں ایم اسلم نے دو سو سے زائد ناول اور افسانوں کے مجموعے تیار کیے تھے۔ شاید ہی کوئی ایسا اردو داں ہو جس نے ان کی کوئی تصنیف نہ پڑھی ہو۔

میاں ایم اسلم گورستانِ میانی صاحب میں اپنی خاندانی ادواڑ میں مشہور شاعر محمد دین تاثیر کی قبر سے چند گز کے فاصلے پر محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

میاں محمد اسلم مرحوم

پیدائش ۶ اگست ۱۸۸۵ء

وفات ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت ۔ تاریخ صقلیہ ۔ تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید و اپنی ترتیب ۔ بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبر، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب [illegible]

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط ۔ امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے [illegible]، تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار ۔ نیل سے فرات تک

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ [illegible] ضلع بجنور ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات ۔ لادینی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ [illegible] عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ۔ اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب ۔ [illegible] ۔ عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

. No. D. (DN) 231 PHONE : 262815 NOVEMBER 1984

. 965—57 Subs. 40/- Per Copy Rs. 3-50

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

حمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر بُرہان ۲۰ اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا

ٹائیٹل جلال پریس جامع مسجد دہلی ۶

دسمبر ۱۹۸۴ء

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

قیمت سالانہ : چالیس روپے

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت ۔ اسلام کا اقتصادی نظام ۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام ۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت ۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام ۔ اخلاق وفلسفۂ اخلاق ۔ فہم قرآن ۔ تاریخ ملت حصہ اول 'نبی عربی صلعم' ۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول ۔ وحی الٰہی ۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول ۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج وزوال ۔ تاریخ ملت حصہ دوم 'خلافتِ راشدہ' ۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول ۔ اسلام کا نظام حکومت ۔ سلسلۂ تاریخ ملت حصہ سوم 'خلافت بنی امیہ'

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم ۔ لغات القرآن جلد دوم ۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم ۔ قرآن اور تصوف ۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول ۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو ۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت ۔ مسلمانوں کا عروج وزوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم ۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم ۔ تاریخ ملت حصہ چہارم 'خلافت ہسپانیہ' ۔ تاریخ ملت حصہ پنجم 'خلافت عباسیہ اول'

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ۔ حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم 'خلافت عباسیہ دوم' ۔ بصائر ۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم 'تاریخ مصر ومغرب اقصیٰ' ۔ تدوین قرآن ۔ اسلام کا نظام مساجد ۔
اشاعت اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا ۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم ۔ عرب اور اسلام ۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم 'خلافت عثمانیہ' ۔ جارج برنارڈ شا ۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر ۔ فلسفہ کیا ہے ؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سر نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے ۔ کتابت حدیث ۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت ۔ قرآن اور تعمیر سیرت ۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ ۔

برہان

سالانہ چندہ
چالیس روپے

قیمت فی پرچہ
تین روپے پچاس پیسے

جلد ۹۴ | ربیع الاول ۱۴۰۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۴ء | شمارہ ۶

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے اعلیٰ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں یہ شرف صرف علی گڑھ یونیورسٹی کو حاصل ہے کہ یہاں شروع سے دینیات کی فیکلٹی قائم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید احمد خاںؒ نے جب کالج قائم کیا تھا تو وہ بجا طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان قوم کا وجود ان کے مذہب کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے کہا تھا کہ اس کالج سے جو نوجوان تعلیم جدید سے آراستہ و پیراستہ ہو کر نکلیں گے ان کی یہ شان ہوگی کہ ان کے داہنے ہاتھ میں قرآن مجید ہوگا اور بائیں ہاتھ میں سائنس اور علوم جدیدہ ہوں گے۔ اسی تصور کے ماتحت جب حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام ہوا تو اس میں شعبۂ دینیات قائم کیا گیا جس کے پہلے صدر مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ مقرر کئے گئے۔ مولانا کی صدارت میں اس شعبہ نے جو اہم علمی اور دینی خدمات انجام دیں ارباب علم پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ سرسید کی بڑی تمنا تھی کہ ان کا شعبۂ دینیات بھی بڑے پیمانہ پر قائم ہو اور وہ اسلام کی اور مسلمانوں کی خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے درخواست کی کہ وہ علی گڑھ آکر اس شعبہ کی سربراہی قبول فرمالیں۔ لیکن حضرت مولانا نے اپنی غیر معمولی مصروفیتوں کے باعث اس خدمت کے قبول کرنے سے معذرت ظاہر فرمائی اور اپنے بجائے اپنے داماد مولانا عبداللہ انصاری مرحوم کو علی گڑھ بھیج دیا۔ مولانا کے بعد سے ملک کی تقسیم تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس شعبۂ دینیات سے

مولانا شاہ محمد سلیمان اشرفؒ اور مولانا ابوبکر شیثؒ جیسے افاضل روزگار اس شعبہ سے وابستہ رہے اور بے شبہ ان حضرات نے اہم اور مفید خدمات انجام دیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان تمام باتوں کے باوجود فیکلٹی کی، یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کی طرح کوئی خاص تعمیر و تشکیل نہیں کی گئی اور نہ اس کا نصاب فیکلٹی کے شایان شان بنایا گیا۔ اس زمانہ میں شعبۂ دینیات کا سربراہ، ناظم شعبۂ دینیات ہوتا تھا اور اس کا کام یونیورسٹی کے طلبا کو نماز روزہ کی تلقین اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ ان میں دینی اور اسلامی جذبہ پیدا کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں مسجد میں نماز کے اوقات میں طلبا کی حاضری کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ یہ صورت حال ملک کی تقسیم تک قائم رہی۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا شعبۂ دینیات تقسیم کی نذر ہو گیا اور اس شعبہ کو توڑ کر اس کو بعض دوسرے مضامین کے ساتھ مدغم کر دیا گیا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ارباب اقتدار و اختیار کے تدبر اور دور اندیشی کے باعث یونیورسٹی کا شعبۂ دینیات سیکولرزم کی زد سے محفوظ رہا اور نہ صرف یہ کہ محفوظ رہا بلکہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار و اقتدار نے اس شعبہ کو ترقی دینے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس پروگرام کے پیش نظر جب کرنل سید بشیر حسین زیدی جو نہایت فعال و متحرک اور بڑے مدبر اور دور اندیش وائس چانسلر تھے انھوں نے مجھ کو جب کہ میں کلکتہ مدرسہ عالیہ کا پرنسپل اور فرسٹ کلاس گورنمنٹ گزیٹیڈ آفیسر تھا مجھ سے خط کے ذریعہ درخواست کی کہ میں علی گڑھ آکر اس شعبہ کا انتظام سنبھالوں۔ چونکہ میرے دل میں بھی یہ جذبہ تھا کہ میں یونیورسٹی کی خدمت کروں اس لیے میں نے اس درخواست کو بخوشی قبول کر لیا۔ اگرچہ اس زمانہ کے مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ بی۔ سی۔ رائے نے دو تین مرتبہ مجھ کو اپنے یہاں

بلاکر اصرار کیا کہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کو نہ چھوڑوں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جو اس زمانہ میں بہار کے گورنر تھے اور کلکتہ میں آئے ہوئے تھے، ان کے ذریعہ مغربی بنگال کی گورنر مس نائیڈو نے بھی اصرار کیا کہ میں کلکتہ نہ چھوڑوں۔ چونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ میرے کلکتہ چھوڑنے سے مدرسہ عالیہ کلکتہ کو نقصان پہونچ جائے گا لیکن چونکہ میں کرنل بشیر حسین صاحب زیدی سے وعدہ کر چکا تھا اس لیے میں نے ڈاکٹر بی، سی، رائے اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب دونوں سے معذرت کی اور کلکتہ کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا جس کو گورنمنٹ نے بادل ناخواستہ محض میرے اصرار کی وجہ سے قبول کر لیا اور میں ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ چلا آیا۔

جب میں نے علی گڑھ آکر شعبۂ دینیات کا چارج لیا تو اس وقت اس کی پوزیشن یہ تھی کہ شعبہ میں صرف دو لکچرر تھے اور زنانہ کالج میں ایک خاتون لکچرر تھیں۔ شعبہ کا دفتر مفتی محمد حفیظ اللہ مرحوم (ناظم دینیات) کے کمرہ میں تھا۔ دینیات کی تعلیم دو حصوں میں منقسم تھی ایک لازمی تعلیم جو ہر طالب علم کے لیے شروع سال میں ضروری تھی لیکن بی، ٹی، ایچ اور ایم، ٹی، ایچ کی دو کلاسیں لازمی نہیں تھیں۔ لازمی تعلیم کی کلاسوں میں تو بے شک طلباء کی کثرت ہوتی تھی لیکن بی ٹی ایچ کی کلاسوں میں طلباء اور طالبات کی تعداد برائے نام تھی اور ایم، ٹی، ایچ میں کوئی داخلہ اس وقت تک ہوا ہی نہ تھا۔ میں نے شروع شروع میں تو ایس ایس ہال دفتر کے لیے ایک کمرہ لیا اور اس میں کام شروع کیا لیکن دو تین سال کے بعد ہی وائس چانسلر پر زور ڈال کر ولایت منزل نام کی ایک نہایت وسیع اور شاندار کوٹھی دینیات کی فیکلٹی کے لیے حاصل کر لی جس میں آج کل یہ فیکلٹی قائم ہے۔ اس کے علاوہ میں نے لازمی تعلیم اور بی، ٹی، ایچ اور ایم، ٹی، ایچ کا نصاب بھی تبدیل کر کے اس کو یونیورسٹی کے شایان شان

بنایا۔ پھر اس شعبہ میں توسیع کے لیے استادوں کا اضافہ بھی کیا اور استادوں کے تقرر میں میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ہر استاذ قابل سے قابل ہو اور ساتھ ہی وہ علم و تحقیق کے شائق بھی ہوں۔ میری ان کوششوں کا اللہ کے فضل و کرم سے نتیجہ یہ ہوا کہ دینیات کی فیکلٹی یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کی طرح باوقار اور وسیع فیکلٹی بن گئی اور طلبا اور طالبات نے بی ٹی ایچ اور ایم ٹی ایچ میں بھی داخلہ لینا شروع کیا اور ایم ٹی ایچ کرنے کے بعد پی ایچ ڈی میں بھی کئی داخلے ہوئے۔ چنانچہ اللہ کے فضل و کرم سے جن طلبا اور طالبات نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں اس فیکلٹی سے حاصل کی ہیں وہ دس بارہ سے کم نہیں ہوں گی۔ اس کے علاوہ میں نے نصاب میں عربی کی تعلیم بھی لازمی کر دی اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا ایک پرچہ بھی رکھا پھر فیکلٹی کی لائبریری کو اس درجہ ترقی دی کہ آج یہ لائبریری یونیورسٹی کی لائبریریوں میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

۱۹۷۲ء میں میں یہاں سے سبکدوش ہو گیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ میں نے فیکلٹی کی جو روایات قائم کی تھیں میرے بعد بھی ان روایات کو برقرار رکھنے کی کوششیں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ آج فیکلٹی کا یہ حال ہے کہ شعبہ سنی دینیات میں میرے عزیز شاگرد ڈاکٹر حافظ قاری سید محمد رضوان اللہ ازہری صدر شعبۂ دینیات بھی ہیں اور فیکلٹی کے ڈین بھی۔ مولانا تقی امینی اور اول الذکر یہ دونوں حضرات پروفیسر ہیں۔ ان کے علاوہ دو ریڈر اور آٹھ مستقل لکچرر اور دو پارٹ ٹائم لکچرر ہیں۔ سنی دینیات کے علاوہ شیعہ دینیات میں بھی ایک پروفیسر، تین ریڈر اور دو لکچرر ہیں۔ اس شعبہ میں بھی ریسرچ جاری ہے۔ مولانا مجتبیٰ حسن کا نپوری اس کے پہلے صدر تھے دوسرے پروفیسر اور ڈین مولانا سید علی نقی تھے۔ اس کے علاوہ مولانا سید کلب عابد اس کے پروفیسر اور فیکلٹی کے ڈین بھی رہے۔ آج کل مولانا سید کاظم نقوی شیعہ دینیات کے صدر ہیں۔

شعبہ سنی دینیات نے مزید ترقی یہ کی ہے کہ اس شعبہ کے ماتحت تجوید کا ایک مستقل شعبہ قائم ہوا جس کے فارغ التحصیل طلباء کو باقاعدہ سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے اور ابھی حال میں اس شعبہ کے ماتحت حفظ قرآن کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک بڑا اہم اقدام یہ کیا گیا ہے کہ اب تک بی ٹی ایچ اور ایم ٹی ایچ میں داخلہ صرف ان ہی طلباء کے لیے مخصوص تھا جو یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوں، لیکن مسلم یونیورسٹی کے موجودہ فاضل وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے معادلہ کمیٹی اور صدر شعبہ سنی دینیات کی سفارش پر مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل طلباء کو جو بی اے کے درجہ کی انگریزی سے بھی واقف ہوں ان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ براہ راست ایم ٹی ایچ میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ بڑا اہم فیصلہ ہے کیونکہ اب مدارس عربیہ کے فضلاء کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ براہ راست مسلم یونیورسٹی سے ایم، ٹی، ایچ کا امتحان پاس کر کے یہاں سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر سکیں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کے بعد شعبہ سنی دینیات کو اپنے ایم، ٹی، ایچ کے نصاب میں بہت کچھ توسیع کر کے ایسے مضامین کا اضافہ کرنا ہوگا جو عام طور پر مدارس عربیہ میں نہیں پڑھائے جاتے پھر موجودہ حالت ایم، ٹی، ایچ کا نصاب صرف ایک سال پر مشتمل ہے۔ ہماری رائے میں اس کو بھی تبدیل کر کے ایم، ٹی، ایچ کا نصاب دو سال کا بنانا چاہیے تاکہ مدارس عربیہ کے جو طلباء ایم، ٹی، ایچ میں داخلہ لیں وہ صرف ڈگری .... حاصل کرنے کے لیے

نہ ہوں بلکہ اس سے ان کو درحقیقت علمی فائدہ بھی پہونچے ۔ خدا کرے یہ اسکیم بہ ہمہ وجوہ کامیاب ہو بلکہ اس سے فیکلٹی کی روایات اور زیادہ شاندار ہو جائیں ۔

دعائے صحت

پچھلے مہینہ کے رسالہ برہان میں حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایڈیٹر رسالہ برہان دہلی کی علالت کی اطلاع دی گئی تھی لیکن اس کے بعد ان کی حالت اور تشویشناک ہوتی گئی ۔ آج کل وہ علی گڑھ کے میڈیکل اسپتال میں داخل اسپتال میں داخل ہیں ۔ موصوف یرقان (پیلیے کی بیماری) میں مبتلا ہیں ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی سے بہت زیادہ متوقع ہوں کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہوکر اپنی آرام گاہ پر تشریف لے آئیں گے ۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے ۔ (آمین) قارئین برہان اور اس ادارہ سے تعلق رکھنے والے حضرات سے میں دعائے صحت کی درخواست کرتا ہوں ۔

عمید الرحمٰن عثمانی
پرنٹر و پبلشر و منیجر
رسالہ برہان دہلی

امیر الامراء، رئیس الاولیاء

حضرت خواجہ عبید اللہ احرار نقشبندی

ایک مطالعہ

جناب تقی انور صاحب علوی کاکوروی

حضرت سرورِ کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن حکیم فرماتا ہے:
لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلو علیھم ایاتہ ویزکیھم (یعنی اللہ نے مومنین پر احسان کیا کہ انھیں میں سے اُن میں رسول بھیجا جو انھیں آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا ہے) حضورِ اقدس امراض روحانی کے طبیبِ کامل اور نبض فطرت کے سب سے بڑے نباضِ تھے، اپنی امت اور اپنے صحابۂ کرام کے ہر فرد کے مزاج، فطرت اور اقتضائے طبیعت، ہر ایک کا عینِ ثابت معائنہ فرما کر اور اور انھیں ہر طرح جانچ و پرکھ کر ان کا علاج تجویز فرماتے تھے۔ چونکہ ہر شخص کا مزاج اس کی افتاد طبع اس کی طینت و فطرت بیشتر دوسرے سے مختلف اللہ نے تخلیق فرمائی ہے اسی لئے طریقۂ علاج اور دوا بھی مختلف ہوتی ہے۔ گرم مزاجوں کے لیے گرم دوائیں نقصان رساں ثابت ہوتی ہیں اور سرد و بلغمی مزاج والوں کے لیے سرد دوائیں مضر پڑتی ہیں۔ انگریزی

لہ لفظ احرار کی وجہ تسمیہ "گلزار ابرار" میں مذکور ہے لہٰذا یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ۱۲

مثل بھی ہے کہ ایک شخص کے لیے جو دوا تریاق ہوتی ہے وہی دوسرے کے لئے زہر بن جاتی ہے۔ حضورؐ کی حیات طیبہ ونیز اکابرین صحابہ رضوان علیہم کے حالات کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضورؐ نے ان کی اصلاحِ نفس، تزکیۂ باطن اور تجلیۂ روح کے مختلف طریقے ان کی طینت وفطرت کے مطابق اختیار فرمائے۔ اگر کچھ صحابۂ کرام کے لیے فقر وفاقہ وعسرت کی زندگی بسر کرنے میں ان کی فلاح وروحانی ترقی تجویز فرمائی اور اس طریقہ کو ان کے لیے پسند فرمایا، تو دوسری طرف بعض اکابرِ صحابہؓ کو دولت وثروت کے حصول کی توفیق عطا فرما کر اس کے لیے ان کی ہمت افزائی فرمائی۔ اگر ایک طرف حضورؐ نے الفقر فخری (فقر میرے لیے فخر ہے) ارشاد فرما کر صحابۂ کرام کے قلوب کو حرصِ مال و حبِ جاہِ دنیا سے بے نیاز کر دیا، تو دوسری طرف کاد الفقر ان یکون کفرًا (مجھے خوف ہے کہ فقر کہیں کفر تک نہ پہنچا دے) ارشاد فرما کر ان کو متنبہ فرمایا کہ ناقابل برداشت عسرت اور تنگدستی بعض اوقات انسانوں کو اتنا زائد پریشان اور تنگ دل کر دیتی ہے کہ وہ مائل بہ کفر ہو جاتے ہیں۔ اس پریشان حالی میں مضطرب وپریشان ہو کر وہ اعتقاداتِ کفریہ کی جانب مائل ہو کر ایسے کلمات کہہ جاتے ہیں جو کفر کی حدود تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس موخر الذکر حدیث کی عملی توضیح وتشریح اس طرح فرمائی کہ ایک دولتمند صحابی کو آپؐ نے دیکھا کہ صاحبِ حیثیت وثروت ہوتے ہوئے بھی وہ معمولی حیثیت سے رہتے تھے۔ ایک بار وہ حاضر تھے کہ حضورؐ نے اظہارِ ناگواری فرمایا بلکہ ان کو تنبیہ کی اور فرمایا کہ تم کو اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ اس طرح رہو کہ اس کی نعمتوں کا لوگوں پر اظہار ہو اور اس کے شکر گذار بندہ بنو چنانچہ انھوں نے اپنا طرز ماند وبود تبدیل کیا۔ قیمتی لباس پہن کر حاضر ہوئے۔ حضورؐ خوش ہوئے۔ خود حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم جہاں فاقوں، پیوند لگے کپڑوں اور جھونپڑے نما مکان میں مسرور وشکرانہ زندگی گذارتے تھے کبھی کبھی لباسِ فاخرہ و رنگین میں مجمعِ اصحاب میں منبر شریف پر جلوہ فگن ہوتے تھے اور اس عہد کے عرب کے

مروّجہ بہترین اور لذیذ غذاؤں سے کام و دہن کو محروم و نا آشنا نہ فرماتے۔ واقعۂ ابلا کی تفصیل پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاشانۂ نبوت اگرچہ خام تھا لیکن دو منزلہ تھا۔ اپنے محبوب و مستجاب الدعوات، چچا حضرت عباس رضؓ بن عبدالمطلب کو شان و شوکت و ناز و نعم میں بسر کرنے میں مالی اعانت فرماتے تھے۔ جانشینِ رسول ؐ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی دولت و ثروت اور مالی خدمات کو حضور ؐ نے کیسا سراہا ہے۔ اظہارِ تشکر میں فرماتے ہیں: مانفعنی مال احد کم کما نفعنی مال ابی بکر (یعنی تم میں سے کسی ایک کے مال و دولت نے مجھے اتنا نفع نہیں دیا جتنا ابوبکر رضؓ کے مال نے) حضرت عمر فاروق رضؓ کا حصولِ معاش کا اصل ذریعہ تجارت تھا جو ہجرت کے بعد جاری رہا اور ساتھ مخصولہ اپنی ملک اراضی پر زراعت بھی کرتے تھے۔ بعد کو خلافت کے بارِ گراں اور اس کی عدیم النظیر مصروفیات و خدمات نے آپ کو بے حد مصروف و محتاط بنا دیا۔ دورِ خلافت کا عہد گویا آپ کا اختیاری فقر تھا۔ حضرت عثمان رضؓ غنی کی دولت و ثروت اور امیرانہ طرزِ معاشرت اور اس سے اسلام و مسلمانوں کی نفع اندوزی کی ہزار ہا داستانیں ہیں۔ مدینہ میں جس وقت مسلمان شیریں پانی کے ایک ایک قطرہ کو ترس رہے تھے تو آپ نے بیرِ رومہ (جس کا مالک دشمن یہودی تھا) بیس ہزار میں خرید کر توحید کے تشنہ لبوں کو سیراب کیا۔ یا جیشِ عسرہ (بے سرو سامان لشکر) آراستہ کرنے کے لیے آپ نے حضور ؐ کے قدموں پر اپنے مکسوبہ مال و دولت کے انبار لگا دیے۔ اس وقت حضور سرورِ عالم ؐ کی خوشی و مسرت کا یہ عالم تھا کہ درہم و دینار کو دونوں ہاتھوں سے اُچھالتے اور حضرت عثمان رضؓ کو دعائیں دیتے جاتے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو حضور ؐ نے اپنا نفس (متحد الذات و الصفات) فرمایا اس لیے ان کے حسبِ فطرت و طینت صرف لباس "الفقر فخری" عطا فرمایا یعنی فقر و فنا و نیستی کی لذتوں میں ہمہ وقت مستِ الست رہ کر اپنوں کے ہاتھوں ناکامیوں میں بسر کرتے ہوئے مشاہدۂ ذات میں مستغرق رہنے سے

راہِ عشق است ایں رہِ حمام نیست غیرِ ناکامی دریں رہ کام نیست

اسی لیے سند الوقت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے آپ کو امت محمدیؐ کا سب سے پہلا مجذوب لکھا ہے (یعنی جس کی جزئیت کو ذاتِ حق نے اپنی کلیت میں جذب کرلیا) گویا حضورؐ نے ان کو اپنا نقشِ ثانی بنادیا۔ دوسری طرف شاہزادگان رسولؐ حضرت حسنین علیہما السلام کی مبارک زندگی پر نظر ڈالیے ان کی داد و دہش کے صدہا قصے سیر و تاریخ میں مذکور ہیں۔ حضرت امام حسنؓ کے جاہ و ثروت کا یہ رنگ تھا کہ ایک ایک وقت میں لاکھوں صرف ایک سائل کو دیدینا معمولی بات تھی۔ آپ کا دسترخوان بہت وسیع اور لذیذ کھانوں سے پرہوتا تھا وہ ایسا خوانِ یغما تھا جس پر دوست دشمن سب ہی کام و دہن بلا استثنا لذت یاب ہوتے تھے اور ہزارہا فاقہ زدہ لوگ شکم سیر ہوتے تھے۔ سرکارِ دو عالمؐ کے بہت ہی محبوب اور حواری حضرت زبیرؓ (پھوپھی زاد بھائی) کی زراعت و باغبانی (کھجور و انگور کے باغات) اتنے بڑے رقبہ میں تھی کہ ایک وقت میں ہزارہا مزدور اس میں کام کرتے تھے، نہایت فارغ البالی اور بڑی شان سے زندگی بسر فرماتے تھے۔ حضرت طلحہؓ و حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی جاہ و ثروت، عالی شان محلات، دولت کی اتنی فراوانی کہ ورثا میں لاکھوں کروڑوں بصورت درہم و دینار تقسیم ہوئے اور سونے کے اتنے بڑے بڑے ڈلے تھے جو کلہاڑی سے کاٹ کر تقسیم کیے گئے۔ میں نے صرف خانوادۂ نبوت اور حضرات عشرۂ مبشرہ رضوان اللہ علیہم کے حالات سے چند مثالیں دی ہیں) حضور سرور عالمؐ نظام معیشت کی اصل روح سے واقف کرائے گئے تھے آپؐ اکمل ماہر نفسیات بھی تھے۔ آپؐ نے طبقاتی جنگ کو پسند نہیں کیا۔ امراء و غرباء کو ایک دوسرے سے صف آرا نہیں ہونے دیا۔ غریب و نادار اپنی غربت میں خوش تھا۔ محنت و مزدوری سے کسب حلال میں مصروف رہتا۔ دولت مندوں کی دولت کی طرف للچائی نظروں سے دیکھنا عزتِ نفس و خودداری کے منافی سمجھتا تھا۔ اسی طرح دولت مندوں

کے قلوب سے دولت کی لالچ، حرص اور محبت اس طرح دور کی کہ ان کے دل میں اپنی توجہ و تصرف باطنی سے یہ بات بٹھادی اور یہ حقیقت نقش کر دی کہ دولت وثروت امانتِ الٰہی ہے، وہ اس کے امین ہیں۔ حسب احکام الٰہی اس کا برمحل صرف کرنا، حقوق العباد کا ملحوظ رکھنا، مخلوقِ خدا کے ساتھ معاملت میں سچا رہنا ان کا اولین فرض منصبی ہے۔ حضورؐ نے ان کے قلوب سے دنیا کی محبت وحرص کا زنگ دور کر دیا۔ ان کے آئینۂ قلب پر ایسی صیقل کر دی کہ اُس میں رُخِ یار کا عکس جھلک اٹھا۔ جب قلب نور الٰہی سے معمور ہوگیا تو دولت وثروت ان کی نظروں میں ہیچ پوچ ہوگئی۔ نصرتِ اسلام کے وہ ناصر بنے۔ اپنی دولت راہ خدا میں لٹائی اور اس سے اساسِ اسلام کو استحکام عطا فرمایا۔ اصحاب صفہ تنگ دستی اور فقر میں مست رہے اور ساز وبرگ ہستی سے ہمہ تن بے نیاز رہے۔ عاشقِ رسولؐ حضرت ابو ذر غفاریؓ ایک بار اصرار سے عرض کرتے رہے کہ کسی مقام کے حاکم بنا کر بھیجد یئے جائیں لیکن ناز بردار محبوبؐ نے کسی طرح منظور نہ فرمایا۔ ارشاد ہوا "اے ابی ذر تم کو ایک غلام کی ماتحتی اور سرداری میں اس کا محکوم بن کر رہنا مفید ہے۔ کبھی حاکم بننے کی خواہش نہ کرنا۔" چنانچہ جب آپ نے ربذہ میں قیام فرمایا تو حبشی غلام جو وہاں کا نگراں تھا اس نے آپ سے امامت کی درخواست کی۔ آپ کو ارشادِ محبوب یاد تھا آپ نے اس ارشاد کی اتباع فرمائی۔ یہ اختلافِ تعلیم بوجہ اس حکمتِ الٰہیہ کے ہے عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۔

کلام پاک میں کہیں تو اس طرح تعلیم ہے: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (جو لوگ اپنا مال رات ودن چوری چھپے اور کھلم کھلا خرچ کرتے ہیں تو ان کا اپنے رب کے پاس بڑا اجر ہے نہ ان پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔) دوسری جگہ اس انداز میں تعلیم فرما کر متنبہ فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔

یا اِنَّ المُبَذِّرِینَ کَانُوٓا اِخوَانَ الشَّیٰطِینِ (یعنی اللہ اسراف کرنے والوں کو (فضول خرچ کرنے والوں کو) پسند نہیں کرتا۔ فضول خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں)۔ ایک جگہ خود حضور اکرمؐ فرماتے ہیں کہ یاتین علی الناس زمان لا ینفع فیھا الا دراھم و دینار۔ یعنی ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگوں کو دولتِ سیم و زر سے زائد کوئی چیز نفع بخش نہ ہوگی۔ یعنی عزتِ نفس، اخلاقی جرأت انسان میں اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب وہ دوسروں کی مدد و استمداد سے بے نیاز ہو بلکہ رشد و ارشاد کے لیے دوسرے حاجت مند لوگوں کے لیے طعام و قیام کا سامان مہیا کرکے ان کو طلبِ حق میں یکسوئی سے مشغول رکھ سکے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کپڑے کے بہت بڑے تاجر اور بہت دولتمند تھے۔ انھوں نے حضرت امام محمدؒ کی صلاحیتوں کو پرکھ کر ان کی ساری کفالت اپنے ذمہ لے لی اور وہ اُن کے مایۂ ناز شاگردوں میں شمار ہوئے۔ اگر حضرت امام صاحب اتنے دولت مند نہ ہوتے تو کس طرح ہونہار شاگردوں کی صلاحیتوں کو بار آور ہونے کا موقعہ دیتے۔ ایسی ہزار مثالیں عہدِ رسالت، عہدِ خلفائے راشدین، عہد تابعین و تبع تابعین میں ملتی ہیں کہ جب دولت مند علماء، صلحاء، فقراء نے دولت کو برتا اس سے خود فائدہ اٹھایا اپنے وقار و معاشرت میں اپنی عزت کو برقرار رکھا اور دولت کو ذریعۂ عملِ خیر سمجھا نہ کہ صرف اپنے لیے آلۂ لذتِ نفس و عیش و عیاشی بتایا۔

(صحاحِ ستہ، مسند امام احمد ابن حنبلؒ، طبقات ابن سعد۔ اسد الغابہ)

حضرت مولانائے روم نے اسی کی تفسیر کی جو حضرت انبیاء علیہم السلام تعلیم فرماگئے تھے ؎

چیست دنیا از دنیا غافل بُدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

(یعنی دنیا سے مراد اللہ تعالیٰ سے غافل رہنا ہے نہ کہ لباسِ فاخرہ زیب تن کرنا اور اہل و عیال میں مشغول ہونا) صوفیائے کرام میں حضرت غوث الاعظم سیدنا شیخ محی الدین

عبدالقادر جیلانیؒ اپنے عہدِ رشد و ہدایت میں نہایت شان و جلال اور کرّوفر سے رہتے تھے۔ آپ کا ملبوس نہایت قیمتی کپڑے سے بنتا اور آپ نہایت اعلیٰ قسم کا کھانا بھی نوش فرماتے تھے۔ ایک بار آپ کے امیرانہ ٹھاٹ باٹ و طرزِ رہائش پر کسی نے اعتراض کیا تو آپ نے یہ فرما کر اس کا خطرہ دور کیا کہ مُردے کا کفن بھی قیمتی ہی ہونا چاہیئے۔ گویا جس نے اپنے نفس کو مردہ کر دیا اس کے لیے دیبا و حریر، ٹاٹ و صوف سب یکساں ہیں۔ بقول حافظ ؎

گر طہارت نبود کعبہ و بتخانہ یکیست
خیر ہا شد نہ دراں خانہ کہ عصمت نبود

یہ حفظِ عصمت اور صفائیِ قلب ہی اصلُ الاصول ہے۔ جب قلب تمام دنیوی آلودگیوں سے پاک ہو کر خلوت خانۂ محبوب ہو گیا تو اس نور و نورانیت کے مقام میں سیم و زر، لعل و جواہر کی چمک دمک بے حقیقت بے نور ہو جاتی ہے لیکن ظاہر بیں حضرات جو باطن کی کیفیات اور صوفیاء کے حال و مقام سے بے خبر ہیں بقول حضرت جگرؔ ؎

ناصحِ کم نگاہ سے کون یہ کہہ کے سر کھپائے
رازِ شکستگی سمجھ رنگِ شکستگی نہ دیکھ

ان خام کار موٹی عقلوں کے خاکی پتلوں کو کون سمجھا سکتا ہے یہ تو اس گروہ میں ہیں بقول حضرت سعدیؒ ؎

شور بختاں بہ آرزو خواہند
مقبلاں را زوالِ نعمت و جاہ

یعنی یہ بدبخت و بے نصیب تو ہر وقت بوجہ حسد اسی آرزو و تمنا میں رہتے ہیں کہ کسی طرح مقبولانِ بارگاہ کی جاہ و نعمت کا زوال ہو خواہ ان کو خود اس سے کچھ نفع نہ حاصل ہو۔ اس کمینہ خصلت سے جس کا شمار بدترین صفاتِ ذمیمہ میں ہے خود

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد پناہ مانگا کرتے تھے ۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مَحْسُوْدًا وَلَا تَجْعَلْنِیْ حَاسِدًا ۔ یعنی اے اللہ مجھے محسود بنانا لیکن حاسد نہ بنانا ۔ یہ دولتِ دنیا بھی ان حضرات کے لیے ایک نوع کا رنگ شکستگی ہے ۔ جب یہ تیرہ بخت ظاہر بیں عیب جو نظروں سے ان کے عزت و وقار ، جاہ و جلال ، دولت و ثروت کو دیکھتے ہیں تو حسد سے جل اٹھتے ہیں اور مقدور بھر طنز و تعریض اور حاسدانہ تبسم کے تیر و نشتر سے ان کے دلوں کو چھلنی کرنے میں کوشاں رہتے ہیں یہی ان کی شکستگی دل کا باعث بن جاتا ہے اور وہ اپنے صبر و تحمل سے بہر حال فائدہ میں رہتے ہیں ۔ اَنَا عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ لِاَجْلِیْ (حدیث قدسی) یعنی میں شکستہ دلوں کے قریب رہتا ہوں ۔

ماضی بعید کے حضرات صوفیائے کرامؒ کے علاوہ ماضی قریب و حال میں بھی اکثر صوفیائے کرام کا تمول زبان زدِ خاص و عام رہا ہے اور ان کے رموزِ باطنی سے ناواقفیت وجہالت کی بنا پر طنز و مزاح اور وجہِ طعن و تشنیع رہا ہے ۔ ان کے خانقاہی اخراجات کے باعث ان کو ہمیشہ ہدفِ ملامت بنایا گیا ۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کا لنگر دیگر صوفیاء کی طرح نہیں تھا کہ بندھی ٹکی دال روٹی کا تبرک تقسیم ہو جائے اور بس ۔ بلکہ آیندو روند اور وقتی قیام کرنے والوں کو ان کی حسبِ خواہش و فرمائش کھانا ملا کرتا تھا ۔ ان کا خود یہ عالم تھا کہ دو تین نوالے تناول فرما کر آب دیدہ ہو جاتے ۔ اور یہ خیال ان کو تڑپا دیتا کہ نہ معلوم اس وقت کتنے بندگانِ خدا دلی میں بے آب و دانہ بیتاب و مضطرب ہوں گے ۔ فیض و کرم کا بحرِ ناپیدا کنار لاکھوں حاجت مندوں کی حاجت روائی کا سامان مہیا کیا کرتا اور ان کو سیر و سیراب کیا کرتا ۔

حضرت قطب الدین بنیادِل قلندر جونپوریؒ اور ان کے بعد سلسلۂ عالیہ قلندریہ کے

اولیاء اللہ بڑے پیمانہ پر کاشتکاری کرتے تھے اور اسی پیشہ کے ذریعہ طالبین کا کشو دکار فرماتے تھے صدہا طالبین شہر کی مساجد میں آپ حضرات کے مہمان ہو کر قیام کرتے اور سلوکِ طریقت طے کرتے۔ حضرت شاہ مجتبیٰ معروف بہ شاہ مجا قلندر لاہرپوری رح (شاہجہان اور داراشکوہ کے معتقد علیہ) قادری الطریقت وقلندری المشرب بزرگ تھے۔ میرے علم میں سلسلۂ علیہ قلندریہ میں باقاعدہ خانقاہی نظام کے آپ ہی بانی تھے۔ بہت بڑی جاگیر و جائداد کے مالک تھے ایسا کہ ہر طالبِ صادق کو ان کے اہل وعیال کی کفالت کی ذمہ داری اور فکر سے آزاد و بے نیاز کرنے کے لیے کم ازکم دوسو روپیہ سالانہ عطا فرماتے تھے تاکہ فکر دنیا سے آزاد و بے نیاز ہو کر ان کی خدمت میں قیام کرکے مدارج سلوک طے کر سکیں۔

الغرض فیضِ عام کے سامان کیا دولت کے رہینِ منت نہیں۔ کیا جذبۂ خدمتِ خلق اور فکرِ رفاہِ عام بروئے کار آسکتا تھا۔ اگر اولیاء اللہ حسبتاً للہ بہ جائز کسبِ دولت نہ کرتے۔ ظاہری شاہانہ ٹھاٹ رکھتے ہوئے بھی وہ دل گنجینۂ معرفت وخزینۂ محبتِ حق بنائے تھے۔ ان کے دل حرصِ مال وحبِ دنیا سے پاک اور ان کے قلوب ہمہ وقت جلوہ گاہ حق بنے رہے۔ باوجود کسبِ معاش میں مشغول رہنے اور دولتمند ہونے کے ان کا رابطۂ مع اللہی اسی طرح قائم رہا اور قلب جلوۂ محبوب کی طرف منجذب رہا۔ جس طرح جس وقت بھی مقناطیس کے مقابل ہوتا ہے اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔

کیا یہ سب حصولِ دولت صرف اپنی آسودگیِ نفس کے لیے تھا؟ ہرگز نہیں۔ ان صوفیاء کی ذاتی زندگی سادگی کا ایک نمونہ تھی۔ وہ اس دنیا میں مسافرانہ زندگی گذارتے تھے، رسول اللہ ؐ کا حکم ہر وقت ان کے دل ودماغ میں رچا بسا تھا کہ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل فلا تنسوا ذکر اللہ وطاعتہ (یعنی دنیا میں ایک مسافر (پردیسی) یا راہ گیر کی طرح رہو اور اللہ کا ذکر اور اس کی اطاعت لازم کرلو۔) حصولِ دنیا

کے پاپڑ وہ صرف اس لیے بیلتے رہے کہ دکھے ہوئے اور زخمی دلوں کے لیے سامانِ مرہم فراہم کرتے رہیں ؎

چاہتا ہے عشق رازِ حسن عریاں کیجئے
یعنی خود کھو جائیے ان کو نمایاں کیجئے

مسند الوقت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں[1] کہ "شیخ وقت اور کامل کے لیے با اقتدار و مہذب و متمدن ہونا ضروری ہے۔" دوسری جگہ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ بزرگؒ (والد ماجد) نے بہ اشارۂ غیبی مجھے ہمراہ لے کر دعا مانگی اللّٰھم اعطِ مالاً وولدًا وشرح صدرٍ فی الدنیا واسلامًا عند الموت ومغفرۃ بعد الموت وفردوسًا فی الجنۃ (اولین دعا مال و دولت کی طلب ہے)

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پرس
اے مدعی نزاع تو با پردہ دار چیست

وہ پردہ دار جو اپنی خوبیوں، اپنے روحانی و باطنی مقامات کو برسرِ عام و عامی نظروں سے چھپائے ہوئے ہیں جو نیک نامی و شہرت کی ہوس سے کوسوں دور حالتِ اخفاء و کتمان میں اپنے حال و مقام کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کاوشوں میں مشغول ہیں۔ ظاہر بیں نگاہیں کیا جانیں کیا سمجھیں کہ یہ دولتِ دنیا کا حصول دنیاوی کاروبار میں ظاہری انہماک کے کیا کیا باطنی اور روحانی مصالح ہیں۔ "دل بہ یار و دست بہ کار" رہنے کو خصوصًا حضرات نقشبندیہ خاص روحانی عمل قرار دیتے ہیں جس کے لیے سرحلقۂ نقشبندیاں خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ نے "خلوت در انجمن" کی خاص اصطلاح ایجاد فرما کر اپنے مسترشدین کو اس کی خاص تعلیم فرمائی۔ سطحی نظریں اور ظاہر پر ٹھہر جانے والی بصیرت سے عاری آنکھیں

---

[1] السعی التقی فی ترجمۃ القول الجلی۔

یا جائیں کہ ان اولیاء اللہ کا کیا طریقۂ سلوک اور کیا مسلک رہا ہے اور اپنے پیروؤں کو باطنی
ولت سے مالا مال کرنے کے کیا کیا طریقے اختیار فرماتے ۔ صرف عبادتِ بدنی یعنی جسمانی
جاہدے اور ریاضتیں کافی نہیں بلکہ عبادتِ مالی اور دیگر بیشتر طریقے ہیں جن کے ذریعہ
سترشدین کی اصلاحِ نفس و باطنی ترقی ہوتی ہے اور یہ ہر شخص کے حسبِ حال و حسبِ
زاج و فطرت ہوتا ہے ۔

آج یہ رفاہِ عام کی جو جلوہ نمائیاں ہیں خانقاہوں میں اوقاتِ مقررہ کا اہتمام لاکھوں
وپیہ حاضرین و طالبین حق مہمانوں کے قیام و طعام پر خرچ کرنا اور طالبین کو جذب و سرمستی و
رفان و اخلاق کی تعلیم دینا ۔ یہ آج ہزارہا دینی مدارس میں علوم و فنون کی ترویج اور یہ
ئی نئی سائنسی ایجادات جن سے انسانی زندگی کو مادی سکون دیا جاسکے کیا دولت کی بدولت
ہیں؟ ہاں یہ سب موقوف ہے دولت کے صحیح و صائب استعمال پر ۔ ان صوفیائے کرام
ے لیے اس کسبِ دولت کی علتِ غائی یہ تھی کہ عام لوگ، یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش
ریں کہ اگر دولت باعثِ صد زحمت ہے تو بے شمار رحمتوں کا ذریعہ بھی ہے اور ان میں
ہ بصیرت پیدا ہو جائے کہ وہ اس رمزِ اکتسابِ دولت کو پالیں اور ظاہر سے ترقی کر کے
اطن کی حقیقت کو سمجھیں اور پائے نظر کو آزادی دیں اور خودبینی و خودی کی زنجیروں کو
وڑ کر ان اولیاء اللہ کی کاوشوں اور کوششوں کا عرفان حاصل کر کے عارف اور حقیقت بیں
ن سکیں ۔ یوں تو ہمیشہ سے صوفیائے کرام ہدفِ ملامت بنتے رہے مگر فی زمانہ اس
روہ کے صوفیاء جن کو اسبابِ معیشت میسر تھے یا ہیں ان پر طعن و طنز عام شعار
ور فیشن ہو گیا ہے ۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم بلا استثنا طنز کرتے ہوئے کہتے
ہیں ؎

ہم کو تو میسّر نہیں مٹّی کا دِیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

یہ طنز اسی کی ذہنی و دماغی کاوش ہے جو مشرک فلسفی نطشے کے دل کو مومن اور صرف
اس کے دماغ کو کافر کہتا ہے ع

قلبِ او مومن دماغش کافر است

حالانکہ مومن کا قلب ہی عرش اللہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنے فلسفیانہ ذہن و
دماغ کو ہی اپنا رہبر بنائے رہے لہٰذا وہ کیوں اس عیب جوئی میں اپنے کو اوروں سے
پیچھے رکھتے جن کے لیے بجلی کی روشنی اور کلبۂ ریاضت کی تاریکی ایک ہو۔ جسے جلوۂ حق
کا نور ہمہ وقت اندھیرے اجالے نظر آتا ہو اس کی نگاہ میں سو پاور بجلی کے بلب کی
روشنی کی کیا حقیقت۔ یہ شعر مریدین کے لیے سامانِ عبرت مہیا کرتا ہے۔ مرید کا یہ
خطرہ کہ وہ پیر کے ظاہری اسباب پر حسد کرے اس کی محرومی و خسران الآخرۃ کا
باعث ہوگا کیوں کہ اس قسم کے خطرات اس کی ارادت کو سوخت کرتے ہیں۔ جب
ارادت نہ رہی تو پھر سوا منافقت و تیرگی کے اس کے دل میں کیا باقی رہا ؎

مے کہ بدنام کند اہلِ خرد را غلط است
بلکہ مے می شود از صحبتِ ناداں بدنام

اگر دولت کو امانت و ملکِ الٰہی سمجھ لیا جائے اگر دولت کے حصول کا مقصد حکم الوزر
امراء پر غرور سے بے نیازی ہو اگر ذرائع و وسائل دنیاوی حاصل ہونے کے بعد جرأت
اخلاقی اور جذبۂ معرفت و خدا شناسی، تعلق مع اللّٰہی زندہ و تابندہ و بیدار رہے تو
باعثِ برکت و سعادتِ اخروی ہے۔ ارباب ظاہر پرست جو صوفیائے کرام کے حال و
مقام سے بے خبر ہیں ان کو اس کا استحقاق نہیں کہ وہ ان حضرات پر حرف گیری کریں
اور ہدفِ ملامت بنائیں ؎

زاہدِ ظاہر پرست از حالِ ما آگاہ نیست
درحقِ ما انچہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

میرا مقصد ہر گز موجودہ دور کے خود ساختہ و نام نہاد بلکہ نقّال پیروں کی تائید اور اُن کے افعالِ بد کی توجیہہ نہیں ہے جو صوفیاء کے لباس میں اپنی نا اہلی و عاقبت فروشی کے ساتھ اپنے اسلافِ کرام کی استخواں فروشی کر رہے ہیں جن کا نہ سلسلۂ طریقت صحیح و متصل ہے اور نہ جن کو اجازت وخلافت وجانشینی کی اصلیت و اہمیت کا بوجہ جہالت و نفسانیت علم ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ صوفیائے کرام نے کیا اصول و قواعد اس کے لیے مقرر و مرتب فرمائے ہیں جو صرف دعا و تعویذ کا پیشہ اختیار کر کے اپنی چرب زبانی و پُرفریب باتوں سے اور بھوت پریت، آسیب، جادو ٹونا کی کہانیاں سُنا سُنا کر عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل[1] کی خدائی تنبیہ و تہدید سے اپنے کو دیدہ و دانستہ اندھا بنائے ہیں۔ دعا، تعویذ و اعمال کو بعض متاخرین صوفیاء نے صرف رفاہِ عام کے لیے اختیار کیا لیکن اس میں بھی ان کو سخت مجاہدات کرنا پڑتے تھے۔ جلب منفعت و تجارت ہر گز مقصد نہ تھا۔ ان چیزوں کو تصوف یعنی علم طریقت و معرفت و درویشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ افسوس و شرم سے اس بات کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ دور کے بیشتر نام نہاد فقیر صوفی اپنے اسلاف کے اصولوں کو پامال کر کے خود بھی موردِ طعن و طنز بن رہے ہیں اور دوسروں کو بھی بدنام کر رہے ہیں ؎

پیراہن رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے
غافل ہیں وہ کیا جانیں دامن کہیں جلتا ہے

مگر یہ کلیہ بھی ماننا پڑے گا تعرف الاشیاء باضدادھا (یعنی اشیاء کی شناخت

---

[1] بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ جو شخص جھوٹ بول کر فریب دے کر دوسرے کا مال کھاتا ہے اُس کی نماز روزہ کوئی بھی عبادت قبول نہیں ہوگی وہ دوزخ کے انگارے کھاتا ہے۔

ان کی ضد سے ہوتی ہے) اگر نقل نہ ہو تو اصل کیسے پہچانا جائے ۔ اگر کفر نہ ہوتا تو اسلام کیسے پہچانا جاتا ۔ اگر بدی و برائیوں کا وجود نہ ہوتا تو اچھائیوں و نیکیوں کا لفظ بے معنی ہو جاتا ۔

زیر نظر مضمون میری اسی تمہید کا ایک عکس ہے جو نقشبندیوں کے قافلہ سالار حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کے حالات پر مشتمل ہے جو بیک وقت بوریا نشین فقیر بھی تھے اور صاحب اورنگ و سریر بھی ۔ واضح رہے کہ یہ وہی ممتاز اور عظیم المرتبت شخصیت ہے جن کے سلسلے میں حضرت مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؔ نے اپنی ہر تصنیف میں حمد و نعت کے بعد ایک عنوان قائم کیا ہے ۔

زد بجہاں دولت شاہنشہی — کوکبۂ فقر عبید اللّٰہی
آں کہ ز حرّیتِ فقر آگہ است — خواجۂ احرار عبید اللہ است
گشتہ ملائک مگسِ خوانِ او — راتبہ خوار از شکرستانِ او

تاریخ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ بادشاہوں اور امراء کے حالات کو مکمل تاریخ کہنا اگرچہ اس علم کی جائز وسعت کو بے جا طریقہ سے محدود کر دینا ہے جو تصنیفات دورِ ماضیہ کے حکمرانوں، بادشاہوں کے حالات اور ان کے عہد کے چند حیرت انگیز واقعات تک محدود رہوں مورخ کے لیے یقیناً ناکافی ہوتے ہیں اسی لیے ضرورت ہوتی ہے کہ دوسرے ذرائع سے تفتیش و تحقیق کر کے دنیا کے سامنے تاریخ کا مکمل خاکہ پیش کرے ۔

صوفیاء کے ملفوظات اور تذکروں کا مطالعہ ایسے مواقع کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوا ہے اس لیے کہ اکثر ایسے واقعات کا ان سے انکشاف ہو جاتا ہے جن پر اکثر و بیشتر مؤرخین نے توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا ۔ ملفوظات اور تذکروں سے روزمرّہ کی زندگی کا طریقہ اور عوام کی معاشرتی و تمدنی ترقی کا بھی پتہ چلتا ہے جو علم تاریخ

کا جزوِ اعظم ہے مگر ان تمام امور سے الگ ایک وجہ اور بھی ہے جس سے ملفوظات اور تذکرے تاریخی حیثیت سے انتہائی قابل قدر ہیں۔ فقراء کی خدمت میں امیر و غریب شاہ و گدا ہر ہر طبقہ کے لوگ اپنی اپنی حاجتیں لے کر آتے تھے اور ضرورتاً یا بر سبیلِ تذکرہ بکثرت واقعات اور صحیح حالات و معاملات بیان کر جاتے تھے جن میں سے اکثر ملفوظ نگار اور تذکرہ نویس نے محفوظ کر لئے۔ یہ واقعات عام طور پر یقیناً صحیح ہوتے تھے اس لیے کہ غلط بیانی تو شئے دیگر ہے پیرو مرشد سے قلبی کیفیات کا اخفا بھی اس عہد میں اعتقادی حیثیت سے گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا۔

سلاطینِ خلجیہ کے دَور کا واقعہ ہے۔ سلطان جلال الدین خلجی شہنشاہِ ہند کے جاہ و جلال کا عہد تھا۔ حضرت امیر خسروؔ اس کے خاص معتمد اور حضرت نظام الدین اولیاء کے قلب و نظر میں سمائے ہوئے تھے۔ ایک بار شہنشاہ نے بلا اطلاع حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا۔ حضرت محبوبِ الٰہی بادشاہوں کی ملاقات سے حتی الامکان گریز فرماتے تھے۔ بادشاہ نے حضرت امیر خسروؔ سے معلوم کر لیا کہ حضرت کس وقت مل سکتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی کہ میرے اس ارادہ کی اطلاع خبردار حضرت کو نہ ہونے پائے۔ حضرت امیر خسرو کو اس وقت تو بادشاہ سے وعدہ کرنا پڑا مگر گھر پہنچ کر عقیدت و محبتِ مرشدی نے سخت گیری کی۔ نفسِ لوّامہ نے گرفت کی۔ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بلا خوف بادشاہ کے ارادہ سے مطلع کر دیا چنانچہ آپ وقتِ مقررہ پر دہلی سے باہر تشریف لے گئے اور بادشاہ کو مایوس و دل گرفتہ واپس جانا پڑا۔ دوسرے روز جب امیر خسرو دربار شاہی میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے ان سے سخت باز پرس کی اور پوچھا کہ یہ جرأت تم نے کیسے کی۔ انھوں نے بلا خوف لومۃ لائم صاف صاف کہہ دیا کہ گھر پہنچ کر دل نے ملامت کی کہ پیر و مرشد سے جو بادشاہ حقیقی کا اصل مَظہر و مُظہر ہے کچھ چھپانا ان کی نارضامندی

کا باعث ہوگا جس سے دین و دنیا دونوں کی تباہی اور نقصان ہے۔ بخلاف اس کے ظاہر کر دینے میں صرف آپ کی ناراضگی اور خفگی کا اندیشہ ہے جس سے صرف دنیاوی سزا اور تکالیف جھیلنا پڑیں گی اس لئے میں نے آپ کی خفگی کو بہت آسان سمجھا اور حضرت کو اطلاع کر دی۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عقیدت مند امرار اور درباریوں کی زبان سے جن واقعات کا تذکرہ اپنے معتقد علیہ صوفیار کے سامنے ہوتا تھا ان کی صحت میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں اسی لئے ملفوظات اور تذکرے جس حد تک تاریخی واقعات کا پتہ دیتے ہیں ان کی شہادت بڑی وقیع اور قابل قدر ہے۔

اکابر صوفیائے کرام کے ملفوظات کی بکثرت تعداد دستیاب ہوتی ہے۔ ہم اس وقت ان میں سے صرف چار[1] پر مختصر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک

---

[1] میرے مضمون کا اصل ماخذ مقامات عالیہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار (حصہ اول معروف بہ سلسلۃ العارفین و حصۂ دوم تذکرۃ الصدیقین) ہے۔ یہ شیخ محمد قاضی خلیفۂ خاص حضرت خواجہ صاحب کی تالیف ہے۔ یہ کتاب سمرقند کے شاہی کتب خانہ میں رہی ہے۔ دونوں حصوں پر شاہی کتب خانہ کی مہر ہے ۱۰۵۹ھ پڑھا جاتا ہے۔ سنہ کتابت نہیں درج ہے۔ صفحات ۵۲ سطر ۱۷۔ بخط خفی خوشخط۔

[2] دوسرا ماخذ فقرات خواجہ عبید اللہ احرار ہے۔ صفحات ۱۲۷۔ سطریں ۱۷ بخط خفی خوشخط۔ یہ نسخہ حضرت شیخ محمد معصوم لاہوری خلیفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و شیخ عبید اللہ صدیقی (خالِ کبیر شاہ صاحب) نے اپنے دوست خواجہ محمد امین ولی اللّٰہی کی فرمائش پر شاہ صاحب کے سفرِ حج ۱۱۴۱ھ میں لکھ کر پیش کیا تھا۔

[3] رشحات عین الحیات تالیف علی بن حسین الواعظ الکاشفی المشتہر بالصفی۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

مشہور ومعروف بلکہ سرحلقہ اولیائے عہد بزرگ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار سمرقندیؒ کے فی الوقت
مختصراً چند تاریخی واقعات اور حالات ناظرین کے سامنے پیش کریں جن کو خاص طور پر بادشاہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مالکِ ایں رشحات علی بن محمد نصیر الدین الحسینی الواعظ۔

رباعی ملا جامی در مدحِ "رشحات"

من ناحیۃ الوصال حبت نفحات — فارتاح فؤادنا بشم الفوحات

در وادی ہجر تشنہ لب می مردیم — آمد ز سحاب لطفِ جاناں رشحات ۹۰۹ھ

مہر علی بن محمد نصیر

یہ چھوٹی تقطیع میں ۸۰۸ پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں فہرست بھی درج ہے جس میں صدہا عنوانات قائم کئے ہیں۔ بہت خوشخط اور مطلا ہے۔ یہ نسخہ مولف کتاب کی ملک اور مطالعہ میں بھی رہا ہے جس پر ان کے دستخط اور مہر بھی موجود ہے۔ ان کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا وہ مذکورہ بالا قطعہ تاریخ بھی ہے جو راقم الحروف کی نظر سے اب تک کسی دوسرے مطبوعہ وغیر مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملا۔

؎ رشحات کا دوسرا نسخہ بہت خوشخط و مطلا و محشیٰ بھی ہے اور بہت صحیح ہے یہ بھی یقیناً تاشقند یا سمرقند کے شاہی کتب خانہ کی مِلک تھا جو بعد کو دیگر امراء کے پاس پہنچتا رہا۔ اس نسخہ میں آٹھ عدد مہریں ہیں جن کو سیاہ روشنائی سے مٹایا گیا ہے۔ صرف ایک مُہر پر ۹۱۰ھ پڑھا جاتا ہے یعنی سالِ تصنیف سے ایک سال بعد نام نہیں پڑھا جاتا۔ دوسری مُہر پر نام محمد نود پڑھا جاتا ہے سن نہیں پڑھا جاتا۔ آخری صفحہ پر ختم کتاب کے بعد ایک قرآنی آیت کا عمل کسی دوسرے کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جس کے آخر میں راقم نے لکھا ہے۔ تمت رابع رجب ۹۱۸ھ کتاب کے صفحہ آخر پر دو مہریں اور ہیں وہ بھی سیاہ روشنائی سے مٹادی گئی ہیں۔ جلی قلم سے یہ عبارت ہے۔ "در ۹۲۰ھ دار السلطنت تاشکند" (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اورامرا رکی اصلاح کے لیے اللہ نے مقرر فرمایا تھا۔ ان کی ہی اتباع و پیروی حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے کی۔ انشاء اللہ ان ضخیم ملفوظات کو ایڈٹ کر کے آئندہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔ حضرت کے مفصل حالات، واقعات اور تعلیمات کی مکمل سوانح حیات کی گنجائش اس مضمون میں نہ ہوسکی ہم صرف آپ کی چند ملکی خدمات اور سیاسی اثرات پر یہاں روشنی ڈالنا چاہتے ہیں مگر بہتر ہوگا کہ پہلے ان کی تاریخی حیثیت ناظرین کے سامنے پیش کر دیں تاکہ واقعات کی صحت میں کسی شک کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اس موقعہ پر بھی بغرض تعارف یہ یاد دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ وہی امیر الامراء بزرگ ہیں جن کے نام سے حضرت مولانا جامی نے اپنی بیشتر تصانیف میں حمد و نعت کے بعد ہی ایک عنوان آپ کی منقبت میں قائم کیا ہے اور ۳۵ اشعار صرف "یوسف و زلیخا" میں نظم کیے ہیں جن میں سے ؎

چو فقر اندر قبائے شاہی آمد
بہ تدبیر عبید اللّٰہی آمد

بہت زبان زد ہوا ہے۔ آپ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے طریقتاً جد ہیں۔ تاریخ کی بہت سی کتابوں میں آپ کا تذکرہ ہے۔ بابر نے اپنے چچا سلطان احمد مرزا بادشاہ سمرقند کے حالات میں لکھا ہے کہ "وہ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کے مرید تھے بادشاہ مذکور کو اتنی بڑی سلطنت آپ نے ہی اپنے تصرف و قوتِ باطنی سے عطا فرمائی جس کا دلچسپ و مفصل واقعہ "سلسلۃ العارفین" میں مذکور ہے) اور حضرت کے سامنے نہایت درجہ ادب و احترام

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نیچے کی طرف مٹی ہوئی ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے درتاریخ... ۱۰۲۹ھ در دارالملک کابل بقیمت شش روپیہ خرید شد۔

کا لحاظ رکھتے تھے۔ حضرت کی محفل میں کبھی انھوں نے ایک زانو دوسرے زانو پر نہیں رکھا۔ تمام عمر میں اپنی عادت کے خلاف صرف ایک مرتبہ سلطان احمد بادشاہ حضرت کی محفل میں پیر جوڑ کر مؤدب بیٹھا اس کے واپس جانے کے بعد حضرت کے اشارہ سے اس کی نشست کی جگہ دیکھی گئی تو وہاں ایک بڑی نوک دار ہڈی ملی جس کی وجہ سے مجبوراً سلطان کو خلاف معمول کرنا پڑا۔ وہ دوزانو نہ بیٹھ سکا۔ بادشاہ سلطان احمد کے باپ سلطان ابوسعید مرزا کو بھی حضرت خواجہ سے نہایت عقیدت تھی۔ صاحبؒ "تاریخ حبیب السیر" لکھتے ہیں کہ:

"سلطان ابوسعید کہ در تمشیت امور ملک و ملت پیوستہ با حضرت خواجہ مشورت می کرد و از غایتِ نیازمندی گاہے پیادہ بہ رکابش رفتہ لوازم کمالِ ارادت بجا می آورد۔"

سلطان ابوسعید ملکی اور مذہبی معاملات میں حضرت خواجہ عبیداللہ احرار سے مشورہ کرتا تھا اور نہایت نیازمندی سے آپ کی سواری کے ساتھ پیدل چل کر اپنی کمالِ عقیدت مندی کا ثبوت پیش کرتا تھا۔

اگرچہ شہنشاہ بابر کے بچپن ہی میں حضرت خواجہ صاحبؒ کی وفات ہو چکی تھی لیکن پھر بھی اپنے بزرگوں کے ادب و احترام اور عقیدت کے قدم بہ قدم اس کو بھی آپ سے نہایت درجہ عقیدت تھی۔ شاہانِ مغلیہ سب ہی آپ کے اور آپ کے جانشینوں کے معتقد رہے۔ چنانچہ بابرنامہ میں ۶ر نومبر ۱۵۲۸ء روز جمعہ کے واقعات میں بابر لکھتا ہے کہ "ایک بار میرے جسم میں اس قدر حدت بڑھ گئی تھی کہ میں جمعہ کی نماز بڑی مشکل سے پڑھ سکا تھا۔ ۲۷ر صفر بروز منگل کو میں نے یہ منت مانی کہ حضرت خواجہ عبیداللہ احرارؒ کے رسالہ والدیہ کو نظم کروں اور میں نے دل میں یہ خیال کیا کہ اگر حضرت کی توجہ روحانیت سے مجھ کو صحت ہو گئی تو میں یہ سمجھوں گا کہ یہ میری یہ نظم بارگاہ عبیداللہی میں اسی طرح مقبول ہوئی ہے جیسی صاحبِ قصیدۂ بردہ کی۔ کہ قصیدۂ بردہ کی مقبولیت کے انعام میں

ان کو لقوہ و فالج سے صحت ہوگئی تھی۔ چنانچہ میں نے مولانا جامی کی "سبحۃ الاحرار" کے وزن پر نظم کرنا شروع کردیا۔ گذشتہ سال ایک مہینہ یا چالیس روز گرفتار رہا تھا مگر اس سال خدا کی عنایت اور حضرت کی توجہ سے مجھ کو ۲۹ر صفر روز چہارشنبہ کو چھٹکارا مل گیا۔ صرف معمولی سا کسل باقی رہا۔

(باقی آئندہ)

دعائے صحت

آج کل حضرت قبلہ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ بہت کافی علیل ہیں۔ ان کی علالت تو حضرت مفتی صاحب قبلہؒ کی زندگی کے دوران شروع ہوچکی تھی لیکن حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد معذوری، اضطراب اور دماغی حالت زیادہ پریشان کن ہوتی جاتی ہے۔

قارئین اور اپنے بزرگوں سے اپنی والدہ محترمہ کے صحت یابی اور سکون کے لیے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔

خادم

صاحبزادہ حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

عمید الرحمٰن عثمانی

مسلکِ سُلیمانی

جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب۔ کراچی

ایک ایسے دور میں جو اہلِ کمال علماء و فضلاء کا دور تھا، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے ایک انفرادیت حاصل تھی۔ ان کی ذات میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا عمق اور عبقریت، علامہ ابن قیمؒ کی وسعت اور محتاط فکری حریت اور امام غزالیؒ کی حکمت وللّٰہیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، اسی لیے ان کو سمجھنے اور ان کے مسلک کا واضح تصور حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کوشش میں ضروری ہے کہ نہ تو اپنے ذوق اور رنگِ نظر کو آنے دیا جائے اور نہ تنقید یا توثیق غیر کے خیال کو کوئی اہمیت دی جائے بلکہ ان کو ویسا ہی دیکھا جائے جس انداز سے وہ بزم آراء رہے۔

حضرت علامہ کی شخصیت چونکہ پہلو دار ہے اس لیے ہم اختصار کے ساتھ مگر الگ الگ دیکھیں گے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تصور اور اجتماعیات میں اُن کا مسلک کیا تھا؟

تفسیری مسلک

حضرت علامہ کے نزدیک قرآن پاک کا سب سے یقینی اور صحیح مطلب ومفہوم

صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے متعین ہوتا ہے، اس لیے قرآن فہمی کے لیے بنیادی توجہ حدیث وسنت پر رہنی ضروری ہے، فرماتے ہیں:

"قرآن خدا کا کلام ہے جو ۲۳ برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے ملکِ عرب میں فصیح و تبلیغ عربی زبان میں خدا کے ایک برگزیدہ بندہ پر اترا، اس میں نظریئے بھی تھے اور علمی تعلیم بھی، اُس نے ان نظریوں کو خدا کے بندوں کو سمجھایا اور ان کی عملی تعلیمات کو عملاً کر کے اور برت کے اپنے آس پاس والوں کو دکھایا اور بتایا اور اس لیے کہ وہ اسی کلام کا پہلا مخاطب تھا اور اسی کے ذریعہ اس کلام کا مطلب دوسروں کو سمجھانا تھا، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہی اسلام کے مطلب کو سب سے معتبر سمجھ سکتا تھا اور اسی لئے اس کلام کا جو مطلب سمجھا اور اپنی تعلیم و عمل سے اس نے دوسروں کو جو سمجھایا وہی اس کا صحیح اور بے خطا مطلب اور مفہوم ہے اس لیے قرآن پاک کے سمجھنے کے لیے حاملِ قرآن محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور عملی تفسیر سے بہتر قرآن کی تفسیر کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔"

(معارف ۱۹۳۸ء)

اس کے بعد دوسری چیز زبانِ عربی، اس کے قواعد اور محاورۂ عرب سے پوری پوری آگاہی ہے، جس کے بغیر قرآن پاک کی صحیح تفسیر ممکن نہیں۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں:

"کسی کتاب کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے سب سے اہم چیز اس کتاب کی زبان اور اس زبان کے قواعد کی پیروی ہے۔ یہ کسی طرح

درست نہ ہوگا کہ ہم عقلیت کے جوش میں اس کتاب کے کسی
فقرہ کی تشریح میں اس زبان کی لغت اور قواعد میں ایسا تصرف
کریں جو ہر حیثیت سے ناجائز ہو اور ہمارے اس تصرف کا
منشا صرف اتنا ہو کہ ہم اپنے استبعادِ عقلی کی تسکین کر سکیں۔"

(ایضاً)

اس کے بعد جو بات فرمائی ہے وہ بہت غور سے سننے کی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"حالانکہ استبعادِ عقلی کوئی یکساں چیز نہیں اور نہ وہ خلافِ عقل
کے معنوں میں ہے۔ عقل کی وسعت اور استبعاداتِ عقلی کی
فہرست ہر زمانہ میں گھٹتی اور بڑھتی رہی ہے، اس لیے قرآن پاک
کی تفسیر کا یہ معیار نہیں بنایا جا سکتا۔"

(ایضاً)

اب رہی یہ بات کہ ہر زمانے میں عقلی مسلمات بدلتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے
فکری فضاء بدلتی رہتی ہے اور ہر دور کے لوگ اپنے زمانہ کے موثرات کے تحت ہی کسی
بھی کلام کو سمجھنا چاہتے ہیں، اس لئے قرآن فہمی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ٹھہر سکتی تو اس کا
جواب حضرت علامہ یہ دیتے ہیں:

"فانی انسانوں کے فانی کلام اور جزئی علم رکھنے والوں کے جزئی
علم، اگر ایک زمانہ میں صحیح اور دوسرے زمانہ میں غلط ہو جائیں
تو ایسا ہونا بہت حد تک قرین قیاس ہے، مگر خدائے پاک
کے کلام میں جس کا علم ازل سے ابد تک محیط ہے، اس قسم کا تصور
بھی ذہن میں نہیں لایا جا سکتا، اس لیے اگر مخلص اہل علم اور
نیک نیت علماء اس کلام کی مزید تشریح اپنے زمانہ کے موثرات

کے مطابق اس طرح کرسکیں کہ وہ متکلم کے اصولِ متواترہ ،
مخاطبِ اول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم اور زبان کی لغت و قواعد
کے خلاف نہ ہوں تو ان کی یہ سعی مشکور ہوگی۔ اسی بنا پر
جب سے مسلمانوں میں عقلیات کا رواج ہوا اس نظر سے
قرآن پاک کی تفسیریں لکھی گئیں۔ معتزلہ میں ابومسلم اصفہانی
کی تفسیر اور قاضی عبدالجبار معتزلی کی "تنزیہ القرآن" اور
اہلِ سنت میں امام ابومنصور ماتریدی کی تاویلات اور امام ابن فورک
کی "مشکلات القرآن"، امام محمد غزالی کی "جواہر القرآن" اور سب سے
آخر میں امام فخر رازی کی "تفسیر کبیر" اپنے اپنے زمانہ کے موثرات
کی بہترین ترجمان ہیں۔"

(ایضاً)

"اپنے اپنے زمانہ کے موثرات کی بہترین ترجمان" کا جملہ خوب ذہن نشین رہے کیونکہ اسی بنیاد پر علامہ مرحوم آخرِ حیات تک یہی فرماتے تھے کہ قرآن کی "بہترین" تفسیر کسی بھی تفسیر کو قرار نہیں دیا جاسکتا، یہی جواب انھوں نے عین مرض وفات میں، اس وقت کے سفیر شام متعینہ پاکستان کو بھی دیا تھا جب سفیر صاحب نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ قرآن پاک کی سب سے اچھی تفسیر کونسی ہے؟

حضرت علامہ کے تفسیری مسلک کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ وہ الفاظِ قرآنی کے مرادِ ظاہری سے عدول کو روا نہیں رکھتے تھے۔ میرے استاذ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رح کو قرآنی آیات سے اعتبارات، صوفیانہ نکات اور آیات کے نتائج قیاسی نکالنے کا خاص ذوق تھا اور اس کے اثر سے اس عاجز کی طبیعت بھی اس نہج کے نکتوں اور چٹکلوں کو پڑھ کر جھوم جاتی ہے

مگر جب جب ایسی کوئی بات میں نے حضرت علامہ سے نقل کی تو سختی سے متنبہ فرمایا کہ الفاظِ قرآنی کے "ظاہر مراد" سے عدول نہ ہونا چاہیئے، نیز خود قرآنی مراد کو معلوم کرنے کے لیئے ایک ہی لفظ کے جتنے استعمالات قرآن پاک میں آئے ہیں، اُن سب کا احاطہ کر کے اس کی مراد کو متعین کرنا چاہیئے مثلاً قرآن پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہتا ہے، تو اب دیکھنا چاہیئے کہ لفظ "خاتم" قرآن پاک میں کس کس معنی میں بولا گیا ہے تاکہ ختمِ نبوت کا قرآنی مفہوم متعین ہو سکے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو یہ لفظ یا تو اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ باہر کی چیز اندر نہ جا سکے جیسے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (یعنی رسول کی بات دل میں نہیں جا سکتی) یا پھر اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ اندر کی چیز باہر نہ نکل سکے جیسے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ (یعنی حشر کے دن کافروں کے دل کی کوئی بات منہ سے باہر نہ نکل سکے گی)۔ یا پھر یہ لفظ ان دونوں معنوں کی یکجائی کے ساتھ بولا گیا ہے جیسے وَخِتَامُهٗ مِسْكٌ (یعنی جنتیوں کو جو شراب کی بوتل ملے گی اس پر مشک کا خِتام ہو گا جو اس بات کی ضمانت ہو گی کہ اس بوتل کو اس طرح بند کر دیا گیا ہے کہ اب اس میں سے نہ تو اندر کی چیز باہر آ سکتی ہے نہ باہر سے کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو سکتی ہے)۔ بس ان تین استعمالات کے سوا لفظ "خاتم" کا کوئی اور استعمال قرآن پاک میں نہیں ملتا، اس لیئے "خاتم النبیین" کا قرآنی مفہوم صاف یہ نکل آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی میں نبیوں کے "خاتم" بنائے گئے ہیں کہ آپ سے پہلے جو زمرۂ نبوت میں داخل ہو چکے ان میں سے کوئی بھی اب زمرۂ نبوت سے خارج نہیں ہو سکتا اور آپ کے بعد باہر سے اب کوئی اس زمرۂ مقدس میں داخل نہیں ہو سکتا۔

سبحان اللہ! یہ ہے فہمِ قرآن اور ففہمنا سلیمان کا تازہ اعجاز۔ اور یہ تو

ایک مثال ہے، سیرت النبی کی ضخیم مجلدات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو علامۂ فہامہ کا یہ مسلک و ذوق تفسیری جگہ جگہ نمایاں نظر آئے گا۔ ع

تو حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اب ایک آخری بات تفسیری مسلک کے سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ "متشابہاتِ قرآنی" کے بارے میں حضرت علامہ کا مسلک قدمائے اہل سنت والجماعۃ والا مسلک تھا کہ خدا کی ذات وصفات اور دیگر عقائد کے متعلق قرآن پاک نے جو کچھ بیان کیا ہے یا پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ تواتر جو کچھ ثابت ہے اس پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی عقل و قیاس اور استنباط سے اس کی تشریح کرنا صحیح نہیں، گویا حضرت علامہ کے نزدیک وَمَا يَعْلَمُ تَاوِيلَهُ اِلَّا اللّٰهُ (اس کا منشاء و مفہوم خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا) ایک حقیقتِ اعتقادیہ ہے جس سے یہ مسلک بنا کہ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا یعنی جو پختہ علم ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ بس ہم اس پر ایمان لائے کہ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے — بالفاظِ دیگر متشابہات کے معاملہ میں حضرت علامہ تشبیہ کے قائل تھے مگر تنزیہہ کے ساتھ — وہ یَدْ — قَدَم — اِسْتَوٰی وغیرہ کی کوئی تاویل نہیں فرماتے تھے مگر ان میں کی ہر حقیقت کو لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کے وصف سے متصف جان کر ہر تشبیہ کو تصور انسانی سے پاک اور رسائیِ فہم سے وریٰ الوریٰ سمجھتے تھے۔

حدیثی مسلک

قرآن پاک کے بعد دین کی دوسری اہم اصل حدیثِ نبوی ہے۔ قرآن و حدیث کے باہمی ربط اور نزاکتِ ارتباط کو حضرت علامہ نے ایک وجد آفریں جملہ میں یوں ادا فرمایا ہے:

علمِ قرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علمِ حدیث

شہ رگ کی، یہ شہ رگ اسلامی علوم کے اعضاء وجوارح تک
خون پہنچا کر ہر آن اُن کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا
رہتا ہے۔"

(تعارف — تدوین حدیث از مولانا گیلانیؒ)

حدیث پڑھنے پڑھانے والے علماء بحمد اللہ ہر دور میں بہت رہے ہیں اور رہیں گے مگر جو خود محدثانہ مزاج اور رنگ سنت کا مرقع ہوں ایسے محدث خال خال ہی ملیں گے۔ حضرت علامہ اسی منتخب فہرست کے فرد فرید تھے، ان کی تاریخ دانی کا شہرہ خود ہی ان کے مفسرانہ اور محدثانہ کمالات کا حجاب بنا ہوا تھا، اس پر اداراتی تعصب نے ان کے معاصرین کے ہاتھوں اس کو ایک دیوار بنا کر کھڑا کر دیا، ورنہ سیرۃ النبی خصوصاً اس کی جلد سوم، سیرتِ عائشہ اور خطبات مدراس کا ایک غیر جانبدار پڑھنے والا اور فن حدیث کا واقف کار علامہ کے جلیل القدر محدث اور ماہرِ فنِ رجال ہونے کا انکار کیسے کرسکتا ہے! حضرت علامہ محدث تھے اور ان کا حدیثی مسلک احتیاط اور حزم محدثانہ پر مبنی تھا، — وہ اس وقت بھی اس معاملہ میں سخت تھے جب باضابطہ حلقہ طریقت میں داخل نہیں ہوئے تھے اور اُس وقت بھی ویسے ہی مستحکم رہے جب وہ شیخ طریقت مانے گئے — اکثر صوفیاء کرام اپنے ذوق یا وجدان کے سہارے بعض مقولوں کو حدیث کے عنوان سے بیان کرتے ہیں، اِدھر حضرات علماء اپنے موضوعہ اصول کی بنا پر "فضائل" میں توسیع اختیار کر کے ضعیف ترین احادیث کو اپنی تصانیف میں فراخی کے ساتھ شامل رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے، مگر حضرت علامہ کا مسلک کسی پہلو سے بھی ان گنجائشوں کا متحمل نہیں تھا۔ وہ فرماتے تھے اور اس وقت ان پر خوف چھا جاتا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر کہ من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ

مقعدہ من النار (بخاری) (یعنی جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرلے) میرا دل لرز جاتا ہے کہ مبادا کوئی قول ایسا حضورؐ کی طرف منسوب ہوجائے جو آپ نے نہ فرمایا ہو اور اس کی وجہ سے اس وعید کا مورد بننا پڑے ــــ راقم الحروف نے حضرت علامہ کا منشا یہ سمجھا کہ حزم و احتیاط کے سبب کوئی ارشادِ نبوی نقل سے رہ جائے تو اس پر کوئی عتاب وعقاب کا اندیشہ نہیں، مگر غلط انتساب سے تو جہنم مول لینا ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ اسی لیے دیکھا اور بارہا دیکھا کہ قبولِ حدیث میں علامہ نے کبھی عرفی دباؤ بھی قبول نہیں فرمایا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مولوی صاحب نے حضرت علامہ سے سوال کیا کہ کیا اقطاب و ابدال کا موجود ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے؟ علامہ نے فرمایا کہ نہیں، البتہ بہ کثرت بزرگوں کی کشفی تصدیقات ملتی ہیں اور وہ کافی ہیں۔ اس پر انھوں نے تعجب سے مکرر عرض کیا کہ احادیث میں بھی اس کا ذکر نہیں؟ حضرت علامہ نے اپنی طبعی نرم مزاجی سے دوبارہ فرمایا "جی نہیں، کوئی صحیح اور قوی حدیث ایسی نہیں ملتی ــــ" اس پر ان مولوی صاحب نے دباؤ ڈالنے کے لیے یہ کہہ دیا کہ حضرت مولانا تھانویؒ (جو حضرت علامہ کے پیر طریقت تھے) نے تو تعلیم الدین میں تائیدی حدیثیں تحریر فرمائی ہیں، حضرت علامہ کو ان کا یہ غیر عالمانہ طرز ناگوار ہوا اور قدرے چیں بہ جبیں ہوکر فرمایا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے میں نے تو نہیں لکھا، آپ مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہتے ہیں! ــــ پھر جب یہ صاحب چلے گئے تو احقر کو مخاطب کرکے یہی فرمایا کہ میں کیا کروں، میرا تو دل لرز جاتا ہے کہ کوئی قول حضور کی جانب ایسا منسوب ہو جو آپ کا ارشاد نہ ہو۔

اقطاب و ابدال والی بات تو خیر ایسی اہمیت کی نہیں مگر "ظہور مہدی" کے بارے میں تو ہمارے عام محدثین حتیٰ کہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تک کئی حدیثیں اپنے رسالہ آثار قیامت وغیرہ میں تحریر فرمائی ہیں، مگر حضرت علامہ نے اپنے

مسلک احتیاط کی بنا پر یہاں بھی بہ تمام ادب ان اکابر سے الگ ہو رہنا ہی گوارا فرمایا۔
میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے "ظہورِ مہدی" سے متعلقہ حدیثی روایات کے بارے میں علامہ سے دریافت کیا تو علامہ نے صاف فرما دیا کہ ان روایات میں ایک روایت بھی مجھے ایسی نہیں ملی جس میں کوئی نہ کوئی راوی شیعی نہ آگیا ہو اس لیے یہ راویات ساقط الاعتبار ہیں۔

جہاں تک درس و تعلیم حدیث کا تعلق ہے میں نے یہ بات بہ صراحت حضرت علامہ سے پوچھی تھی کہ کتبِ احادیث تو سب وہی ہیں پھر فلاں اور فلاں مدرسہ کی تعلیم حدیث میں فرق کیا ہے؟ فرمایا کہ فلاں مدرسہ میں تو حدیث کو حدیث کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے اور فلاں مدرسہ میں حدیث کو حنفی کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ حضرت علامہ یہ چاہتے تھے کہ حدیث پڑھاتے وقت کسی بھی فقہی مذہب کے تحفظِ ذہنی کے بغیر اقوالِ نبوی کے منشاء کو پانے کی کوشش کرنی چاہیئے، درس حدیث میں اس بات کی طرف التفات نہ رہنا چاہیئے کہ کس حدیث سے کس فقہی مذہب کی تائید ہو رہی ہے اور کونسی روایت کس کے خلاف جارہی ہے —— یہ کام تو فقہ کے درس میں کرنے کا ہے۔

رہی بات ادب و تعظیم حدیث کی، اس کا اندازہ ایک چھوٹے سے واقعہ سے لگائیے۔ ایک مرتبہ حضرت علامہ کی مجلس میں ایک صاحب نے بالکل موضوع حدیث نقل کر دی، میں بے صبری سے کہہ پڑا کہ یہ "حدیث غلط" ہے حالانکہ وہ حضرت علامہ سے مخاطب تھے اور پھر حضرت علامہ ہی نے انھیں سلیقہ سے غلطی پر متنبہ فرمایا۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو علامہ ہی نے اس ادب ناشناس کو مخاطب کر کے نہایت نرمی سے فرمایا کہ "روایت غلط سہی انتسابی نسبت کا احترام تو ضروری ہے، ایسے موقع پر توقف کر کے یوں کہنا چاہیئے کہ حضورؐ کا یہ ارشاد نہیں یا حضور کا ارشاد

ایسا نہیں ہے ـــــــ اللہ اکبر، کیا پاسِ ادب ہے !!

فقہی مسلک

حضرت علامہ کے فقہی مسلک کے بارے میں اہل علم مختلف نظر آتے ہیں، بعضے ان کو غیر مقلد سمجھتے ہیں اور بعضے مقلد۔ جو غیر مقلد سمجھتے ہیں وہ اس لیے ہے کہ علامہ کی تحریروں میں جامد تقلیدی رنگ نظر نہیں آتا اور جو ان کو مقلد خیال کرتے ہیں وہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے علامہ کو ہمیشہ حنفی طرز پر نماز پڑھتے دیکھا یا تقلید کے خلاف ان کے قلم یا زبان سے کوئی بات نہیں سنی، مجھ بے استحقاق کو بحمد اللہ حضرت علامہ کے قرب وصحبت کی سعادت حاصل رہی ہے اور ان کی تصانیف کو بغور دیکھا ہے اس لیے صحیح صورتِ حال سے یقینی آگاہی ہے اور وہ یہ ہے کہ علامہ مقلد ہی تھے مگر ان کا تقلیدی رنگ وہ تھا جو دورِ تابعین کے بعد سے اسلام کی چوتھی صدی کے ختم تک رہا کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ عوام تک کسی خاص شخص کی فقہ کے پابند نہ تھے اور خواص کا طرز تقلید یہ تھا کہ:

> "اُن کو کسی مسئلہ میں کسی اور چیز کی حاجت نہیں رہتی تھی اور ان کے پاس بہت سی احادیثِ مستفیضہ تھیں جن پر بعض فقہاء عمل کر چکے تھے ...... اگر تعارضِ نقل اور وجہِ ترجیح ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے کسی مسئلہ میں ان کا دل مطمئن نہ ہوتا تھا تو گذشتہ فقہاء میں سے کسی کے کلام کی طرف رجوع کر لیا کرتے تھے اور اگر اس مسئلہ میں فقہاء کے دو قول ان کو ملتے تو ان میں سے جو زیادہ قابل اعتماد ہوتا اس کو وہ اختیار کرتے تھے خواہ وہ قول اہل مدینہ کا ہو یا اہلِ کوفہ کا۔" (حجۃ اللہ البالغہ ـــ جلد اول ـــ باب حکایۃ حال الناس قبل المائۃ الرابعۃ وبعدھا)

چنانچہ حضرت علامہؒ نے "تراجم علمائے اہلِ حدیث" مولفۂ ابویحییٰ امام خاں نوشہری پر جو مقدمہ تحریر فرمایا ہے اس میں اپنی بابت رقم طراز ہیں:

"میں سنت کا پیرو اور توحیدِ خالص کا معتقد ہوں، سنت کو دلیلِ راہ مانتا ہوں اور علماء کے لیے اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے کھلا جانتا ہوں اور حق کو ائمۂ سلف میں سے کسی ایک میں منحصر نہیں جانتا۔ اس پر آپ مجھے جو چاہیں سمجھیں۔"

یہ تحریر ۱۳ صفر ۱۳۵۷ھ کی ہے اور علامہ کا سنِ وفات ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ تھا، گویا وفات سے تقریباً پندرہ برس قبل کا یہ اظہار ہے۔ مگر اس سے واضح تر تحریر جو اپنے مسلکِ فقہی کی صراحت ہی کے لیے علامہ نے لکھی تھی وہ ۱۲ شعبان ۱۳۴۸ھ کے اُس مکتوب میں ملتی ہے جو انھوں نے حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام تحریر فرمایا تھا، وہ یہ ہے:

"فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں مگر اہل حدیث بالمعنی المتعارف نہیں ہوں۔ ائمہ رحمہم اللہ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیتہً اُن سے عدول، حق نہیں سمجھتا۔"

(تذکرہ سلیمان صفحہ ۸۹)

اس توضیح کے بعد علامہ کے فقہی مسلک میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ رہی یہ بات کہ یہ مسلک اور اہلِ نظر کی نگاہ میں، علامہ جیسے صاحبِ خبر و نظر کے لیے کیسا ہے؟ تو اس کے لیے حضرت مولانا تھانویؒ کی تصدیق ملاحظہ ہو، حضرت ممدوح کی جوابی تحریر ہے:

"جناب نے جو بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرما دیا اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا، دو وجہ سے،

ایک صدق و خلوص پر، دال ہونے سے، دوسرے خود مسلک کے
پاکیزہ ہونے سے، تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے، کسی جزئی تفاوت
سے حقیقت نہیں بدلتی صرف رنگ بدلتا ہے چنانچہ اس احقر پر
.... دوسرا رنگ ہے کہ میں بوجہ اپنی قلتِ روایت و درایت کے
متاخرین کا بھی متبع ہوں۔"

(ایضاً)

غرض گو اکثر امور میں حضرت علامہ حنفی مذہب ہی کے پیرو تھے۔ رفع یدین نہیں کرتے تھے، تراویح میں بیس رکعت کا التزام تھا مگر ساتھ ہی قرأت فاتحہ خلف الامام اور ناگزیر صورت میں جمع بین الصلاتین پر بھی ان کا عمل تھا۔ اسی طرح فتویٰ لکھنے میں بھی شد و مد سے ایک مسلک کے پابند نہ تھے۔ اس سلسلے کا ایک چشم دید دلچسپ واقعہ سنیے اور اس سے حکمت سلیمانی کا اندازہ لگائیے۔ ایک انگریز میاں بیوی مشرف بہ اسلام ہوئے، چند ہی دنوں میں آپس کی ناچاقی میں شوہر نے بیوی سے ایسے کلمات کہہ ڈالے کہ مذہب حنفی کی رو سے طلاقِ مغلظہ واقع ہوگئی۔ یہ ماجرا ان کے ایک مسلمان دوستِ عزیز نے سنا تو انھوں نے شوہر سے کہا کہ تمہارا تو نکاح ہی فسق ہوگیا۔ اب نومسلم میاں بیوی بھی پریشان اور ان کے دوست بھی حیران۔ احتیاطاً ان دوست نے بعض معتبر مفتیوں سے رجوع کیا مگر جواب ہر جگہ سے طلاق قطعی ہی کا ملا، پھر وہ حضرت علامہ کی خدمت میں آئے، سارا ماجرا سنایا، علامہ نے فرمایا کہ بھئی مفتی صاحب (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ؒ) سے پوچھئے، انھوں نے عرض کیا کہ وہاں سے تو یہی جواب ملا۔ علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا تو آپ کا جی کیا چاہتا ہے کہ جواب برعکس ملے؟ اس پر وہ چپ ہو رہے، تب علامہ نے ان سے فرمایا کہ آپ ایک استفتاء لکھ کر کل مفتی صاحب کے سالانہ جلسہ میں لائیے، مجھے جو کچھ لکھنا ہے میں وہیں لکھ دوں گا۔ چنانچہ دوسرے

روز جلسہ جب ختم ہوا اور مخصوص علماء ــــ جن میں حضرت مفتی محمد حسن امرتسری، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اور خود حضرت میزبان ممتاز ترین تھے ـ چائے نوشی کے لیے ایک کمرہ میں بیٹھ گئے تو علامہ نے ایک صاحب سے استفتاء لے کر ایک ایک کو دکھلایا، متفقہ جواب یہ تھا کہ "طلاق واقع ہوگئی۔" پھر حضرت علامہ نے اپنے قلم سے اس پر یہ فتویٰ تحریر فرمایا کہ "اہل سنت والجماعۃ میں مسلکِ اہل حدیث کی رو سے طلاق واقع نہیں ہوئی رجوع کرا دیا جائے ــــ (لفظی تعبیر ممکن ہے، غالب یادداشت یہی ہے) پھر علمائے کرام کو یہ جواب دکھاتے ہوئے فرمایا کہ وہ نومسلم بیچارے تو ابھی نہ حنفی ہیں اور نہ شافعی، لہذا قانون میں کوئی گنجائش بھی نکلتی ہو تو اس کا فائدہ انھیں ملنا چاہیئے ــــ اس پر حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برملا فرمایا کہ یہ جواب حضرت ہی لکھ سکتے تھے ہم چونکہ فقہ حنفی کے مفتی ہیں اس لیے نہیں لکھ سکتے ـ پھر مفتیٔ اعظم پاکستانؒ نے بھی اس قول کی تائید فرمائی ـ

ایک اور بات ـ اکثر فقہاء نے مدات زکوٰۃ والی آیت اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ الخ میں فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ سے مراد جہاد بالسیف لیا ہے اور للفقراء کے لام کو لام تملیک قرار دیا ہے، حضرت علامہ کے نزدیک یہ تحدیدات درست نہیں ـ فی سبیل اللہ میں ہر دینی کام شامل ہو سکتا ہے اور للفقراء کے لام کو لامِ انتفاع لینا چاہیئے، سیرۃ النبی جلد پنجم میں اس مقام پر یہ بصیرت افروز حاشیہ سپردِ قلم فرمایا ہے:

"اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، ابھی آیت گذر چکی ہے لِلْفُقَرَاءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اس سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے ـ اکثر فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملک بنانا ضروری

ہے مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت
کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لامِ انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَکُمْ
مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔"

علامہ کی یہ توضیح فرنگی دورِ غلامی میں چاہے ہمارے علماء کے لیے ناقابل اعتنا نہ رہی ہو مگر آج پاکستان میں ترویجِ زکوٰۃ کے مرحلہ پر اس کی اہمیت اور افادیت پر اگر توجہ نہ دی گئی تو محض ایک روایتی تعبیر پر اصرار کی وجہ سے صرف زکوٰۃ کا دائرہ اپنے ہاتھوں آپ محدود ہو کر رہ جائے گا اور دوسری طرف اہل مدارس کی چلائی ہوئی "حیلہ تملیک" کی قباحت کو قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

صوفیانہ مسلک

حضرت علامہ کا گھرانہ خانوادۂ نقشبندیہ سے منسلک تھا اور خود علامہ کی ابتدائی روحانی تربیت ان کے برادر بزرگ سید ابوحبیب رحمۃ اللہ کے زیر اثر ہوئی تھی جو قطبِ وقت شاہ ابواحمد بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور ذوق اتباع سنت میں مثال تھے۔ لازماً اتباعِ سنت کا یہی نکھرا ہوا ذوق علامہ کے قلب و دماغ نے بھی قبول کیا۔ دوسری طرف علامہ شبلی نعمانی رح نے اپنے اس جواں عمر شاگردِ عزیز کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمایا کہ بقول حضرت سلیمان رح:

"اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی بہ شکل وصیت سرورِ کائنات
فخرِ موجودات، رحمتِ عالم، سیدِ اولادِ آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی سرکار اقدس میں، جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے،
سب سے اول پہنچایا۔"

(حیات شبلی)

راست اتباع نبوی کا یہ ذوق متوجہ بہ تصوف ہو کر اور زیادہ تیز ہو گیا تھا، اس کا اظہار

اپنے پہلے عریضہ میں مرشد تھانویؒ سے ان الفاظ میں کیا ہے :

"امام ربانی مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے سلسلہ سے عقیدتِ تامہ رکھتا ہوں، خرافات وطامات صوفیہ کا دل سے منکر ہوں۔ صالح نہیں لیکن صلاحِ حال کا دل سے دل سے خواستگار ہوں۔ (تذکرۂ سلیمان۔ صفحہ ۸۹)

حضرت اقدس تھانوی نے اپنے درمیانی جملہ کی بابت اپنے رنگ کا اظہار یوں فرمایا کہ :
"صوفیہ کے احوال و اقوال کو محتملِ تاویل سمجھتا ہوں الا من تحقق بطلانھم بالقطع" (ایضاً)

بہرحال اس نقشبندی جوہر کا چشتی اشرفی بھٹی کی آگ میں پھنک کر جو کشتہ تیار ہوا تو اس میں ایک انفرادیت اور صوفیانہ مسلک کا وہ نکھار پیدا ہوا کہ وہ ٹھیک سلف اولین والی جلا سے مجلّٰی ہو گئے۔ حضرت علامہ کے مسلکِ احسانی کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں :

(ا) وحدت الوجود ہو کہ وحدت الشہود، ان میں سے کوئی چیز مدارِ طریق نہیں، بعض حال کا درجہ رکھتے ہیں (جیسے وحدت الوجود و شہود) اور بعض محض افلاطونی فلسفہ کی متبدل شکلیں ہیں (جیسے تنزلات ستہ) لہٰذا ان کی طرف توجہ نہ ہونی چاہیئے۔

(ب) صرف توحید تنزیہی مطلوب ہے۔ تشبیہ کا انکار نہ ہو مگر تشبیہ میں بھی تنزیہہ کا اقرار رہے (کہ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ)

(ج) توحید افعالی پر تمام تر توجہ مرکوز رہنی چاہیئے، قرآن پاک نے سارا زور توحید افعالی پر دیا ہے۔ یہی توحید ذاتی تک رسائی کا محفوظ زینہ ہے۔

(د) کثرتِ وظائف و اوراد کے بجائے ہر عمل میں اتباعِ سنت اور ہر عمل سے متعلق ادعیۂ ماثورہ پر توجہ مرکوز رہے، اسی سے وصول الی اللہ حاصل ہوتا ہے۔

(ہ) مصطلحاتِ صوفیانہ سے گریز اور قرآنی و حدیثی اصطلاحات پر اکتفا رہے۔ (جیسے خشوع، خضوع، تقویٰ، خشیت، ذکر، فکر، احسان وغیرہ)

(و) ساری توجہ لطیفۂ قلب پر مرکوز رہے کہ یہی قرآن و حدیث میں مذکور ہے اور ذکر فکر مع الحضور کی کثرت سے رسوخ اور دوامِ حضور حاصل کیا جائے۔

(ز) محاسبۂ نفس کی ہمہ وقتی مشق اور اہتمام تادم آخر قائم رہے۔

اب آخری بات جو تصحیح فہم کے نقطۂ نظر سے اولین اہمیت کی چیز ہے کہ حاصلِ تصوف کیا ہے؟ اس کو خود حضرت علامہ کی زبانِ عارفانہ میں سنئے، اپنے شاگرد عزیز مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو ایک والا نامہ میں تحریر فرما رہے ہیں:

(ح) "ہر عمل میں طلبِ رضا کا شعور پیدا ہونا یہی اس طریق کا حاصل ہے اور جب خدا اور بندے کے درمیان یہ علاقہ استوار ہو جاتا ہے تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو "نسبت" کہتے ہیں اور قرآن پاک کی زبان میں اس کی تعبیر یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ اور رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کے لفظوں میں کی گئی ہے یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔ انہی کے لیے نویدِ بشارت ہے۔"

(مکاتیب سلیمانی مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی)

اجتماعیاتی مسلک

سب جانتے ہیں کہ حضرت علامہ خالص علمی و تحقیقاتی کاموں کے لیے جوانی ہی سے خود کو وقف فرما چکے تھے، ان کی اسی فنائیت علمی کا ثمرہ ہے کہ ان کی حیات ہی میں دار المصنفین کا شہرہ چار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا۔ اس کے باوجود دیدۂ بینا والا یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کے اولین اجلاس میں بمبئی میں اور پھر اس کے دوسرے اجلاس منعقدہ دہلی میں شریک ہیں، ۱۹۱۷ء میں مجلس علمائے بنگالہ منعقدہ کلکتہ کی صدارت فرما رہے ہیں، ۱۹۲۰ء میں وفدِ خلافت میں علمائے ہند کی تنہا نمائندگی یورپ میں فرما رہے ہیں، ۱۹۲۳ء میں صوبۂ بہار کی خلافت کانفرنس کے اجلاس میں کرسئ صدارت کو زینت بخشے ہوئے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں حجاز اور مصر پہنچکر ابن سعود اور شریف حسین میں کامیاب مصالحت کرا رہے ہیں، ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ العلمائے ہند کے تاریخی سالانہ اجلاس، منعقدہ کلکتہ کی زمام صدارت ہاتھ میں لیے علماء کرام کو سمت عمل کی صحیح نشان دہی فرما رہے ہیں۔ ادھر الہلال کی ضیا پاشیوں میں نور کی کتنی تابناکیاں ہیں جو اسی آفتابِ علم کی رہین منت ہیں۔ پھر تحریکِ پاکستان کے بھونچالی دور میں وہی صاحب نظر ہے جو بظاہر الگ تھلگ مگر خاموشی سے "اسلام کا سیاسی نظام" اپنی نگرانی میں مرتب کروا کے لیگیوں کے حوالے کر رہا ہے۔ پھر جب پاکستان بن چکا تو اس کی دعوت پر ۱۹۵۰ء میں یہاں آکر علامہ ہی کی فعالیت ہے جو مراحلِ دستور سازی اور تشکیل قانون اسلامی میں کارفرما نظر آتی ہے۔ دوسری سمت دیکھئے تو وہی بالواسطہ دھیمے دھیمے جماعتِ اسلامی کی ہائی کمان کو جادۂ حق پر لانے کی حکیمانہ کوشش فرما رہے ہیں، کبھی دیکھئے تو وہی ہیں جو شانِ فقرائے تبلیغی جماعت کے اجتماعات میں نم دیدہ دست بہ دعا دکھائی دے رہے ہیں اور زعمائے تبلیغ وسعتِ فکر و عمل کی وصیت کر رہے

ہیں ــــ غرض خلوت پسندی اور اجتماعی جدوجہد میں عجیب دلکش و دلفریب ربط پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یہی حضرت علامہ کے اجتماعی مسلک کا امتیاز ہے جو دراصل قرآن پاک کی دو آیات پر اپنی اساس قائم کئے ہوئے تھا، ایک تو

(۱) وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ (یعنی ہر تقویٰ اور نیکی کے معاملہ سے تعاون)

اور دوسرے

(۲) لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (یعنی اپنی خدمات میں مخلوق کی طرف سے جزا یا قدر دانی کے صلہ سے بے نیازی)

اسی لیے حضرت علامہ کے مسلکِ اجتماعی میں بڑی ہمہ گیری تھی، ان کا اجتماعیاتی مسلک آویزش و محاذ آرائی کی تلخیوں سے پاک، منصب و جاہ کی حرص اور نمود و شہرت کی نفسانی خواہشات سے منزہ تھا۔ یہاں کسی خاص جماعت میں نہ انضمام تھا نہ کسی سے انقطاع بلکہ انضمام و انقطاع کے درمیان "بے غرض تعاون" تھا جو صرف امتِ محمدیہ سے محبت اور اس کی دل سوزی کے محرکات اور صرف رضائے الٰہی کی طلب کے اضطراب قلبی کا نتیجہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی ہزار رحمتیں اور پیہم نوازشیں ہوں ایسے پاکیزہ مسلک سید الملّت والدّین حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (قدس سرہٗ) کی روحِ پرفتوح پر۔

لغات کی تحقیق

مولانا حفیظ الرحمٰن واصف

راقم الحروف نے ایک کتاب بنام "اردو مصدر نامہ" چند سال قبل تالیف کی تھی۔ اس کے بعد دوسری کتاب بنام "ادبی بھول بھلیاں" شائع ہوئی۔ یہ دوسری کتاب رشید حسن خاں کی تالیفات "اردو املا" اور "زبان و قواعد" پر تنقید تھی۔ میں حیران و متعجب تھا کہ اردو زبان اور رسم الخط پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور کوئی مدافعت نہیں کرتا اور میں نے مدافعت کی نیت سے جو کاوش کی ہے اس کی کوئی تائید نہیں کرتا۔ کیا واقعی اب اس زبان میں اور اس کے رسم الخط میں ایک دم عیب ہی عیب پیدا ہو گئے۔ اپنے بیگانے سب ہی اس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ کوئی بناؤ سنگار کے بہانے اس کے ناک کان کترتا ہے۔ کوئی اس کے خم دار ناخن اور ٹیڑھی چونچ دیکھ کر ترس کھاتا ہے اور نوکیں کاٹتا ہے۔ کوئی نظر بد سے بچانے کے لیے اس کے اوپر کالک چڑھا دیتا ہے۔ کوئی چھڑی سے اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ غرضکہ اردو کے لیے یہ بڑا آزمائشی دور ہے۔

اس زبان میں لغات کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود نئے نئے الفاظ اور مکروہ تراکیب ایجاد کی جارہی ہیں۔ فصاحت تو ایک بے معنی لفظ ہو کر

رہ گیا ہے۔ ڈیزائنر اس کے رسم الخط پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ قدیم املا میں بھی عیوب ہی عیوب تھے اس کی بھی اصلاح کی جا رہی ہے۔ وہ حروف جو اردو املا کا جزو لاینفک تھے ان کے بارے میں بڑی جرأت سے کہا جا رہا ہے کہ مردہ لاشیں ہیں جو اردو رسم الخط محض اس لیے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے کہ عربی سے اس کا لسانی رشتہ قائم رہے۔ ٹھیک ہے آپ لسانی رشتہ قائم نہ رکھیے۔ مگر کوئی نہ کوئی رشتہ تو رہے گا۔ اب عرب ممالک سے جو نیا رشتہ قائم ہوا ہے اس سے کیونکر انکار کیا جائے گا اور اس نئے رشتے کے لیے لسانی رشتہ کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت پڑ رہی ہے۔

ابھی فروری ۱۹۸۴ء میں مجھے دو کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک "زبان و لغت" دوسری "اردو املا اور اس کی اصلاح" یہ دونوں کتابیں ڈاکٹر ابو محمد سحر پروفیسر و صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدیہ کالج بھوپال کی تصانیف ہیں۔ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ایک فقیرِ بے نوا کا کوئی ہمنوا تو ظاہر ہوا۔ انتہائے اشتیاق میں سرسری طور پر ایک ہی نشست میں سب دیکھ ڈالیں۔ خوشی ہوئی کہ بڑی حد تک انھوں نے وہی کہا ہے جو میں چاہتا تھا۔

بے شک ایک مستند لغت کی ضرورت ہے۔ ابھی تو باڑ بندھ رہی ہے۔ یہ باڑ کب بندھ چکے گی اور کب لغت نویسی کا کام شروع ہوگا؟ اور کیا ہم جیسے مشتاق عمر رسیدہ طلبہ کو اپنی زندگی میں اس سے استفادہ کا موقع مل جائے گا؟ کیا ان تجاویز کا حشر سیاسی تجاویز جیسا تو نہیں ہوگا؟ کیا یہ کھلونا دے کر بہلانے کی بات تو نہیں ہے؟ اس قسم کے متعدد سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ جواب تو وقت ہی دے گا۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ حکومت اردو کے لیے کتنا روپیہ خرچ کر رہی ہے

اور اس کے نتیجے میں صالح ادب سطح پر ابھر رہا ہے یا فاسد ؟ ہمیں تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

بہر حال سحر صاحب کی دونوں کتابوں کی تالیف میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ قابل تحسین ہے۔ میری ناچیز تالیف کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے نگاہِ جوہر شناس سے دیکھا ہے اور عزت افزائی کی ہے وہ بھی موجب ممنونیت ہے۔

ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کے تمام مندرجات سے بالاستیعاب مجھے اتفاق نہ ہو لیکن مجموعی طور پر ان کی سعی مشکور ہے۔ کتابوں کے سرسری مطالعہ کے بعد خود بھی کچھ لکھنے کو جی چاہا۔ جو کچھ قلم برداشتہ ضبط تحریر میں آیا وہ درج ذیل ہے:

پروفیسر صاحب نے اُن اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے جو آثر لکھنوی نے "سرمایۂ زبان اردو" اور "نور اللغات" کے بعض مندرجات پر وارد کیے ہیں۔ اور اعتراض اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہیں لیکن بعض مقامات پر راقم الحروف کو ان کی رائے کے ماننے میں تامل ہے۔

(۱)

نور اللغات میں ایک محاورہ لکھا ہے۔ زار و نزار رونا۔ معنی لکھے ہیں زار زار رونا، زار و قطار رونا، بہت رونا، سند میں جان صاحب کا شعر لکھا ہے:

اور لیکر چلے وہاں سے کہار
روتی جاتی تھی میں تو زار و نزار

آثر لکھنوی کہتے ہیں کہ زار و نزار رونا محاورہ نہیں ہے۔ عورتیں زار زار رونے کو زاروں زار رونا کہتی ہیں۔ حضرت مؤلف اسی کو زار و نزار پڑھ گئے۔ الخ

اس پر سحر صاحب اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ آثر کی اس صراحت کی روشنی میں کہ عورتیں زاروں زار کہتی ہیں ممکن ہے جان صاحب کے شعر میں زاروں زار ہو

اور اسے زار و نزار لکھ دیا گیا ہو لیکن زار و نزار رونا عام طور پر مستعمل ہے۔ بظاہر یہ زار زار نہیں ہے۔ زار اور نزار دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اگر زار زار رونا صحیح ہے تو زار و نزار رونا کی صحت میں بھی کلام نہیں ہوسکتا۔ (زبان ولغت ص۵)

واصف عرض کرتا ہے کہ محاورہ زاروں زار رونا ثبوت طلب ہے اور زار و نزار رونا اس سے بھی زیادہ ثبوت طلب ہے۔ اگر ان دونوں محاروں کا صحیح ہونا ثابت نہ ہوسکے تو کیا کیا جائے؟ ایک کوشش اگر شعر کی بندش کو سمجھنے کی بھی کر لی جائے تو شاید مشکل آسان ہوجائے۔

زار و نزار حال واقع ہوا ہے ضمیر متکلم (میں) کا، نہ کہ رونے کا۔ یعنی میں روتی ہوئی جاتی تھی اس حال میں کہ زار و نزار تھی۔ زار و نزار تھی۔ زار و نزار کے معنی عاجز و درماندہ و مجبور۔ اس سے رونے کی کیفیت کا ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے۔ مصرع کی عبارت یوں مرتب کی جائے تو مفہوم واضح تر ہوجائے گا کہ "میں تو روتی ہوئی زار و نزار جارہی تھی۔ یعنی جانے پر مجبور تھی اور اپنی بیچارگی پر رو رہی تھی۔" واضح ہو کہ "روتی" اسم حالیہ "روتی ہوئی" کا مخفف ہے۔ ترکیب نحوی یوں ہوگی کہ جاتی تھی فعل، میں ضمیر متکلم ذوالحال، روتی ہوئی اور زار و نزار، تینوں حال۔ ذوالحال اور حال مل کر فاعل بنا۔ فعل اپنے فاعل سے مل کر فاعل بنا۔ فعل اپنے فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔

(۲)

سحر صاحب لکھتے ہیں۔ آب بمعنی چمک دمک مؤنث ہے۔ لیکن آتش نے ایک شعر مذکر نظم کیا ہے:

نشہ ہی ہیں یا الٰہی میکشوں کو موت دے
کیا گھٹی کی قدر جب آب گہر جاتا رہا

جلال نے مفید الشعراء میں اس شعر کو مذکر کی سند میں پیش کیا ہے۔ جس کی

تقلید میں چند دوسرے لغت نگاروں نے بھی اسے مختلف فیہ قرار دیا ہے لیکن رشید حسن خاں نے اس کو آتش کا تسامح قرار دیا ہے۔ سحر صاحب کی رائے ہے کہ نہ مختلف فیہ ہے نہ تسامح ہے بلکہ قصداً ضرورت شعری کی وجہ سے مذکر باندھا ہے کیونکہ ردیف "جاتا رہا" تھی۔ (زبان ولغت ص۵۶)

واصف عرض کرتا ہے۔ اردو کا محاورہ ہے "آب جاتی رہی" کہنا چاہیے تھا "موتی کی آب جاتی رہی" فارسی میں آب رفتن محاورہ نہیں ہے اور آب گوہر، آب مروارید، آب لولو، موتیا بند کو کہتے ہیں (بہار عجم) آبِ گوہر ترکیب پاکر اردو محاورہ کا جزو نہیں بنا۔ خواجہ آتش تردد میں پڑ گئے کہ اس صورت میں آب گوہر کو مؤنث قرار دیں یا مذکر۔ فارسی ترکیب میں آکر اس کی تذکیر وتانیث مشتبہ ہوگئی۔ فارسی میں تذکیر وتانیث نہیں ہے پس انھوں نے قیاس سے کام لے کر اسے مذکر قرار دے دیا۔ یہ خطائے اجتہادی ہے۔

ضرورت شعری کی وجہ سے زبان ولغت کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ لفظ ازروئے قواعد غلط یا فصاحت سے گرا ہوا نہ ہو اور محاورہ کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔

(۳)

آگے سحر صاحب لکھتے ہیں: آب بمعنی چمک دمک کو آتش نے مذکر باندھا اس طرح کی اور مثالیں بھی اساتذہ کے کلام میں ملتی ہیں۔ مثلاً ہُن عام طور پر مذکر ہے لیکن داغ نے مؤنث کہا ہے:

ہُن برستی ہے دکن میں یہ مثل ہے مشہور
تو نے برسائے گہر فیض سے معدن معدن

الخ۔ (زبان ولغت ص۵۷)

واصف عرض پرداز ہے: "ہُن کو مذکر داغ نے باندھا ہے؟ یا وہ خود مؤنث بندھ گیا؟ تحقیق طلب ہے۔ ممکن ہے کاتب کی بڑھنت سے جنس بدل گئی ہو۔ اور کاتب تو اس سے بھی زیادہ عظیم وعجیب حرکتیں کرتے ہیں۔ تذکیر و تانیث کے فرق سے وزن شعر میں فرق نہیں آیا۔ اگر یہ تاویل نا مقبول ہو تو دوسری تاویل یہ ہے کہ حضرت داغ کی تربیت قلعۂ معلیٰ میں ہوئی ہے۔ قلعۂ معلی کی اور شہر کی زبان میں فرق تھا۔ ممکن ہے کہ قلعہ میں ہن کو مونث بولتے ہوں جیسے ظفر نے گھڑیاں کو مؤنث باندھا ہے (اردو مصدر نامہ ص ۳۱۶) اسی طرح لفظ چھان بین اور چھان بنان کے متعلق ایک واقعہ تذکرۂ سائل ص ۱۸۵ پر درج کیا گیا ہے۔ قلم (آلۂ کتابت) کو داغ اور دیگر شعراء نے مذکر باندھا ہے (فرہنگ آصفیہ) پودوں کی قلم لگانا یا شورہ نمک نمک مصری وغیرہ کی قلم مؤنث ہے۔ اسی سے دھوکا کھا کر بعض ناواقف لوگ آلۂ کتابت کو مؤنث سمجھ لیتے ہیں۔ مذکورہ مثالوں سے چمک دمک یا بجھاؤ کے معنی میں آب کی تذکیر کا جواز نہیں نکلتا۔

(۴)

آگے سحر صاحب لکھتے ہیں: "یہ تو ایسے الفاظ کا معاملہ تھا جن میں اختلاف رائے ہے۔ اساتذہ کے کلام میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو بالکل غلط ہیں اور جن کا چلن کبھی نہیں ہے۔ کسی ایک استاد نے اپنے کسی ایک شعر میں نظم کر دیا ہے۔ آتش کے ایک شعر میں نزاع کے معنی میں نزع کا استعمال اسی قبیل کا ہے:

حاصل ہوا نہ خاک بھی آپس کی نزع سے
دل میں غبار کا فرو دیندار لے چلے

حالانکہ پہلے مصرع میں کتابت کی غلطی کا احتمال ہے۔ ممکن ہے "ان کی نزاع" ہو لیکن اس طرح کے مقامات کی قیاسی تصحیح سے احتراز لازم ہے۔ ہاں

کسی مستند ماخذ میں "اُن کی نزاع" ملے تو اس کو درست کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ صورت میں نزع یا نزاع دونوں الفاظ یا صرف نزع کے تحت یہ صراحت کر دی جائے گی کہ آتش نے بمعنی نزاع استعمال کیا ہے۔ الخ (زبان و لغت صفحہ ۶۰)

واصف عرض کرتا ہے کہ نزع اور نزاع دونوں لفظ اردو میں اپنے متعین اور واضح معنی کے ساتھ اس قدر عام اور غیر مشکوک ہیں کہ کسی تسامح یا تصرف کا امکان نہیں۔ آتش کے بارے میں یہ خیال کہ انھوں نے نزع کو بمعنی نزاع باندھا ہے محض بد گمانی ہے۔ یہ یقیناً نقل در نقل کی غلطی ہے۔ "باہم نزاع" یا اور کچھ ہوگا۔ کاتب نے سبقت قلم یا اپنے اجتہاد سے باہم کا ترجمہ لکھ دیا ہوگا۔ لغت کو ایسی تردد پیدا کرنے والی سندوں سے پاک رکھنا چاہیے۔

(۵)

سحر صاحب لکھتے ہیں: اساتذہ کے کلام میں ایسے تلفظ بھی ملتے ہیں جو نہ اصل کے مطابق درست ہیں نہ مروجہ تلفظ کے اعتبار سے۔ ایک لفظ ہے مبرہن۔ سودا نے ایک جگہ اسے صحیح استعمال کیا ہے:

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مداحی کا
ذات پر جس کی مبرہن کنہ عز و جل

لیکن ایک دوسرے قصیدہ میں میرہن بسکون دوم وفتح سوم نظم کیا ہے۔

سجدہ کریں ہیں مہر و مہ در پہ انھوں کے روز و شب
مبرہن اس سے یوں ہوا داغی ہیں یہ غلام دو

لغت میں ضمناً یہ لکھ دیا جائے گا کہ سودا نے اس طرح بھی کہا ہے۔

(زبان و لغت صفحہ ۶۳)

واصف عرض گذار ہے کہ لغت میں درج کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ چونکہ اتنے بڑے جلیل القدر اور مستند استاد نے کہا ہے لہذا یہ بھی صحیح ہے اور ہم بھی اس طرح باندھ سکتے ہیں۔ ایسا لغت تو رہنما اور قابل استناد نہیں ہو سکتا۔

پہلے شعر میں تین فاش غلطیاں ہیں۔ (۱) کنہ کو متحرک الاوسط باندھا (۲) پھر اس کی اضافت فعل کی طرف کردی۔ فعل نہ مضاف بن سکتا ہے نہ مضاف الیہ (۳) عزّ وجلّ دونوں فعل ہیں۔ اس سے ذات خداوندی مراد لینا اصولی غلطی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے۔ تعالیٰ کا فرمان ہے، تبارک وتعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا، بفضل عزّ وجلّ سے مریض شفایاب ہوگیا، صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، کرم اللہ وجہہ کا نکاح رضی اللہ عنہا سے ہوا، علیہ السلام نے بیت اللہ تعمیر کیا۔ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کو سربلند کیا، قدس سرّہٗ کا مزار مہرولی میں ہے۔

دوسرے شعر میں مبرہن بروزن مختصر بالکل غلط اور ناجائز تصرف ہے۔ اردو میں تو یہ لفظ عام بول چال میں ہے ہی نہیں۔ غلط العام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک خاص علمی طبقے کا اور فن کا اصطلاحی لفظ ہے۔ یہ تصرف لغۃً بھی غلط اور علمی طبقے کی بول چال کے بھی خلاف ہے۔

ضرورت شعری کو اس قدر اہمیت دینا کہ لغت اور قواعد اور محاورہ کو یکسر نظرانداز کردیا جائے اس کو ایک ناپسندیدہ اور ناقابل استناد ایجاد ہی کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں ایسی کیا ضرورت شعری تھی کہ اس کے لیے صحیح کو غلط کرنا پڑا۔ حالانکہ سامنے کا لفظ "منکشف" موجود تھا۔

بہرحال سوداؔ ہوں یا آتشؔ یا نظامی گنجوی یا کوئی اور استاد باایںہمہ کمال و عظمت انسان تھے۔ اور انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ ایسے غلط الفاظ کو لغت میں درج کرنا، حوالہ دینا ان کی لغزش کو اجاگر کرنا اور شہرت دینا۔ اور طلبہ کے لیے

بھی غیر مفید بلکہ مضر ہے۔ ہمارے اسلاف کا دستور یہ تھا کہ ایسی کوئی چیز سامنے آجاتی تھی تو تاویلات و توجیہات کرتے تھے اور مصنف کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرتے تھے اور جب کچھ بس نہیں چلتا تھا تو کہتے تھے:

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

اللہ تعالیٰ مصنف کی خطاؤں سے درگزر فرمائے یہ مصنف کا سہو ہے۔

(باقی آئندہ)

ابوحیّان التوحیدی
حیات اور تصنیفات

جناب بدر الدین بٹ لیکچرر شعبہ عربی و اسلامیات، اسلامیہ کالج سری نگر کشمیر

چوتھی صدی ہجری کے جن عرب ادبا، کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوئی، ان میں ابوحیان توحیدی کا نام پہلی صف میں ہے۔ ترجمہ نگاروں کو اُن کے اصل نام کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اُن کا اصل نام علی بن محمد بن عباس تھا[۱] جبکہ بعض کی یہ رائے ہے کہ ابوحیان احمد بن عباس[۲] اصل نام تھا۔ ترجمہ نگاروں کی اکثریت پہلی رائے کے حق میں ہے اس لیے قابل ترجیح نام علی بن محمد بن عباس ہی ہے۔

یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ توحیدی کی جائے ولادت کہاں ہے۔ اس سلسلے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بغداد کے تھے، بعض کے نزدیک وہ شیرازی[۳] تھے، کچھ انھیں نیشاپوری کہتے ہیں اور کچھ واسطی قرار[۴] دیتے ہیں۔ توحیدی کے قدیم تذکرہ نگاروں کے علاوہ جدید محققین بھی ان کے وطن کے بارے میں متفق نہیں ہیں۔ مرحوم کُرد علی کا خیال ہے کہ وہ عربی الاصل تھے[۵]۔ ان کے ایرانی ترجمہ نگاروں نے بھی اُن کے وطن کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے، خود

توحیدی بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں مگر بعض قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عرب تھے۔ پہلے توحیدی کا نسب ہی دکھاتا ہے کہ وہ عرب ہی تھے جو اس طرح ہے: ابوحیان علی بن محمد بن عباس التوحیدی، دوسرے فارسی زبان سے ان کی ناواقفیت حالانکہ وہ ایران میں خاصے عرصہ تک سکونت کرتے تھے، تیسرے صاحب بن عباد کے ساتھ ان کی گفتگو عربی ہی میں ہوتی ہے۔ ابن عباد توحیدی کی موجودگی میں اپنے دوستوں سے فارسی میں بات کرتے ہیں جو توحیدی سمجھ نہیں پاتے۔ چوتھے ابن سوران نے انھیں اقوام عالم کے بارے میں رائے پوچھی تو انھوں نے عربوں کو دوسری اقوام پر ترجیح دی اور شعوبیت پر کڑی تنقید کی۔[۶]

جب توحیدی کی جائے پیدائش کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تو اُن کی تاریخ پیدائش کا صحیح علم نہ ہونا بھی ایک قدرتی امر ہے۔ البتہ قابل ترجیح سالِ ولادت ۳۱۰ھ ہے۔[۷]

ابوحیان توحیدی نے جن اساتذہ سے کسب فیض کیا ان میں ابوسعید السیرافی، علی بن عیسیٰ الرمانی، قاضی ابوحامد المروروزی، یحییٰ بن عدی اور ابوسلیمان المنطقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ سب حضرات قرآن، حدیث، فقہ، نحو، فلسفہ، عروض و بلاغت کے معتبر استاد مانے جاتے تھے۔

ابوحیان بغداد میں کتابت کا کام کرتے تھے۔ ورّاق کی حیثیت سے وہ خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ خدمت کے لیے لونڈی رکھی تھی۔ اور دوسروں کی مالی معاونت کرنے کی پوزیشن میں بھی تھے۔[۸]

المہلبی، ابن عباد اور ابوالفضل ابن العمید کے درباروں نے بڑے بڑے شعراء اور ادباء کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ توحیدی چونکہ ان تمام علوم سے بہرہ ور تھے جو ان وزراء کے درباروں میں باریاب ہونے کے لیے ضروری تھے۔ انھوں نے کتابت

کا پیشہ اس امید پر چھوڑا کہ کسی وزیر کے دربار سے منسلک ہونے سے ان کا مستقبل تابناک ہوجائے گا مگر شومیٔ قسمت سے ان کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے۔ ۳۵۱ھ میں وزیر ابوالفضل ابن العمید کے دربار سے وابستہ ہونے کے لیے توحیدی رَے (موجودہ طہران) کا سفر کیا۔ ابن العمید ایک قابل اور منتظم حکمران تھے۔ توحیدی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ توحیدی اس وقت معمولی لباس میں تھے مگر ان کا دل احساس برتری سے لبریز تھا۔ لہٰذا بے نیازی کے ساتھ دربار میں داخل ہوگئے۔ ان کی یہ بے نیازی اور انا ابن العمید کو ناگوار گذری اور انھوں نے فقرہ کسا کہ توحیدی درباری آداب سے بے خبر ہیں[9]۔ ابن العمید کے بُخل اور کسی قدر خود توحیدی کی ترش مزاجی کی وجہ سے انھیں ابن العمید کے دربار سے بے نیل ومرام بغداد لوٹنا پڑا۔ مشہور فلسفی یحییٰ بن عدی نے بغداد میں ۳۶۱ھ میں کئی تقریریں کیں۔ توحیدی نے ان سے خاصا استفادہ کیا[10]۔

ابوالفضل ابن العمید کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے ابوالفتح ابن العمید نے عنانِ وزارت اپنے ہاتھ میں لی۔ اُن کے دورِ وزارت میں بھی توحیدی نے پھر اُن سے رابطہ پیدا کرنا چاہا۔ مگر قسمت نے اس وقت بھی ساتھ نہ دیا لہٰذا مجبوراً رَے سے بغداد لوٹنا پڑا۔ قدرت نے تصنیف وتالیف کا ملکہ عطا فرمایا تھا لہٰذا نامساعد حالات کے باوجود اسی کام میں مشغول ہوگئے۔

ابوالفتح ابن العمید کے قتل کے بعد صاحب بن عباد نے رکن الدولہ کے وزیر کی حیثیت سے رَے میں چارج سنبھالا۔ ابن عباد نے اپنے آپ کو ایک بہترین منتظم اور مدبّر ثابت کیا۔ انھوں نے شعراء اور علماء اور ادباء کی سرپرستی کی۔ اُن کا دربار علماء وفضلاء اور شعراء وادباء کا کہکشاں تھا۔ اُن کے انتقال پر ہزاروں مرثیوں نے جنم لیا[11]۔ ابن عباد کی داد و دہش کا حال سن کر ابوحیان نے پھر رختِ سفر باندھا

اور ۳۶۷ھ میں رے پہنچکر ابن عباد کے دربار میں بحیثیت کاتب جگہ پائی۔ یہ کام توحیدی کے من کے موافق نہ تھا۔ وہ کسی مناسب جگہ کے متمنی تھے جو دربار صاحب سے مل نہیں پائی لہذا یہاں بھی زیادہ دیر قیام نہ کرسکے۔

ابن عباد کے دربار سے علیحدگی کی وجوہ کے بارے میں کئی چیزیں بتائی جاتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ صاحب بن عباد اُن لوگوں سے جلتے تھے جو ان کے ساتھ ذرا خودداری کے ساتھ پیش آتے تھے[۱۲] لہذا ان حالات میں توحیدی کے تعلقات ابن عباد کے ساتھ ٹھیک نہیں رہ سکتے تھے۔ دوسرے توحیدی فلسفہ کی جانب مائل تھے اور ان کے کئی اساتذہ فلاسفہ ہی تھے جبکہ ابن عباد کو فلسفہ کے ساتھ چڑ تھی۔ تیسرے توحیدی ان درباری آداب سے بے بہرہ تھے کہ جن میں ہر طرح کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی شامل ہے اور جن سے کسی امیر یا حاکم کی نگاہوں میں کوئی مقام حاصل کیا جاسکتا ہے۔ توحیدی چونکہ انتہائی حسّاس اور اپنی صلاحیتوں سے واقف تھے لہذا اس حد تک گر نہیں سکتے تھے جس حد تک درباروں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھے۔ چوتھے خود توحیدی کی ترش مزاجی بھی صورت حالات کو بگاڑنے میں ذمہ دار ثابت ہوئی۔ ان کے طنزیہ جملے اور خطوط صاحب کو نقل سے انکار، اُن کو دربارِ صاحب سے نکالنے کے لئے کافی تھے[۱۳]۔

توحیدی کو تینوں وزراء کے درباروں سے جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اُن سے اُن کو بڑی مایوسی اور کوفت ہوئی جس نے ان وزراء کے خلاف ایک کتاب کو جنم دیا جس میں ان کی حیات کے تاریک اور قابل اعتراض پہلوؤں کو بڑی بے رحمی سے بے نقاب کیا۔

ابن عبّاد کے یہاں سے نکل کر ابو حیان بغداد پھر واپس چلے گئے۔ ان ایام میں ابن سعدان، جو ہی امیر الامراء، صمصام الدولہ کے وزیر تھے۔ ان کا دربار علماء و فضلاء

فلاسفہ، اطبار اور سائنس دانوں کا گنج گرانمایہ تھا۔ اس بے مثال مجمع پر ابن سعدان کو ناز تھا اور وہ بجا طور پر برملا اس کا اظہار بھی کرتے[14]۔ ابوالوفار المہندس بھی ابن سعدان ہی کے دربار کے ایک روشن چراغ تھے۔ جن سے توحیدی کی ملاقات ۳۷۰ھ میں ہوئی تھی۔ ابوالوفار حساب اور انجینرنگ کے شعبہ میں ماہر تسلیم کیے جاتے تھے۔ انھوں نے کئی چیزوں کو دریافت کیا اور اپنے میدان میں کئی چیزیں ایجاد کیں۔ ریاضی اور نجوم پر کئی کتابیں لکھیں[15]۔

ابوالوفار نے توحیدی کی حالت زار پر ترس کھاکر انھیں بغداد کے بیمارستان عضدی میں جگہ دلوادی[16]۔ ابن سعدان ہی کی سفارش پر ابن سعدان نے توحیدی کو اپنا مصاحب شب بنادیا۔ توحیدی نے ابن سعدان کی سخاوت، خوش خلقی، ادب سے لگاؤ اور انتظامی صلاحیتوں کی بے حد تعریفیں کی ہیں[17]۔ ابوحیان نے ان کے لئے جاحظ کی کتاب "الحیوان" کی کتابت کی اور دوستی کے موضوع پر "الصداقۃ والصدیق" نام کی ایک عمدہ تصنیف ان کی خدمت میں پیش کی۔

کچھ وقت کے لیے ایسا لگا کہ مصیبتوں کے سائے ابوحیان کے سر سے ڈھل گئے۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد ہی وہ پھر اپنی بدقسمتی کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ اُن کے محسن ابن سعدان بھی کسی وجہ سے ان سے ناراض ہو گئے اور وہ ان کی سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ توحیدی نے انھیں جذبات سے بھرپور ایک خط لکھا تاکہ ان کی مالی مشکلات دور ہوں۔ توحیدی نے انھیں اپنے دوسرے محسن ابوالوفا کو بھی لکھا[18]۔ یہ بات واضح نہیں کہ ابن سعدان کیوں توحیدی سے ناراض ہوگئے۔ مگر اندازہ یہ ہے کہ وہ تنقیدی خیالات جو ابن سعدان کی شبانہ محفلوں میں ان کی درباری شخصیات کے بارے میں ظاہر کئے تھے، وہ کسی طرح متعلقہ شخصیات تک پہنچ گئے ہوں گے۔ انھوں نے جواباً ابن سعدان کے کان توحیدی کے خلاف بھر دئے ہوں گے۔ نتیجتاً توحیدی کو ان کی

سرد مہری کا شکار رہونا پڑا۔[19] ممکن ہے کہ ابو الوفا کی مداخلت سے ابن سعدان اور توحیدی کے تعلقات پھر خوشگوار ہوتے مگر اسی درمیان ابن سعدان کو عبدالعزیز بن یوسف نے قتل کیا اور خود کرسیٔ وزارت پر قابض ہو گئے۔ اور ابن سعدان کے ساتھیوں اور احباب کو پریشان کیا۔[20] توحیدی بھی چونکہ ابن سعدان کے ساتھی تھے اور انھوں نے ابن سعدان کی شبیہ محفلوں میں ابن یوسف کی نکتہ چینی کی تھی۔ لہذا بہت ممکن تھا کہ وہ کسی بڑی مصیبت کا شکار رہوتے۔ وہ خاموشی سے بغداد سے فرار ہوئے اور شیراز آکر باقی ماندہ زندگی وہیں گوشۂ عافیت میں گزاری۔

شیراز میں توحیدی نے عرفان ذات پر اپنا سارا وقت صرف کیا اور فلسفہ و تصوف پر کتابیں لکھیں۔ اسی زمانے میں انھوں نے "المقابسات" "المحاضرات" "الاشارات الالٰہیہ" وغیرہ اہم کتابیں تصنیف کیں۔ یہ تصانیف ان تالیفات سے بالکل علیحدہ مزاج اور انداز رکھتی ہیں جو انھوں نے اس سے قبل جوانی کے زمانہ میں لکھیں۔ مثال کے طور پر البصائر والذخائر، اخلاق الوزیرین اور الامتاع والمؤانسۃ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

۴۰۰ھ میں توحیدی نے جبکہ وہ تقریباً نوے سال کے ہو گئے تھے، اپنی ساری تالیفات جلا ڈالیں، یہ اقدام اس سلوک کے خلاف ایک احتجاج تھا جو زمانے نے ان کے ساتھ روا رکھا۔ قاضی ابوسہل کے نام خط میں توحیدی نے اس کی وجہ تفصیلاً لکھی[21] ہیں مگر السیوطی کے بقول ان کی کتابوں کا اکثر حصہ پہلے ہی کاتبوں نے محفوظ کر لیا تھا۔[22] شیراز میں تصنیف و تالیف کے علاوہ توحیدی نے علم و ادب کے شوقین طلبار کو بھی مستفید کیا۔ اس سلسلے میں عبدالرحمان بن جمع الاصفہانی کا نام لیا جا سکتا ہے۔[23]

آخر دنیا کے اٹل قانون کے تحت توحیدی ۴۱۴ھ کو ایک سو چار سال کی عمر

میں راہ سپار عالمِ آخرت ہوگئے - آخری وقت پر موجود لوگوں نے توحیدی کو خدا کی
یاد دلانے کی کوشش کی - ابو حیان نے سر اوپر اٹھایا اور کہا کہ میں کسی فوجی یا
پولیس والے کے سامنے نہیں جارہا ہوں بلکہ اس خدا کے دربار میں حاضر ہونے
جارہا ہوں جو عفو و درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۲۴]

توحیدی کے مذہبی خیالات و میلانات کے بارے میں ہمیں متضاد معلومات ملتی
ہیں اور ان کو ہدف ملامت بنایا گیا ہے - ابن الجوزی نے ابن فارس کی کتاب "الفریدہ"
کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابو حیان جھوٹے اور بے ایمان تھے - انھوں نے احکام
شریعت کی نکتہ چینی کی ہے اور خدا سے بے خوف ہو کر من گھڑت معلومات جمع کی
ہیں - چنانچہ ابن عباد نے جب یہ سنا تو توحیدی کے قتل کا حکم دیدیا - انہی وجوہ کی
بنا پر وزیر مہلبی نے بھی انھیں طلب کیا مگر ابو حیان کسی طرح ان کی گرفت سے نکل
گئے۔[۲۵] ابن الجوزی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابو حیان اسلام کے تین خطرناک ترین زندیقوں
میں سے ایک تھے۔[۲۶]

ابن الجوزی نے جس کتاب کو ابن فارس سے منسوب کیا ہے اس کی صحت نسبت
ہی مشکوک ہے، دوسرے صاحب بن عباد اور مہلبی کے تعلق سے جو بات کہی ہے
اس میں تاریخی طور پر بہت اضطراب پایا جاتا ہے۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ سب
باتیں تاریخی طور پر بے بنیاد ہیں۔ توحیدی کے ترجمہ نگاروں میں سے ابن نجار نے ان
کو غریب، صابر، مذہب پرست اور با ایمان شخص قرار دیا ہے۔[۲۷] اسی طرح یاقوت الحموی
نے لکھا ہے کہ وہ ایک صوفی منش تھے۔ لوگ انھیں مذہب میں ثقہ تصور کرتے تھے۔[۲۸]
ابن حجر العسقلانی نے "فلک المعانی" کا حوا[illegible]تے ہوئے لکھا ہے کہ توحیدی صوفیوں
کے شیخ تھے۔ ادبا کے درمیان ایک فلسفہ [illegible] سفہ کے درمیان ایک ادیب، با خدا
اور عمدہ انسان تھے۔[۲۹] السبکی نے ابن [illegible] برہ کی آراء نقل کرنے کے بعد

اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے ان کی اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا ہے مگر
کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو اُن کے زندیق ہونے یا بے ایمان ہونے کے الزام کو ثابت
کرتی۔ وہ ایک حساس اور قابل احترام شخصیت کے مالک تھے۔ یہی رائے میرے
والد صاحب کی بھی ہے۔[۳۰]

(باقی آئندہ)

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت وعصمت ۔ تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند دوم ، تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید ، ترتیب جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد دوم ، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبر ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمر کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب ورکزنگ

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابو بکر صدیق کے سرکاری خطوط امام غزالی کا فلسفۂ مذہب واخلاق ۔ عروج وزوال کا الہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول ، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ، اسلامی کتب خانے ، عرب نیا ، تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔ نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم ، حضرت عثمان کے سرکاری خطوط ، عرب وہند عہد رسالت میں ، ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات ۔ لادینی دور کا تاریخی پس منظر ، ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ، رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف وسلوک ۔ ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اردو جلد ششم ، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبد الحی ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم ، مآثر ومعارف ۔ حکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو [illegible] اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی [illegible] انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل عربی لٹریچر میں قدیم [illegible] ہندوستان

No. D. (DN) 231　　PHONE : 262815　　DECEMBER 1984
965—57　　Subs. 40/- Per Copy Rs. 3-50

BURHAN (Monthly)

4136, Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006.

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر
دفتر "برہان" اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۶ سے شائع کیا

ٹائیٹل جلال پریس جامع مسجد دہلی ۶